مینائے مصطفائی

دورِ دوم

از مطبوعات

ادارۃ المصطفٰے گنج بخش شاہ پیر حید آباد (اٹک)

Marfat.com

Marfat.com

815

میناۓ مصطفائی

دور دوم
اشاعت دوم
قیمت -/30 روپیہ

یکے از مطبوعات
ادارہ المصطفے گنج بخش شاہ پیر حیدر آباد (پاک)

Marfat.com

53559

مینائے مصطفائی ـــــــــ میں

اعلیٰ حضرت فیض منزلت حضور آقا پیر ایرانی ظل سبحانی ادام اللہ ظلال افضالہم کے اسباق و مواعظ، جو آپ نے ایک ماہ میں ارشاد فرمائے، کل ۲۴ ساغر ہیں، جن کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر کے شایع کیا گیا ہے۔

Marfat.com

انتساب

انتساب کے متعلق جب اعلیٰحضرت سے استفسار کیا تو ارشاد فرمایا :-

اُس شریف النسب سید زادہ نوجوان کے نام جو عنفوانِ جوانی کی سرمستیوں کو سلوکِ راہِ طریقت اور خمارِ بادۂ توحید و معرفت پر قربان کرکے میخانۂ علومِ رسالت کی تلچھٹ سے روحانی پیاس بجھانے کو "مرحد" سے حیدرآباد آیا۔

(ایجنسیاں حاصل کرنے کیلیے خط و کتابت کریں)

Marfat.com

رمزِ شہود

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طوافِ او طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست (اقبال)

حرم بس قبلۂ قلب و نظر ہے — طواف اس کا نہ طوفِ بام و در ہے
خدا کے گھر میں اور ہم میں ہے وہ راز — کہ جبرائیل کو بھی کم خبر ہے

(ترجمہ ذوقی)

Marfat.com

815

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمِ الْاَوَّلِ الْقَدِیْمِ۔ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ قَاسِمِ النِّعِیْمِ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفُ الرَّحِیْمِ۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے مسلسل او رپیہم احسانات رحمانی واکراماتِ رحیمی، قلم وزبان کے حیطہ اختیار سے اس درجہ درار الورا ہیں کہ ان کا عشرِ عشیر بھی بیان کرنا ممکن نہیں۔ انسان بنایا، اپنے محبوب کی امت میں داخل فرما کر خیر الامم کا خطاب بخشا اور اس زمانہ قحط الرجال میں اپنے قرب تک پہنچنے کیلیے وہ رہنمائے سلوک عطا کیا جو اسوۂ رسول پر مو بہ مو کاربند اور اخلاقِ الٰہی سے مو بہ مو متخلق ہے۔ جو خود آرام نہیں فرماتا، اپنے غلاموں کو آرام پہنچاتا ہے۔ خود نہیں کھاتا اپنے مریدوں کو شکم سیر کھلاتا ہے۔ خود تکلیف اُٹھاتا ہے اور رہروانِ سلوک کو آرام اور شفقتِ کریمانہ کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر منزلِ قرب تک پہنچا دیتا ہے۔ اے اللہ، برکت عطا فرما ایسے ہادی و مرشد کی عمرو درجات میں، اور ہم بے دست و پا اور افتادگانِ راہِ سلوک کو ان کے سایۂ عاطفت میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرما! سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

امابعد ہمارے اعلیحضرت معلّٰی مرتبت پیر روشن ضمیر حضور عالی خواجہ مصطفےٰ اصیغۃ اللہ شاہ ایرانی ظل سبحانی ادام اللہ ظلال افضالہم کا عرصہ دراز سے دستور ہے کہ بعد نماز مغرب اپنے مریدین و معتقدین کو

Marfat.com

نورانی حلقہ میں لے کر مراقبہ فرماتے ہیں اور بعد مراقبہ اُن کے درجات و مقامات کے موافق علوم و عرفان کی وہ موشگافیاں کرتے اور جذب و سلوک پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ باتوں ہی باتوں میں منازلِ قرب طے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک ایک سالک ساعتہً بعد ساعتہً اپنے کو آگے بڑھتا ہوا محسوس کرتا ہے وہ اپنی قسمت پر بجا ناز کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ایسے پُر انوار حلقہ میں حاضری کا شرف عطا فرمایا۔ اکثر دُور اُفتادہ اخوان اِن حاضرینِ حلقہ پر رشک کرتے تھے اور تمنّا کرتے تھے کہ کاش، اِس شرابِ عرفانی کے چند قطرے اُنھیں بھی میسّر آجاتے! ــــ اس لیے جناب پروفیسر علی نواز صاحب جتوئی نے اِن ملفوظات کو قلم بند کرکے ماہنامہ "المصطفیٰ" میں "میکدۂ مصطفائیہ" کے عنوان سے شایع کرنا شروع کیا تھا لیکن جب اس سے بیخواران مصطفائی کی پیاس نہ بجھ سکی تو اس حلقہ کے اخوانِ طریقت ایسی آسان صورتیں تلاش کرنے لگے جس سے امید بر آئے اور دُور رہنے والے احباب و اخوان کو بھی جی بھر کے پینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی سے اعلیٰحضرت کے مریدِ خاص بھائی سیٹھ عبدالغفار اور سیٹھ عبدالشکور صاحبان مالکان شکور دال مل حیدر آباد نے ایک خاصی رقم صرف کرکے خاص اسی مقصد کے لیے "ٹیپ ریکارڈر" یعنی آلۂ ضبطِ صوت خرید کیا اور حضور عالی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر کیا تھا روزانہ کے مواعظ و ملفوظات ریکارڈ کیے جانے لگے جن کو ادارہ المصطفیٰ کی زیرِ نگرانی اس کتابی شکل میں پیش کیا جا سکا جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے

چونکہ ہمارے اعلیٰحضرت مدفیوضہم حاضرینِ حلقہ کی وقتی ضروریات اور اُن کے خطراتِ باطنی کا لحاظ کرکے بلا تأمّل و ترتّب انکشافاتِ علمی و روحانی فرماتے ہیں، اس لیے اِن مواعظ میں ایک عجیب شانِ برجستگی اور کیفیتِ "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" پیدا ہو جاتی ہے جو سامعین کے لیے حد درجہ سرور انگیز اور کیف آفریں ہوتی ہے۔ اس لیے اہلِ حلقہ حضرات ہی نے اس کا نام "مینائے مصطفائی" رکھا۔ اس کے ایک حصّہ کو جو ایک ماہ کے ملفوظات پر مشتمل تھا "پہلے دَور" سے تعبیر کیا۔ اور ایک ایک بیان کو "ساغر" سمجھ کر پے در پے چڑھانے لگے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نشۂ توحیدی اور سرمستیِ رسالت کو ابدالآباد تک ترقیِ جزیل اور سرورِ جمیل عطا فرمائے!

Marfat.com

815

تصوّف سے علمی بیگانگی نے بعض طبایع کو روحانیات سے آشنا دُور کر دیا ہے، کہ مادّہ پسند اذہان ایک ایسے طلسم ظہور میں پھنس کر رہ گیے ہیں کہ ان کو الفاظ سے معانی، معانی سے حقائق اور حقائق سے حقیقۃ الحقائق تک پہنچنا دشوار ہو گیا ہے۔ وہ سطح سمندر کی رنگین دجوں اور گرداب و تلاطم کے پر آشوب مدوجزر سے گذر کر اس کی گہرائیوں کے پرسکون ذخائر کو تصور میں لانا بھی توہم پرستی اور مذہبی جنون سمجھنے لگے ہیں ۔ وہ تصوّف کی گہرائیوں سے سائنس کی موجوں پر ابھر آنے والی ایجادات ۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، مقناطیسی کارناموں اور ایٹمی توانائیوں کے سامنے تو سربسجود نظر آتے ہیں۔ لیکن جب یہی تاثرات مادیات اور آلہ جات کے بغیر تاریخی روایات اور صوفیاءِ باکمال کی کرامات میں دیکھتے اور سنتے ہیں تو منھ پھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات خاصۂ علم و عقل سمجھی جاتی ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس سے انکار کر دیا جائے۔ کیا سائنس کو بغیر فلسفہ کے، جو اس کا دل ہے، کوئی چیز حاصل ہو سکتی ہے؟ اور فلسفہ جو صرف معقولات سے بحث کرتا ہے، محض عقل و مادہ میں کوئی تاثر ثابت کر سکتا ہے؟ پھر تصوّف سے جو فلسفہ اور سائنس کی روح اور جان ہے قبل اس کے کہ اس کا علم حاصل کیا جائے کیوں انکار کیا جاتا ہے؟ کیا ایک ماہر اقلیدس ایٹمی توانائیوں سے صرف اس لیے انکار کر سکتا ہے کہ الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون ان کی دریافت کردہ اشکال کے کسی زاویہ کا نام نہیں ہے؟ اسی طرح ایک ماہر سائنس جزوِ لایتجزیٰ کو توڑ کر اس کے نظامِ کائناتی سے توانائی تو حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس توانائی کو جس زندگی، زندگی کو جس محافظِ زندگی اور محافظِ زندگی کو جس آمر کی ضرورت ہے اس تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اس کا تصوّف سے انکار کرنا جو ان حقائق سے روشناس کرتا ہے لاعلمی نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

تصوّف روحانیات کا وہ علمی، عملی اور مشاہداتی راستہ ہے جو اُن نظری معلومات اور یقینی و حقیقی انکشافات تک پہنچا دیتا ہے جو ابھی تک فلسفہ اور سائنس کو

Marfat.com

اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود میسّر نہیں۔ مثلاً حقیقتِ انسانی کہ وہ حیوانِ مطلق سے کیوں اشرف و ممتاز ہے؟ انسان کا ابدی ہونا کہ وہ حیواناتِ عامّہ کی طرح معدوم ہو جانے والا نہیں۔ حیاتِ بعد الممات کی نوعیت کہ جسمانی اعمال و افعال کے روحانی نتائج کیوں کر مرتّب ہوں گے؟ نیز خطراتِ نفسانی و شیطانی کی تمیز، ملائکہ کے انوار، سروشِ غیبی کی پیغام رسانی، صورِ اسرافیل اور قیامِ قیامت وغیرہ وہ دلچسپ اور قابلِ تحقیق مسائل ہیں جو فلسفہ اور سائنس تو کیا بعض فِرَقِ اسلامیہ کو بھی علم الیقین ہو تو ہو، عین الیقین اور حق الیقین کی حد تک حاصل نہیں۔

بہرحال اِن ملفوظات کو عام فہم بنانے کی تو کوشش کی گئی ہے لیکن عوام فہم نہیں بنایا جا سکا۔ کسی فنِ خاص کو سمجھنے کے لیے اوّلاً اُس کی اصطلاحات کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے اگر عوامی اذہان اس سے صحیح استفادہ نہ کر سکیں تو انھیں مناسبت کے لیے صحبت کی ضرورت ہوگی جو عوامی ذہنیت سے نکال کر پورے استفادے کی طرف رہنمائی کرے۔ ہاں عام اذہان بالضرور اس مجموعہ سے تصوف کے نظری معلومات اور عملی طور و طریق حاصل کر سکیں گے جس سے روحانیات میں ضرورت کی حد تک نسبتِ خاص پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے ہم راہِ سلوک میں اس کتاب کو اہم اضافہ سمجھتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ میکشانِ شرابِ حقیقت اِن ساغروں کو پیہم نوش فرما کر سرورِ عرفانی حاصل کریں گے۔ اور اُن کی مسرتِ روحانی سے ہمیں بھی سرخوشی حاصل ہوگی۔

حکیم ذوقی مصطفائی
مدیر "المصطفےٰ" حیدرآباد پاک

Marfat.com

ا

مینائے مصطفٰی

دورِ دوم

از مطبوعات

ادارہ "المصطفٰے" گنج بخش شاہ پیر "حیدرآباد (پاک)

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

مینائے مصطفائی دور دوم

اشاعت بار اول ایکہزار سنہ ۱۹۶۵ء سنہ ۱۳۸۴ ھج

اشاعت بار دوم دو ہزار سنہ ۱۹۸۲ء سنہ ۱۴۰۳ ھج

ادارہ المصطفیٰ کی مطبوعات

مینائے مصطفائی	دور اول	قیمت ۲۵ روپیہ
مینائے مصطفائی	دور دوم	قیمت ۳۰ روپیہ
میکدۂ مصطفائی		قیمت ۱۵ روپیہ

حیات صبغۃ اللہ شاہ

سوانح عمری اعلیحضرت فیض المنزلت آقائے تہرانی

پیر صبغت اللہ شاہ ایرانی بانی سلسلۂ مصطفائیہ ادام اللہ افضالہم

کتاب ملنے کا پتہ

(۱) **حاجی پیر بخش برادرس فونڈری** بیراج روڈ سکھر

(۲) **ادارہ المصطفیٰ گنج بخش پیر** حیدر آباد سندھ

(مشہور آفسٹ پریس کراچی)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مینائے مصطفائی دورِ دوم

ذیلی عنوان	صفحہ
دیباچہ و فہرست	۳ تا ۱۶
ساغر ۱ — عرفانِ نفس	
روحِ اعظم	۱۷
روحِ اعظم کے کمالات	۱۸
روحِ اعظم کی رسالت	"
روحِ اعظم کی عبدیت	۱۹
سرِّ باطن	۲۰
سائنس اور ایمان	۲۱
رویتِ الٰہی	۲۲
نظامِ شمسی	"
مقامِ فنا	۲۵
کفرِ حقیقی	۲۶
نزول بعد از عروج	۲۷
شیخ سرہندیؒ کا صحو بعد سُکر	"
کفرِ مجازی	۲۹
ساغر ۲ — خواتین اور تصوف	
ضابطۂ حیات	۳۱
انسانی قانون	"
خدائی قانون	۳۲
اسلام میں خواتین کا صحیح مقام	"
مساوات	۳۳
خواتین اللہ کے حضور میں	۳۴
صحیح خواتین آئینۂ حق نما ہیں	۳۴
عالمِ روحانیات کا دروازہ	۳۵
روحِ انسانی کا کمال	"
ذکر (یادِ خدا)	۳۶
ذکرِ پاس انفاس	"
طریقِ ذکر	۳۷
طریقِ عبادت	"
بندگی کا فائدہ	۳۸
طریقِ مراقبہ	"
طریقِ ربط	۳۹
لطائفِ باطنی	۴۰
تقلیدی و شہودی مسلمان	"

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
پیر کامل و مکمل	۴۱
طریق استفادہ و سلوک	۴۲
بیعت بدل	۴۳

ساغر ۳
بدایت و نہایت

ذیلی عنوان	صفحہ
نہایت فی البدایت	۴۵
ہمہ اوست اور ہمہ از وست	۴۶
سلاسل کا اختلاف	۴۷
صوفیوں کا تواضع	″
کمالِ تواضع	۴۸
روحانی سلطنت	″
انسان سے حیوانات کا گریز	۴۹
اُمتِ مرحومہ پر خصوصی رحمت	″
اُمتِ مرحومہ کا اختلاف	۵۱
اجتہاد کا ثواب	″
آپس کی محبت	۵۲
مجدّد اور مجدِّد کی تعریف	۵۳
......	....

ساغر ۴
صوفیانہ یا سپاہیانہ زندگی

ذیلی عنوان	صفحہ
صوفیا کی روپوشی	۵۴
شریعت کی آسانی	۵۵
صوفیا کی مہربانی	″
بذل و ایثار	۵۶
رزقِ غیبی	۵۷
رزقِ بے حساب	۵۸
توکل بلا سبب	″
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی	″
صوفیا کا لباس	۵۹
شاہ شناسی	۶۰
صوفی عارف ہوتا ہے	۶۲
آئینۂ ایمان	۶۳
اعیانِ ثابتہ	″
صوفیا کے کردار	۶۴
موافقت	″
مصائب کے صبر پر انکشافِ اسرار	۶۵
بلند اخلاق ہی صوفیا کے اعمال ہوتے ہیں	″
صوفی سپاہی اور سپاہی صوفی ہوتا ہے	۶۶
سپاہی اور صوفی کا فرق	۶۷

ساغر ۵
نسبت

ذیلی عنوان	صفحہ
فتح باب اور نسبت	۶۹
نسبت کے اقسام	″
فطری نسبت	۷۰
شعوری و لاشعوری محبت	″
کفر و شکر	۷۱
کفر و اسلام	″
مرتبۂ ایمان مافوق الاسلام ہے	۷۲
مومن و مسلمان	″
محب و محبوب میں نسبتِ محبت	۷۴
نسبتِ زہد	۷۵

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
غیر اسلامی زہد	۷۵
زہدِ رسولؐ	۷۶
نسبتِ عبادت	۷۷
نسبتِ تواضع	۷۸
نسبتِ رسولی	؍؍
سلوک میں مجاہدہ	۷۹
مقامِ جمع	۸۰
فرقِ بعد الجمع	۸۱
جمع باطن اور تفرقہ ظاہر	؍؍
نسبتِ اویسی	۸۲
وصول و علوم	۸۳
ساغر ۶	
بیعت ۔ خرقہ	
بیعتِ رسولؐ	۸۵
بیعتِ ترکِ سوال	؍؍
بیعتِ رضوان	۸۶
تکرارِ بیعت	؍؍
بیعتِ خواتین	؍؍

ذیلی عنوان	صفحہ
اسلام کا زرّیں اصول	۸۷
بیعتِ خلافت	؍؍
بیعتِ طریقت	۸۸
خرقۂ تصوّف	؍؍
خرقۂ خلافت	۸۹
عطیۂ کلاہ	۹۰
خرقہ و کلاہ کی حقیقت	۹۱
آدابِ سلوک میں ایک خاص نکتہ	۹۲
القانِ بیعت کی مثال	۹۳
ایک عیسائی خاتون کا مشرف بہ اسلام ہونا	۹۴
طریقت میں متعدد پیروں کا جواز	۹۵
سلامتی کا راستہ	۹۷
ساغر ۷	
عبدیت	
عبدیت کی تعریف	۹۸
قربِ نوافل	۹۹
دولتِ باقی	؍؍
عبدیتِ رسولؐ	۱۰۰

ذیلی عنوان	صفحہ
رسولؐ کا طریقِ تفکّر	۱۰۲
رسولؐ کا طریقِ تذکّر	۱۰۳
عبدیت کی نسبت انسان کے ساتھ	۱۰۴
رسولؐ کی عبدیتِ تامّہ	۱۰۵
عبدیتِ رسول کا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہونا	۱۰۶
عرب کی رسمِ جاہلیت اور حضرت عبداللہ	۱۰۷
حضرت عبداللہ کا بچپن	؍؍
حضرت عبداللہ کی قربانگاہ	۱۰۸
حضرت عبداللہ کا شباب	۱۰۹
آپ کے عہدِ طفلی کی معصوم عبدیت	۱۱۰
عہدِ شباب اور پرہیزگاری	؍؍
ایک اعتراض کا جواب	۱۱۱
رسولؐ کا مقامِ عبدیت	۱۱۲
نزول بعد العروج	۱۱۳
مقامِ عبدیت کی بلندی	؍؍
انبیائے کرام کی تعلیمات کا مقصد	۱۱۴

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
تمہارا کام اور ذمہ داری	۱۱۵
وسع کے معنی اور تعریف	۱۱۶
وسع انسان کا لباس ہے	"
لعب و اجر	۱۱۷

ساغر ۸
جاں بازی و سرفروشی

ذیلی عنوان	صفحہ
قرب خدا	۱۱۸
حصولِ قرب خدا	"
نشانِ قرب خدا	۱۱۹
خدمتِ خلق بڑی عبادت ہے	۱۲۰
خدمت عبادت پر افضل ہے	"
بہترین عبادت	۱۲۱
رہبانیت کی وجہ امتناع	"
عبادت کے مواقع پہچاننا	۱۲۲
خیر برتر اور شر کمتر	۱۲۳
اجرانہ بندگی اور عاشقانہ بندگی	"
محبت خدا اور خدمت خلق	۱۲۴
عشق معبود میں جاں بازی و سرفروشی	۱۲۵
صبر حسینؑ	۱۲۶
بے سرنامہ	۱۲۷
حضرت یوسف علیہ السلام کا ابتلا	۱۲۹

ساغر ۹
اتمام نعمت

ذیلی عنوان	صفحہ
حقیقتِ اسلام	۱۳۱
جہالت	"
کفرانِ نعمت	"
عرفان	۱۳۲
صوفیا کا نصب العین	"
دولت کی تعریف	"
دولتِ ظاہر محمود	"
دولتِ ظاہر منحوس	"
دولتِ باطن محمود	۱۳۳
دولتِ باطن منحوس	"
کمالِ نعمت	۱۳۴
دولتِ دنیا ایک زہر ہے	"
دولت کا منتر	۱۳۵
دولت کا اثر اور اس کا علاج	۱۳۵
دولتِ مستحسن	۱۳۶
دولت کا عذاب	"
خواہشات میں بے صبری	۱۳۷
فقر میں شکایت	۱۳۸
فقر میں خودداری	۱۳۹
ہماری دولت میں ہمارا حصہ	۱۴۰
اللہ تعالیٰ کو اچھا مال دو	۱۴۱
طریقِ تشکر	۱۴۲
نعمتوں پر اظہارِ مسرت	۱۴۳
ادنیٰ یا اعلیٰ انعام	۱۴۴
خلق سے بے نیازی	"

ساغر ۱۰
تقلید اور تحقیق

ذیلی عنوان	صفحہ
نورِ عقل	۱۴۵
فانوسِ عقل	"
عقلِ سلیم و عقلِ لئیم	۱۴۶
عقلِ معصوم	"

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
عقلِ معصوم پر ماحول کا اثر	۱۴۶
ماحول کی سلامتی کے ذمّہ دار	۱۴۷
تحقیق و تقلید	"
عقلِ تحقیق کے دو پہلو	۱۴۸
عقلِ تقلید کے دو پہلو	"
عقل اور زندگی	۱۴۹
شائستگی	"
استخوان فروشی	۱۵۰
عالی ظرفی اور بلند ہمتی	۱۵۱
اسلام کی نظر میں شرافت	"
خود اعتمادی و آزادروی	۱۵۲
کوری تقلید	۱۵۳
الہامی تحقیق	۱۵۴
الہامِ خاص	"
تحقیقِ علمی	۱۵۵
تقلیدِ علمی	"
تقلیدِ تحقیقی	"
حقائقِ کونیہ	"
تحقیقِ شہودی کے ذریعہ حصولِ معرفت	۱۵۶

ساغر ۱۱
مراقبہ اور بیداریٔ شعور

ذیلی عنوان	صفحہ
مراقبہ	۱۵۸
ظہور کا سیلان	"
پیر کی توجّہ	۱۵۹
ارتباطِ شیخ	"
تصوّرِ شیخ	۱۶۰
مسیحی سالکوں کا اعتقاد	"
فنائے مطلق	۱۶۱
شعور	"
شعورِ حیوانی	"
تحت الشعور	۱۶۳
شعورِ خودی	"
شعورِ انسانی	"
شعورِ کونی	۱۶۴
شعورِ کونی میں مقامِ رسالت	"
شعورِ کونی کا دائرہ	۱۶۵
بحری مخلوقات	"
شعورِ سرّی	۱۶۶
رمزِ اطلاق	"
نتائجِ حاصلہ	۱۶۷
کامل اور مکمّل	۱۶۸
ذرائعِ عقلی	۱۶۹
ذرائعِ حسّی	"
یقینِ مشہود	۱۷۰

ساغر ۱۲
استعداد و مراتبِ کمال

ذیلی عنوان	صفحہ
حرکت و رفتار	۱۷۲
حرکتِ موافق	"
حرکتِ مخالف	۱۷۳
رفتارِ رحمت	"
رفتارِ زحمت	"
انسان کی حرکتِ باطنی	"
انسان کی حرکتِ ظاہری	۱۷۴

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
استعدادِ انسانی	۱۷۴
استعداد کا وُرود	۱۷۵
استعدادِ مضغہ	۱۷۶
استعدادِ جنین	〃
استعدادِ طفل	〃
بچوں میں ظہورِ استعداد	۱۷۷
استعداد غذا	۱۷۸
تربیتِ باطن	〃
استعداد کا خاموش ظہور	۱۷۹
انبیاء میں استعدادِ نبوت	〃
کمالاتِ نبوت	۱۸۰
انسانی ارتقاء	۱۸۱
مراتبِ کمال	〃
کمالاتِ ظاہر	〃
کمالاتِ باطن	〃
حصولِ کمالات کا طریقہ	۱۸۳
صراطِ مستقیم	۱۸۴
قرآنی اشارات	〃

ساغر ۱۳
اعتدال

ذیلی عنوان	صفحہ
اعتدال	۱۸۶
اسلام کی اعتدال پسندی	〃
سنت اللہ	۱۸۷
انسانیت کے ارتقائی اَدوار	〃
بنی اسرائیل	۱۸۸
ہر فرعونے را موسیٰ	〃
حصول اقتدار و حکومت کا الٰہی قانون	۱۸۹
من و سلوا	۱۹۰
بارہ چشمے	〃
انسان کی فطری تغیر پسندی	۱۹۱
قومی ارتقاء میں سنتِ الٰہی	〃
داوٗد علیہ السلام	۱۹۲
تقاضائے حکمت	۱۹۳
سلیمان علیہ السلام	〃
ہُدہُد کی غیر حاضری	۱۹۴

ذیلی عنوان	صفحہ
شہرِ سبا	۱۹۴
شانِ نبوت	۱۹۵
ملکِ دل	〃
تختِ بلقیس	۱۹۶
معجزہ، کرامت اور استدراج	〃
علمِ اسماء و سائنس	۱۹۷
مذہب اور سائنس	۱۹۸
سائنس کے مواقع	۱۹۹
سلیمان و بلقیس	۲۰۰
مظاہرِ عالم	〃
موعظۃ الحسنہ	۲۰۱
بلقیسِ نفس	۲۰۲
عیسیٰ علیہ السلام	۲۰۳
خاتم الانبیاء	۲۰۴
رسولؐ کی عملی زندگی	۲۰۵
راہ اعتدال	۲۰۶
....	....
....	...

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
ساغر ۱۴	
ملک و ملکوت	
اعتبارات	۲۰۷
ملکوت کل شی	۲۰۸
عالمِ کن فیکون	〃
عالمِ ناسوت	〃
بلوغِ عقلِ انسانی	۲۰۹
نیستانِ جمال و کمال	۲۱۰
انبساطِ روح	۲۱۲
خواہشاتِ نفسانی	۲۱۳
ملکوت کی طرف دو قدم	〃
وسعتِ ملکوت	۲۱۴
قلبِ مومن عرش اللہ	〃
استویٰ علی العرش	۲۱۵
حقیقتِ استویٰ	〃
قلب مومن کی وسعت	۲۱۶
مراتب کے اعتبار سے اختلافِ نظر	〃
کن فیکون	۲۱۷
تمثیلِ معمار	〃
عالمِ غیب	۲۱۸
ایمان بالغیب کا نور	〃
ملک سے ملکوت	۲۱۹
ساغر ۱۵	
شریعت محمدی	
شریعت کی تعریف	۲۲۰
شریعت کے اعتبارات	۲۲۱
شریعت کی کلّی مثال	〃
شریعت کے دو رُخ	۲۲۲
ظاہرِ شریعت	۲۲۳
اوامر	〃
نواہی	〃
حرام	۲۲۴
ناجائز	〃
مکروہ	۲۲۵
ممنوع	〃
پیر کا حکم	۲۲۵
ترکِ سنّت کا راز	۲۲۶
باطنِ شریعت	۲۲۷
سیر الی اللہ	〃
سیر فی اللہ	۲۲۸
نفسِ مطمئنہ	〃
سیر من اللہ	۲۲۹
نفسِ قدسی	〃
خطائے آدمؑ	〃
آدم و ابلیس	۲۳۰
مقامِ جمع الجمع	۲۳۱
بہشت کے دو رُخ	۲۳۲
خلاصہ	۲۳۳
ساغر ۱۶	
جسم، روح اور قلب	
روح	۲۳۴
امرِ ربی	۲۳۵
خلقِ ربی	〃

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
عالمِ اجسام	۲۳۶
عالمِ اجسام کیونکر ہے؟	〃
عالمِ اجسام کہاں ہے؟	۲۳۷
خلق اور امر کا تقابل	〃
امرِ ربّی کی معرفت	〃
امرِ ربّی کی معرفتِ علمی	۲۳۸
خورشید کی مثال	〃
روحِ انسانی	۲۳۹
ہمارے جسم میں روح کی وحدانیت	۲۴۰
قلب	〃
آئینے کی وسیع دامانی	۲۴۱
اولین مخلوق	〃
اعتباری اختلافات	۲۴۲
حدودِ عالمِ امر	۲۴۳
حدودِ عالمِ خلق	〃
خلاصۂ کلام	〃
....	....
....	....

ساغر ۱۷
حُسنِ خُلق

ذیلی عنوان	صفحہ
مومنِ کامل اور حسنِ خُلق	۲۴۵
اثراتِ خُلق	۲۴۶
خوش خُلق و بدخُلق	〃
نتائجِ اخلاق	〃
طریقِ حصولِ اخلاقِ کریمہ	۲۴۷
خانگی اخلاق	〃
آدابِ بزرگان	۲۴۸
برابری کے آداب	〃
چھوٹوں پر شفقت	۲۴۹
چھوٹوں پر تشدّد	〃
اخلاقِ ہمسایہ گان	۲۵۰
دفتری اخلاق	〃
خلقِ عظیم	〃
اخلاق اللہ	〃
اخلاقِ محمدی	۲۵۱
سرکش اونٹنی	〃
عادتِ دشنام	۲۵۲
مسلمان اور کفر	۲۵۴
دو میں سے ایک کافر	۲۵۵
ایمان کی کمزوری	〃
حالتِ نزع میں اخلاق کا اثر	〃
اولیائے کرام کے اخلاقی اقدار	۲۵۷
خلاصہ	〃

ساغر ۱۸
حیوٰۃِ طیّبہ

ذیلی عنوان	صفحہ
عملِ صالح بقیدِ ایمان	۲۵۸
بے بنیاد محل	۲۵۹
مسلم و غدّار رعایا	〃
پختہ بنیاد	۲۶۰
اسلام، کفر اور اسلام	۲۶۱
کافر کا عملِ صالح	〃
مومن کا عملِ صالح	〃
ولایت کا پہلا درجہ	۲۶۲
مردوں کو خواتین پر کلی فضیلت نہیں	〃

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
عورت اللہ کے نزدیک	۲۶۲
خواتین کو مردوں پر فضیلت	۲۶۳
خواتین منیّہ نہیں تو فرعونہ بھی نہیں	״
مردوں کو خواتین پر فضیلت	״
خواتین کی حفاظت	۲۶۴
خواتین کے فرائض	״
خاندان میں مرد اور خاتون کی حیثیت	۲۶۵
پاکیزہ زندگی	״
پاکیزہ زندگی میں دولت کا حصہ	۲۶۶
شرعی امارت	۲۶۷
دولت کی پاکی	״
دولت کے مضر خواص	״
خرچ کے مواقع	۲۶۸
پاکیزہ زندگی کی علامات	״
معیتِ خداوندی	۲۶۹
حیاتِ طیبہ کی اخروی خصوصیات	۲۷۰

ذیلی عنوان	صفحہ
دنیا میں جنت	۲۷۰
دوسروں سے تقابل	״

ساغر ۱۹
روحانی بیماری اور علاج

ذیلی عنوان	صفحہ
اموراتِ طبعی و نفسانی	۲۷۲
اموراتِ طبعی	״
اموراتِ نفسانی	۲۷۳
غذا	״
شریعت کی کسوٹی	۲۷۴
حفاظت از شرِ نفس	״
نعمائے الٰہی میں دوسروں کی شرکت	۲۷۵
غذائے جسمانی و روحانی	״
ظاہری اور باطنی غذا کے اوقات	۲۷۹
روح کی بیماریاں	۲۷۷
روحانی علاج	۲۷۸
روحانی طبیب	״

ذیلی عنوان	صفحہ
پیر کا کام، ہمارا کام اور خدا کا کام	۲۷۹
پیر کی تعلیم	۲۸۰
پیر کی شفقت و محبت	۲۸۱
خلاصہ	״

ساغر ۲۰
مجازی اور حقیقی محور

ذیلی عنوان	صفحہ
مذہب	۲۸۲
مذہب کے اقسام	۲۸۳
دعوتِ تفکر	״
قبلہ	״
جمعیت	۲۸۴
اقوام کا نصب العین	۲۸۵
جنسِ معصوم	۲۸۶
انسانیت کی توہین	״
اسلام کی امن پسندی کا ثبوت	״
زندگیوں کا محور	۲۸۷
انفرادی و مجازی محور	۲۸۸

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
ماں	۲۸۹
باپ اور استاد	″
زوج وزوجہ	۲۹۰
پیرِ کامل	″
اجتماعی وحقیقی محور	۲۹۱
اپنے ساتھ نیکی	۲۹۲
بندوں کے ساتھ نیکی	″
تاویل کعبہ	۲۹۳
خالص عبادت	″
ھدایت یافتگی	″
بعثتِ رسول ﷺ	۲۹۴
یادِ الٰہی	″

ساغر ۲۱

اختلاف و افتراق

ذیلی عنوان	صفحہ
تعریف اختلاف و افتراق	۲۹۵
اختلاف بلا افتراق	″
افتراق بلا اختلاف	۲۹۶
....	″
اختلاف مع الافتراق	۲۹۷
اختلاف سے حصول رحمت	″
اختلاف کے اقسام	۲۹۸
بزرگوں کا اختلاف چھوٹوں کے ساتھ	″
چھوٹوں کا اختلاف بزرگوں کے ساتھ	۲۹۹
برابر والوں کا اختلاف	″
اختلاف مع الافتراق کے اقسام	۳۰۰
اختلاف بہ نفسانیت	″
نفسانیت کی ایک مثال	۳۰۱
حضرت آسیہ کا مشورہ	۳۰۲
ہامان کا مشورہ	″
اختلاف بہ عصبیت	″
رسول ﷺ کا فیصلہ یہودی کے حق میں	۳۰۳
حضرت عمرؓ کا انصاف	″
عصبیت کے اثرات	۳۰۵
اختلاف بہ جہالت	۳۰۵
جہالت کی نشانی	″
جہالت سے گریز	۳۰۶
جاہل کی صحبت	″
اسلام دیگر ادیان کا ناسخ نہیں، بلکہ متمم اور مکمل ہے	۳۰۷
سائنس اور مذہب کا اختلاف	″
خلاصہ	۳۰۸

ساغر ۲۲

محبت اور عفو

ذیلی عنوان	صفحہ
محبت کی تعریف	۳۲۰
متناسبین	″
متناسبین میں جذب و کشش لازمی ہے	۳۲۱
محبت کے مراتب	″
اللہ تعالیٰ کی محبت	۳۲۲

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ
اتباع، اطاعت، محبت اور عبادت	۳۲۲
اطاعت بہ امید نفع	۳۲۳
اطاعت بہ ذوقِ محبت	"
محبت و عرفان	۳۲۴
انسان اور معرفت	"
محبت و عبادت	"
تخلیقِ کائنات کی اصل بنیاد	۳۲۵
محبت میں زود رنجی اور فروگزاشت	"
اسلامی محبت	۳۲۶
اظہارِ محبت	"
تاسیسِ خانقاہ	۳۲۷
محبت کی نگاہ عام نگاہوں سے ماورا ہوتی ہے	۳۲۸
دوستی کی نگاہ عیب بین نہیں ہوتی	"
جذبۂ عفو	۳۲۹
عفو و کرم کی مثال	"

ذیلی عنوان	صفحہ
اللہ کی محبت رسول کے ساتھ	۳۲۹
تقاضائے محبت	"
اللہ کی محبت بندوں کے ساتھ	"

ساغر ۴۲

فضائل انسانی اور معراج انسانیت

ذیلی عنوان	صفحہ
مجاہدہ کی نسبت صحبت کی فضیلت	۳۳۱
ذکر کے اثرات	"
ذکر سے نتائج حاصل کرنے کی شرائط	"
طریقت کی انتہا فنا ہے	۳۳۲
مقام اثبات یا بقا و ولایت	"
نفس مطمئنہ	"
مقام رضا	"
فقیر	"
زینتِ دنیا	"

ذیلی عنوان	صفحہ
اسلام کے چند سیدھے سادے محسنات	۳۳۳
علمائے اسلام کی ذمہ داریاں	۳۳۴
صواب رائے اور قوتِ فیصلہ کا فقدان	۳۳۶
علمائے کرام کے افتراق کا نتیجہ	۳۳۷
علمائے کرام سے ایک سوال	۳۳۸
علوم جدیدہ کی سرپرستی میں بزرگانِ اسلام کی متبرک ہستیاں	۳۳۹
ابن ارشد	"
رازی اور جابر	"
ریاضی کا میدان	"
الخوارزمی	"
عمر خیام	۳۴۰

Marfat.com

ذیلی عنوان	صفحہ	ذیلی عنوان	صفحہ	ذیلی عنوان	صفحہ
ابراہیم الفزاری	۳۴۰	کی بے چینی اور بے اطمینانی کے وجوہات	۳۴۴	جہاد کے لیے قرآنی احکام	۳۵۱
موسیٰ بن شاکر	״			آیاتِ جہاد کے نتائج حاصلہ	۳۵۲
ابوالعباس فرغانی	״				
الطّبانی	۳۴۱	حضرت عیسیٰؑ کی ایک پیش گوئی اور حکم	۳۴۵	جہاد کا مقصد اور حکمتِ عملی	۳۵۳
ابومعشر	״				
علم حکمت علم دین سے جدا نہیں	״	علمی تجربہ	۳۴۶	ایک سوال	״
ایک پیش گوئی	۳۴۲	صوفیہ کے کردار	۳۴۷	جواب	״
دستر خوانِ نعمت	״	اسلام کا نظریۂ جہاد	״	جہاد کے لیے تیاری کا حکم	۳۵۴
یہود کی بے اطمینانی	۳۴۳	جہاد برائے امن	۳۴۸		
دعائے عیسیٰ فراوانیٔ دولت اور سائنسی برتری کے باوجود قومِ نصاریٰ کے	۳۴۴	اسلام کا ضابطۂ حیات	۳۴۹	سائنس اور انسانیت	۳۵۵
		نظریۂ جہاد میں اسلام کی احتیاط	۳۵۰	تیرہ نکات	۳۵۶
				تمت	۳۶۰

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہ

باری تعالیٰ عز اسمہٗ کا ہزار ہزار شکر و احسان کہ جس نے اپنے افضالِ محض اور اکرامِ خاص سے "مینائے مصطفائی" دَورِ دوم کو اتمام تک پہنچایا، اور اس کے ذریعہ اپنی معرفت و حقیقت کے اہم راز منکشف فرمائے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے قارئین کرام سے معذرت بھی کرنا ہے کہ ہم اپنے اس وعدے کو تاخیر سے پورا کر سکے۔ اور اُن کو پیہم انتظار کے بعد بار بار تقاضہ اور یاد دہانی کی تکلیف اُٹھانی پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اس عرصہ میں نیت و ارادہ کے ساتھ اس بات کے متمنی تھے کہ دَورِ اوّل کے بعد دَورِ دوم بھی جلد از جلد شائع ہو کر قدر دانان و شائقینِ تصوّف و عرفان کے ہاتھوں میں آجائے۔ مگر اسے مصلحتِ خداوندی کہیں یا اپنی کمزوریوں کی بے اعتدالی کہ طویل عرصہ تک وعدہ پورا کر کے اپنا فرض ادا نہ کر سکے۔ ہمیں اعترافِ عجز ہے اور ہم دل سے معذرت خواہ ہیں۔

دَورِ دوم کا ایک معتد بہ حصّہ تو پہلے ہی ٹیپ ریکارڈر سے کاغذی لباس میں آچکا تھا جس کو پاک نوشت کی صورت اعلیٰحضرت حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ بالخیر کی نظرِ ثانی و اجازتِ کتابت کے لیے پیش کرنا تھا۔ اور شاید اس پر کچھ وقت اور گزر جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہمارے حضور کے جملہ مراتبِ عالیہ کو بلند سے بلند تر فرمائے کہ آپ کی کرامتِ ابوالوقتی نے تمام کمزوریوں اور دشواریوں کو ادنیٰ اشارے سے دُور فرما کر اس وقت کو قریب سے قریب تر کھینچ لیا جس کی طویل عرصہ میں امید کی جا سکتی تھی۔ یعنی صرف تین ماہ کی مدّت میں کتابت کے جملہ مراحل طے ہو گئے۔ ٹیپ ریکارڈر سے حاصل کیے ہوئے سازوں کے بعد، اعلیٰحضرت کی قلمی تحریرات اور تقریری ملفوظات بھی یکے بعد دیگرے شامل

Marfat.com

ہوتے چلے گئے اور کام آسان ہو گیا۔

سلوک و تصوف اور حقائق و معارف کی نکتہ رسی کے اعتبار سے "دَورِ اول" کی جلدیں جس درجہ قبولیتِ عام حاصل کر سکیں ہر وہ شخص اس کا شاہد ہے جس نے ایک مرتبہ شروع سے آخر تک اس کو دیکھ لیا ہے۔ اور یہ بات بھی کرامت سے کم نہیں کہ مختلف مکتبۂ تصور اور متضاد اعتقادات کے حاملین نے نہ صرف یہ کہ پسند کیا، بلکہ اسے وقت کا تقاضا، ایمانی ضرورت اور مذہبی فریضہ میں داخل کر کے مدح سرائی فرمائی۔

اس کتاب کے مقبولِ خداوندی ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں اس کی ناپسندیدگی یا تردید کی کوئی ایک آواز بھی سننے میں نہیں آئی۔ جس نے دیکھا خوش ہوا۔ جس نے سمجھا ہدایت پائی اور جس نے عمل کیا مقصود کو پہنچا۔

الحمدللہ! یہ دورِ دوم بھی اپنی انھیں تابانیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ آپ کے پیشِ نظر ہے اور انشاءاللہ آپ اس کو بھی پسند فرمائیں گے اور زیادہ استفادہ کر سکیں گے کیونکہ یہ دَورِ دوم ہے اور نقاش نقشِ ثانی بہتر کشند ز اول اس میں حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالےٰ بالخیر نے وہ تمام رازہائے سربستہ منکشف کر دیے ہیں جن کا کلام و بیان میں آنا ممکن تھا، اور ان تمام گہرائیوں کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جہاں تک ایک عارف کی نظر کا پہنچنا ضروری ہے۔

مطالعہ کرنے کے بعد یقیناً آپ کو اندازہ ہوگا کہ اعلیٰ حضرت نے کچھ ایسے الہامی انداز سے کلام و بیان کا کام لیا ہے کہ اس کی ایک ایک کرن علم و ادراک شعور و عرفان کا خزانہ نظر آتی ہے، ان پر جتنا غور کریں معانی کا سیلاب اُمڈنے لگتا ہے، الجھے ہوئے مطالب سلجھ جاتے ہیں اور باشعور انسان اپنے کو مقاصد سے ہمکنار تصور کرنے لگتا ہے۔

ہمارے اعلیحضرت نے عباداتِ شرعی، سلوکِ طریقت، کمالاتِ حقیقت اور وصالِ معرفت کی اہم معلومات کو اس درجہ جامع اور واضح بیان فرما دیا ہے جس کے مطالعہ کے بعد تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں، اگر ان تعلیمات کی روشنی میں اجتماعی طور سے اصلاحِ عمل کی کوشش کی جائے تو آج بھی اسلام کا اسی شانِ علویت پر واپس آجانا بعید از قیاس نہیں جو اسے قرنِ اولیٰ میں حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم جملہ مسلمانانِ عالم کو اس کی توفیقِ بلیغ و رفیق عطا فرمائے۔

ادارہ المصطفٰے گنج بخش شاہ پیر حیدرآباد (پاک)

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۱

عرفانِ نفس

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْحَکِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ ہَادِی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

رُوحِ اعظم

عرفانِ الٰہی کے لیے عرفانِ نفس ایک اہم وسیلہ ہے جب انسان اس عالمِ مادّی پر، جو ہمارے ماحول میں مختلف کیفیات و تبدیلات پیدا کرتا ہے اور خود اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مادّیات کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے جس پر مادّیات قائم ہیں۔ اسی کو رُوح کہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ہمارا جسم رُوح سے متحرک ہے اور تازگی رکھتا ہے۔ بلکہ جملہ صفات و قویٰ اور کثرتِ حواس سب اسی سرچشمۂ نورانیت سے ظہور کرتے ہیں جس کو رُوح کہتے ہیں۔ اب اگر ہم عالمِ ممکنات کی کثیر النوع اور مختلف ارواح کے سرچشمۂ حیات کی طرف توجہ کریں تو ہم کو ایک ایسی روحِ اعظم کا سراغ ملے گا جس پر موجوداتِ عالم کی بقا و حیات کا دار و مدار ہے اور عالمِ روحانیات کی جملہ کیفیات و تغیرات کا انحصار اسی رُوح پر ہے۔ اگر وہ روحِ اعظم کسی ادنیٰ لمحہ میں اپنے افادۂ روحانی اور فیض رسانی کو بند کر دے تو یقیناً جملہ موجوداتِ عالم کا وہی حال ہو جائے جو ہمارے جسم کا

Marfat.com

روح نکل جانے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ صرف اسی روحِ اعظم کی حیات بخشی ہے جس سے جملہ عوالم زندہ اور متحرک و مؤثر نظر آرہے ہیں۔

روحِ اعظم کے کمالات

جس طرح ہمارے اعضا و قویٰ، عقل و شعور، فہم و تمیز، سماعت و بصارت، تفکر و تکلم، غرض جملہ احساسات وادراکات کلیۃً ہماری روح کے محتاج ہیں۔ اسی طرح عالم کائنات کا ایک ایک ذرّہ اپنی حیات و بقا کے افادہ واستفادہ کے لیے اسی روحِ اعظم کا محتاج ہے، جو "ایک" اور "واحد" ہے۔ بعض مذاہب و ادیان کے ارتقائی مفکرین نے اپنی معراجِ کمال پر پہنچ کر اس روحِ اعظم کا مشاہدہ کیا ہے اور اُس کے محیر العقول کمالات کو دیکھ کر اسی کو خدا ماننے لگے ہیں۔ کسی نے اس کی شفقت و رحمت کو دیکھ کر اُسے آسمانی باپ کہا۔ کسی نے اس کی صفاتِ کاملہ کا تجزیہ کرکے دیویوں اور دیوتاؤں کی حیثیت سے پوجنا شروع کیا۔ اور بعض اس کی منفی اتم قابلیات کو ظہور میں لاکر سائنس کی معجز نمائی اور ایجادات کی کرشمہ آرائی کے قائل ہو کر رہ گئے۔ یعنی روحِ اعظم کے کمالاتِ صفاتی اس درجہ غالب اور محیط ہیں کہ اگر خدا توفیق نہ دے تو نظرِ تحقیق ان کمالات پر اس طرح جم کر رہ جاتی ہے کہ اُس کو خلاقیتِ کائنات اور الوہیت کے کمالات ہی ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ سب روحِ اعظم کے کمالات ہیں، جو مخلوق حادث اور مطیع ہے۔ خالق، قدیم اور معبود کا مقام اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے اور جب تک مقامِ اطلاق تک نظر کی رسائی نہ ہو اس راز کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔

روحِ اعظم کی رسالت

جب ایک صوفی یا موحّدِ کامل عرفانِ حقیقی حاصل کرنے کے لیے روحِ اعظم تک پہنچتا ہے تو اُس کی اپنی تمام قابلیاتِ اجتہادی اس درجہ گم ہو جاتی ہے کہ وہ بذاتِ خود اس کے حدودِ تعین سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اپنی

Marfat.com

گم گشتگی کے اعتبار سے اسی کو لامحدود و لاتعیّن گمان کرتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس روحِ اعظم کے انوارِ ہدایات اپنے کمالِ رسالت سے اس کی رہنمائی کریں۔ اور مقامِ اطلاق پر پہنچا کر مشاہدۂ ذاتیۂ الٰہیّہ سے سرفراز فرمادیں، جو اس روحِ اعظم کا سرچشمۂ حیات اور مرکزِ کمالات ہے۔ یہاں پہنچ کر خالق و مخلوق، عابد و معبود اور قدیم و حادث کا راز آشکار ہوتا ہے۔ اور جب پہچان لیتا ہے کہ وہ خالق و معبود و قدیم، لامحدود اور لاتعیّن ہے تو "اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ" کی تفسیر بن جاتا ہے۔ اور سر جھکا کر "مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ" اعتراف کرتے ہوئے اُس کی تسبیح و تقدیس بیان کرتا ہے۔

روحِ اعظم کی عبدیت

تمام ادیان و مذاہب کے ظہور کا سرچشمہ یہی ایک نقطہ ہے کہ وہ مادّی جسم کو دیکھ کر روحِ جزدی، اور تمام ارواحِ جزدی کو ملا کر روحِ کلّی، یعنی روحِ اعظم کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔ یعنی جب جسم کو دیکھتے ہیں کہ اس سے صفات و افعال ایک خاص روانی کے ساتھ اُبل رہے ہیں تو یقیناً ان کا سرچشمہ اس کے باطن میں ہوگا۔ وہی روحِ جزدی ہے۔ اور جب وہ ارواحِ جزدی میں بھی ظہور کا وہی سیلان مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کے سرچشمہ دریافت کرنے کے لیے اس بہاؤ کے خلاف اس کے باطن میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اور روحِ اعظم تک پہنچ جاتے ہیں۔ تمام ادیان و مذاہب کی رسائی یہاں تک ممکن ہے۔ اس کے بعد اُن کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔ اب دو صورتوں میں سے ایک صورت واقع ہوگی۔ یا تو وہ اُس روحِ اعظم کے کمالات میں مبہوت ہو کر اور اُس کی الوہیّت کے قائل ہو کر اسی کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے اور آگے کا راستہ ان کے لیے مسدود ہو جائے گا۔ یا روحِ اعظم کی مخلوقیت اور عبدیّت کا مشاہدہ کرکے اُس کی رسالت و ہدایت پر ایمان لائیں گے اور یقین کریں گے کہ یہ روحِ اعظم خود اپنی خالق و مالک نہیں بلکہ مخلوق و مملوک ہے تو اسی روحِ اعظم کو

Marfat.com

آئینہ بنا کر اسی روحِ اعظم میں اس کے خالق و مالک، کے انوارِ خالقیت والوہیت کی تجلیات کا مشاہدہ کریں گے جو اس روحِ اعظم کا سرچشمۂ کمالِ ذات وصفات ہے، تو اُن کی نظر عالمِ لبساطت واطلاق تک پہنچ جائے گی۔ اور اُن کا راستہ واضح اور روشن ہو جائے گا۔

سِرِّ باطن اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اُس کو پہچانے اور معرفت کے ساتھ عبادت بجا لائے، تو اپنی معبودیت اور خالقیت کے رشتۂ معرفت کو انسان کے باطن میں قائم فرمایا۔ اور اسی سلسلۂ باطنی سے انسان کو تعلیم دی، اس کو متوجّہ کیا، سمجھایا اور ہدایت دی۔ اور اپنی روح کے اسی سلسلۂ باطنی کی طرف متوجّہ کر دیا۔ جب انسان نے اپنے کو اس طرح پہچانا کہ میں پہلے نہ تھا اب پیدا ہو گیا ہوں تو کسی پیدا کرنے والے ہی نے مجھ کو پیدا کیا ہے۔ جب اُس نے اپنی طرف سے نظر ہٹا کر اپنے پیدا کرنے والے کو دیکھا تو وہ روحِ اعظم تک پہنچ گیا۔ (کیونکہ خالق و مخلوق کے درمیان یہی برزخِ کبریٰ ہے) اور جب اُس نے اس روحِ اعظم کی حقیقت کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا تاکہ اُسے پہچانے تو دیکھا کہ وہ بھی حدودِ خلقت میں محدود ہے اور جب محدود ہے تو ضرور پہلے ظہور میں نہ تھی، بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ اور جب بعد میں پیدا ہوئی ہے تو ضرور کسی پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ تو "قَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" ظہور میں آیا اور اپنے رب کو پہچان لیا۔ اسی لیے پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ پس ضروری ہے کہ تو اپنی طرف متوجہ ہو جا۔ تیرے اندر ہی تیری حقیقت، یعنی تیرا معلّم و راہنما موجود ہے، جو تجھے بتلائے گا کہ کیا کرنا، کس طرف متوجّہ ہونا، کس نقطہ کو زاویۂ نگاہ بنانا، کون سا نصب العین اختیار کرنا، کس مرکز کی طرف پہنچنا اور کس مطلوب کو آدرش بنانا ہے۔ یہی تیرا سِرِّ باطن ہے جو علمی معلومات سے تجھے آگاہ کر کے عملی محرکات پر آمادہ کرے گا۔ یہی نظریہ انسان کی پیدائش سے لے کر اب تک جاری و ساری ہے۔

Marfat.com

اور انسان کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ لیکن اب جبکہ انسان ایک سو سال کے اندر سائنس کی طرف عملاً متوجہ ہو گیا، اپنے سرّ باطن اور حقیقی معلّم و رہنما سے دُور اور مہجور ہوتا جا رہا ہے کیونکہ سائنسی معلومات اب تک نامکمل ہے (اور یہ عین منشائے فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ ظہور کی طرف رُخ کرنا بطون کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہے) مگر مجھے یقین ہے کہ یہی نامکمل سائنس جو راہزنِ حقیقت بن کر ارتقائی منازل طے کر رہی ہے مستقبل قریب میں حقیقت آشنائی کے لیے انسان کی معاون بن کر حرم سرائے حقیقت کی دہلیز ثابت ہوگی۔

سائنس اور ایمان

سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ وہ صرف محسوساتِ حسّی وعقلی کو تسلیم کرے اور جو حدودِ احساس وعقول سے باہر ہو اُس سے انکار کر دے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ مادّوں کا انتہائی تجزیہ و تشریح کر کے ان کی باطنی طاقتوں کو اُبھرنے پر مجبور کرے۔ اور جو طاقتیں اُبھر کر احساس وعقول کی حد میں آ جائیں اُن کو محفوظ کر کے اُن پر ایمان لائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو قوتیں باطن سے اُبھر کر حسّ وعقل کی حدود میں داخل ہوتی ہیں وہ روح کے آثار ہیں بذاتِ خود روح نہیں کیونکہ روح احساس وعقول کی حدود سے ماورار کی چیز ہے۔ اس لیے نامکمل سائنس حقیقت کی پرستار نہیں بلکہ آثارِ حقیقت کی پرستار ہوتی ہے۔ اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ روح اور خالقِ روح سے انکار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خالقِ روح کا کسی نوع سے احساس وعقول کی حدود میں محدود ہونا ممکن نہیں لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ۔ یہ سب کچھ اس کے آثار ہیں۔ جو حس وعقل کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور محض آثار پر ایمان لانا اسلامی ایمان نہیں، بلکہ "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" اُس غیب مطلق پر ایمان لانا اصل ایمان ہے جو حدودِ احساس وعقول سے ماورا رہے۔ اور صرف اسی لیے اُس کو غیب کہتے ہیں۔

Marfat.com

رویتِ الٰہی اس میں شک نہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ سائنس مادّی ذرات کی اس آخری سرحد تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے اقرار کرنے پر مجبور ہو رہی ہے کہ مافوق المادّہ کوئی قدرت ضرور ہے جس نے ایٹم کے اندر برق پاروں کو منظم کیا ہے اور جو اُس کی تخلیق، بقاء و نظام کی ذمّہ دار ہے۔ لیکن یہ کہ اس قدرت کے ساتھ حیات و علم، ارادہ و حکمت رکھنے والا صاحبِ قدرت بھی موجود ہے، اس سے وہ عاری ہے۔ اور جب تک اپنے نظریۂ ظہور پر قائم ہے عاری رہے گی۔ اس لیے کہ ظہورِ مادّی، آنکھوں کی بصارت کا محتاج ہے۔ جس طرح مادّہ کو بغیر آنکھوں کے نہیں دیکھا جا سکتا اسی طرح روح کو بغیر بصیرت کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بصارت سے روح کا دیکھنا محال ہے۔ روح کی بصیرت ہی سے روح کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی لیے صوفیائے محققین نے کہا ہے کہ آنکھوں کو بصارت ہے، رُوح کو بصیرت اور روحِ اعظم کو مشاہدہ۔ جس طرح انسان کا دل رُوح سے بصیرت حاصل کر کے روح کو دیکھتا ہے، اسی طرح انسان کی روح، روحِ اعظم سے مشاہدہ حاصل کر کے روحِ اعظم کو دیکھتی ہے۔ اور جب انسان روحِ اعظم کے مشاہدہ سے علویت حاصل کرتا ہے تو اُسے رویتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی رویتِ الٰہی سے خدا کا دیدار ہوتا ہے۔ یہی رویتِ الٰہی سرچشمۂ بصارت کلّی ہے۔ یعنی ح[illegible] بصارتوں کا نور اسی بصارتِ مطلقہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جملہ علوم اسی علم مطلق سے ظہور کرتے [illegible] تمام حسن و جمال و کمال اسی سرچشمۂ حسن و جمال و کمال سے اپنی صلاحیتوں کا اکتساب کرتے ہیں۔

نظامِ شمسی آج کی سائنس خود اپنے گزشتہ چند سالوں کے نظریات کو منسوخ کر کے نئی راہیں نکالنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنے علم و عقل میں جس درجہ آگے بڑھتا ہے دیرینہ نظریات کی غلطیوں سے آگاہ ہوتا، اور اصولِ فطرت کو

53559

خالقِ کائنات کی منشا کے مطابق تسلیم کرتا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ سائنس جو کچھ تجربہ کرتی ہے وہ اسی فطرت کے نتائج ہوتے ہیں جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے تخلیقِ آدم سے پہلے ایک خاص اصول پر مرتّب کر دیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے پانی کو ہائڈروجن اور آکسیجن کی مناسب مقدار سے پیدا کیا اور ہائڈروجن کے ایٹمی ذرات میں نیٹرون، پروٹون اور الیکٹرون کا ایک باقاعدہ نظام مرتّب فرمایا۔ اور آج کی سائنس اسی نظامِ فطرت کا تجزیہ کر کے محیّر العقول طاقتیں حاصل کر رہی ہے پھر بھی ابھی تک مبہوت ہے کہ یہ برق پارے کس عجیب طاقت کے ماتحت مرتّب اور منظّم ہیں۔ اور کس طرح اپنے مخصوص محور پر گردش کر رہے ہیں، اور ان کا فاعل کون ہے۔ اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی آج کے سائنسداں متحیّر ہیں کہ ایک ایٹمی ذرّے میں پورا نظامِ شمسی کیسے قائم ہے (نظامِ شمسی میں، زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔ چاند اور دوسرے مشہور سیارے یعنی مریخ مع دو چاند، عطارد، زہرہ، مشتری مع آٹھ چاند، زحل مع نو چاند۔ یورینس مع چار چاند اور نیپ ٹیون مع ایک چاند زمین کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔) ان کو تعجب تھا کہ باقاعدگی کے ساتھ یہ نظام ایک عرصۂ دراز سے کیونکر چل رہا ہے۔ لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک سب سے چھوٹے ایٹمی ذرّے میں بھی وہی نظام قائم ہے۔ اور جیسے جیسے وہ ان تجربات و معلومات میں آگے بڑھ رہے ہیں فطرت کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک دن مادّے کی اس آخری سرحد تک رسائی حاصل کر لیں جسے اسلامی اصطلاح میں عرش کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عرش مادّے کی وہ انتہائی اور آخری سرحد ہے جس کے بعد مادیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد عالمِ روحانی (ملکوت) شروع ہوتا ہے۔ اور یہاں تک رسائی حاصل کر لینا سائنس کی کوئی اہم فتح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے ہزارہا سال پہلے سے انسان عرش تک رسائی حاصل کرتا چلا آ رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے

Marfat.com

کہ وہ روحانی راستوں سے ان منازل کو طے کرتا تھا، اور آج کے سائنسداں مادیات کے ارتقائی راستے سے گزرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور چونکہ مادیات کی انتہا روحانیات کی ابتدا ہے اس لیے جب یہ مادہ پرست سائنسداں اس مقام پہ پہنچیں گے تو انھیں مجبوراً کہنا ہی پڑے گا ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغِ تجلّے بسوزد پرم

اس وقت یا تو وہ یہ سمجھ کر مایوس ہو جائیں گے کہ اس سے بالاتر کوئی مقام نہیں ہے۔ یا چار و ناچار اسلام قبول کر کے روحانیات کا راستہ اختیار کریں گے۔ اسلام نے عالم روحانیات کی "سدرۃ المنتہیٰ" اور "دنیٰ فتدلیٰ" وغیرہ ناموں سے کھلی ہوئی نشان دہی کی ہے۔ اور اسلام کے پیرو روحانیات کے راستے سے ان مقام پر پہنچ کر "آیات ربہ الکبریٰ" کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اگر ان سائنسدانوں کو روحانیات کا ادنیٰ علم بھی ہوتا تو یہ مادوں کی کرشمہ بینی، اور راکٹ کے ذریعہ چاند وغیرہ تک پہنچنے کی کوشش میں روحانیت کی طرف بھی متوجہ ہوتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر عالم روحانیات کو بھی فتح کرتے اور اپنے مقصود تک پہنچ جاتے۔ پھر بھی یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ سائنس ترقی کرتے ہوئے اپنی برتری کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اُس کو اسلامی حقائق کی ارفع و اعلیٰ شان نظر آنے لگے۔ اس لیے کہ جب ایک عارف اپنے آپ پر مادی اور جسمانی حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتا ہے تو اُسے بصارت کی ضرورت ہوتی ہے بغیر بصارت کے وہ کسی مادی جسم کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور جب وہ اپنے اندر روحانیت کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہاں بصارت بیکار ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو بصیرت (یعنی روحانی آنکھوں) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح جب سائنسداں مادے کی اس آخری سرحد پر پہنچیں گے جس کے بعد خالص روحانی عالم شروع ہوتا ہے تو اُن کے تمام آلات اور طاقتیں عاجز

Marfat.com

مجبور ہوجائیں گی۔ اور اُن کو مجبوراً ایمان لانا پڑے گا کہ روحانی ادراکات کے لیے جو راستہ اسلام نے پیش کیا ہے اس سے بہتر اور کوئی دوسرا راستہ ممکن نہیں ہے۔

مقامِ فنا

انسان جب اپنے جسم کو دیکھتا ہے تو بصارت کے ذریعہ اس کے رگ و ریشہ کی سیر کرتا ہے، جب روح کو دیکھتا ہے تو بصیرت کے ذریعہ اُس کی علویّت و رفعت کی سیر کرتا ہے اور جب اُس کی انتہا پر پہنچتا ہے تو مادّی اجسام روحانی عوالم اور روحِ اعظم کی بساطت اُس کے شعور سے اُٹھ جاتی ہے اور وہ روحِ ین کے ذریعہ ذاتِ مطلق کی سیر کرتا اور فنا کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سبحانی ما اعظم شانی "اور" انا الحق" جیسے کلمات اُس کی زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مجازی ہستی کو بالکل فراموش کرچکا ہوتا ہے۔ اور متکلم حقیقی جو شجر و حجر بلکہ ہر چیز کے ذریعہ کلام کرنے پر قادر ہے خود انسان کی زبان سے کلام کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو شجر طور ہی سے تو آواز آتی تھی "اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ" (ہاں، میں ہی اللہ ہوں۔ سوا میرے اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اس لیے تم میری عبادت کرو۔) جب ایک شجر (درخت) سے کلامِ الٰہی کا صدور بنص صریح ثابت ہے تو اگر اللہ تعالیٰ انسان کی زبان سے اپنے کلام کا صدور فرمائے تو کوئی ابعد نہیں ہے۔ کیونکہ شجر و حجر اور جملہ کائنات کے مقابلے میں انسان کامل مخلوق اور اپنے پروردگار کا مظہر تام ہے۔ بشرطیکہ یہ صدورِ کلام تقلید سے نہیں بلکہ تحقیق سے ہو، اور فرعونیت کے تحت نہیں بلکہ عبدیت کامل کے تحت ہو۔

یہ وہ مقام ہے جہاں تمام دین و آئین اپنے قدم کے نیچے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اس عالمِ خدائی میں نہ کوئی دین ہے نہ آئین۔ اگر دین ہے تو فقط دین اللہ ہے، اور آئین، آئینِ خدائی ہے۔

Marfat.com

کفرِ حقیقی جب سالک اس عالمِ خدائی میں سیر فی اللہ کی محویت حاصل کر کے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے تو خود آئین ساز اور دین آفریں بن جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سب شریعت کی رُو سے کفر و کفریات ہیں جو اس مقامِ فنا میں سالک پر طاری ہوتے ہیں۔ مگر یہ کفر، کفرِ حقیقی ہوتا ہے۔ اور جب تک ایک سالک حقیقۃً اس کفر تک نہ پہنچ جائے اسلام حقیقی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی کفر تک پہنچ کر حضرت بایزید بسطامی نے "سبحانی ما اعظم شانی" کہا تھا۔ (میں پاک ہوں کتنی عظیم ہے میری شان) جب ابرِ رحمت سے قطرہ ٹپکے اور سمندرِ وحدت میں گر کر ناپید ہو جائے اور اس کا قطرہ پن باقی نہ رہے تو وہ انا البحر کہنے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سمندر ہی میں فنا ہے۔ اس کی لبساط سمندر کی پہناوری ہے اور اُس کی ذات بے پایاں اور لامحدود۔ جیسے ایک قطرہ سرکہ کو شہد کے سمندر میں ڈال دیا جائے تو اُس کی کھٹاس شہد کی مٹھاس میں فانی ہو جائے گی۔ اگر اس حالت میں سرکہ کے اس قطرے سے آواز آئے کہ میں کتنا میٹھا ہوں تو اس میں تعجب کی بات نہیں منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مقام پر پہنچ کر "حق حق انا الحق" کا نعرہ لگایا تھا۔ جب ان کے ہاتھ پاؤں زبان بلکہ ایک ایک عضو کاٹا گیا تو گرتے ہوئے ہر قطرۂ خون سے انا الحق انا الحق کا نقش بنتا چلا گیا اور تماشائی کے منھ سے انا الحق کی آواز آئی۔ منصورؒ نے قاتل سے کہا ان ظاہری ہاتھ پاؤں کے علاوہ میرے کچھ اور ہاتھ پاؤں بھی ہیں، لیکن وہاں تک تمہاری رسائی نہیں تم انھیں نہیں کاٹ سکتے کیونکہ وہ قابلِ تجزیہ نہیں ہیں۔ بس، تم تو میرے ان ہی ظاہری ہاتھ پاؤں کو کاٹ سکتے ہو۔ اور ان کے کٹ جانے سے میں معدوم نہیں ہو جاؤں گا۔ تم ان کو کاٹ لو، اپنا دل خوش کر لو اور سمجھ لو کہ تم نے مجھے قتل کر دیا۔ لیکن میں اپنی حقیقت کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں۔ قریب تر اور وسیع تر ہوتا جا رہا ہوں اور میری حقانیت انبساط پیدا کر رہی ہے۔

Marfat.com

غرض کوئی ولی اللہ ایسا نہیں جو اس مقام تک نہ پہنچے، اور کوئی ولی اللہ ایسا نہیں جو اس مقام پر پہنچے بغیر ولایت حاصل کرے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ شریعت کے پابند تھے اور کتاب و سنت کا احترام رکھنے کے باوجود جب اس مقام پر پہنچے تو ایسے ہی کلمات آپ سے بھی صادر ہوئے۔ آپ نے فرمایا ؎

اے دریغا ایں شریعت ملتِ اعمائی ست　　ملتِ ما کافری و ملتِ ترسائی ست
کفر و ایماں زلف و روئے آں بتِ رعنائی ست　　کفر و ایماں ہر دو اندر راہِ ما یکتائی ست

نزول بعد از عروج ان کو اپنے کفر پر فخر تھا۔ لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت بایزیدؒ کو اس مرتبہ سے نزول دیا (جس کو نزول بعد از عروج کہتے ہیں) تو انھوں نے فرمایا کہ میرے لیے ایک زنّار خرید کر لاؤ۔ لوگ زنّار خریدنے بازار میں آئے۔ دوکاندار نے پوچھا زنّار کس کے لیے چاہتے ہو؟ کہا بایزید بسطامیؒ کے لیے۔ کہا، خیر لے جاؤ، مگر اس کی قیمت دس لاکھ اشرفی ہے۔ ان لوگوں نے تعجب سے کہا۔ ایک معمولی تلگے کی اتنی بڑی قیمت؟ کہا وہ جنیو جو بایزیدؒ پہنے اس کی قیمت دس لاکھ اشرفی بھی کم ہے۔ وہ لوگ آئے اور حضرت بایزیدؒ سے عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ اس زمین پر بایزید کے لیے زنّار بھی میسر نہیں۔" پھر خود ہی ایک زنّار بنا کر گلے میں ڈالی، اور کہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وہ زنّار خود بخود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ آپ نے فرمایا جس دن میں نے "سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا، کافر تھا، اور آج میں مسلمان ہوں۔

شیخ سرہندی کا صحو بعد سکر اسی طرح شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ بھی اس حالتِ فنا اور مقام وحدت وجودی میں آئے، اور عرصہ دراز تک اسی حالت میں مستغرق رہے کہ ان کی عاشقانہ ابیات میں مذکور

Marfat.com

قسم کے شطحیات صادر ہوتے تھے۔ اور وہ ولایتِ صغریٰ میں خدائے تبارک و تعالےٰ کی تجلیات و آثار کو عین رب سمجھتے اور ہر مخلوق کو عینِ خدا مانتے تھے۔ لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے شہود کو اس سے ارفع و اعلیٰ مقام یعنی ولایتِ عُلیا و کمالاتِ انبیاءؑ تک رسائی عطا فرمائی، اُس وقت اُنھوں نے دیکھا کہ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ، عالَم عالَم ہے اور خالقِ عالَم خالقِ عالَم۔ خالقِ عالَم' عالَم نہیں ہو سکتا، اور نہ عالَم' خالقِ عالَم۔ کیونکہ نہ کوئی شے خدا سے اتصالِ حقیقی حاصل کر سکتی ہے اور نہ خدا کسی شے میں سما سکتا ہے۔ یہی وہ حقیقتِ بندگی ہے جو شریعتِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اتّباع سے اس وقت حاصل ہوتی ہے جب عرفانِ حقیقی ظہور کرتا ہے۔ اس وقت عارف کا ظاہر کثرت اور باطن وحدت ہوتا ہے۔ جس کو مقامِ جمع الجمع کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام کو جب وہ رسالت پر مبعوث ہو کر تشریف لاتے تھے حاصل ہوتا تھا۔ اور اُنھیں لوگ دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور ہماری طرح سڑکوں پر چلتا ہے۔ اور یہ کیونکر خدا کی طرف سے آیا ہے جب کہ ہماری طرح ازدواجی زندگی بسر کرتا اور پرورش اور نفقہ کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نزولِ بعد العروج کی حالت میں اپنے بندے کے تمام سلب شدہ عادات و معمولات کو بر بنائے مشیئت و رضا اُسے دوبارہ عنایت فرما دیتا ہے اور وہ انسانِ کامل ہونے کے باوجود حسبِ عادت معمولی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ہاں سرچشمۂ اطلاق سے حکمت و علم و اقتدار کا ظہور اس کے کمال کی دلیل ہوتا ہے جو اربابِ بصیرت اور اصحابِ عقول کو اُن کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس نزول کے ادنیٰ و اعلیٰ مراتب اپنے عروج کی بلندی و پستی کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ صاحبِ کمال جس درجہ عام اور معمولی زندگی گزارتا ہے اتنا ہی بلند تر عروج (جمع) کا حامل ہوتا ہے۔ اگرچہ

Marfat.com

وہ بظاہر عام لوگوں کی طرح کھاتے پیتے اور دنیاوی امورات میں مشغول نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کا کھانا غذا سے انوارِ رزّاقیت حاصل کرنا، اور خلق کی طرف رجوع ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیئت و ماموریت کو سرانجام دینا ہوتا ہے۔ اور اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ عرفان کی انتہا اتباعِ شریعت ہے جس میں ہستی مطلق کو پستی کی طرف لاکر پہچاننے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ مرتبۂ الوہیت کو اس کی علویت ہی میں پہچانا جاتا ہے اور اُسے سجدہ کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہاں بندے کی عبدیت سجدوں کے ذریعہ علویت حاصل کرتی ہے اس لیے وہ ایک قربِ خاص کا احساس کرتا اور موجودِ حقیقی کو روبرو دیکھتا ہے۔ وہ علمِ الٰہی سے علم حاصل کرتا اور اس کی مشیئت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہی حقیقتِ عرفان اور حقیقتِ تصوّف ہے۔

کفر مجازی

بعض اشخاص سلوک اختیار کرنے کے بعد وحدتِ وجودی پر تقلیداً آجاتے ہیں۔ وہ گویا کفر مجازی میں قدم رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ مقام "مقامِ تقلید" نہیں ہے۔ بلکہ "مقامِ تحقیق" ہے۔ قریب قریب ہر ادنیٰ و اعلیٰ عامی و عالم انسان سلوک کے بعد اپنی مخصوص خلوت یا جلوت میں ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں شطحیات یا مستانہ باتیں کہنے کا جی چاہتا ہے یا بکنے لگتا ہے۔ لیکن وہ عین کفر نہیں ہوتا جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ بلکہ وہ تقلیدی ہونے کی وجہ سے حقیقت سے بہت دُور ہوتا ہے۔ غور کرو، ایک شرابی شراب پینے کے بعد مستی اور سرخوشی میں لڑکھڑاتا اور گنگناتا ہوا راستے سے گزرتا ہے تو بچے بھی تقلیداً اس کی نقل کرکے ویسے ہی لڑکھڑانے اور گنگنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا ان دونوں کی حالت میں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر دونوں ایک حالت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے باطنی حالات میں اصل اور نقل کا فرق بالضرور ہوتا ہے۔ ع

ذوقِ ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

Marfat.com

سلوک میں محض تقلید قابلِ اعتبار نہیں، جب تک تحقیق اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ تقلیدی عمل کی صورت تو وہی ہے جو تحقیقی عمل کی، لیکن عامل کے باطن پر تقلیدی عمل کے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو تحقیقی عمل کے ہوتے ہیں۔ تقلیدی عمل ایک جسم بے جان ہے جو باطن کو نورِ حیات نہیں دے سکتا۔ برخلاف تحقیقی عمل کے کہ وہ زندہ اور جاندار ہوتا ہے اور باطن کو زندگی اور نور عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تحقیقی اعمال کی توفیق عطا فرمائے اور باطنی زندگی کی تابانیاں نصیب کرے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن۔

Marfat.com

(۱۰ر مئی ۱۹۵۹ء بروز اتوار مجمع خواتین میں ارشاد فرمایا)

دَور ۲
ساغر ۲

خواتین اور تصوّف

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَعِترَتِہٖ اَجمَعِین۔

ضابطۂ حیات اسلام نے انسانوں کے لیے ایک ضابطۂ حیات پیش کیا ہے۔ اور ضابطۂ حیات اس قانون کو کہتے ہیں جو انسان کی انفرادی، خاندانی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، جسمانی روحانی، دنیاوی اُخروی، تمدنی ومعاشی اور عمرانی اقدار کے نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ اصول بتائے۔ اور اعلیٰ درجات کی بلندی تک اُس کو پہنچا دیلے لیکن ایسا ضابطۂ حیات اور اٹل قانون صرف اللہ تعالیٰ ہی بنا سکتا ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ اور ہر چیز سے بخوبی واقف اور علیم وخبیر ہے۔

انسانی قانون ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام متمدّن ممالک میں اعلیٰ درجہ کے قانون دان، آئین شناس اور دستور ساز باہم جمع ہو کر دستور و آئین بناتے ہیں اور انھیں مقبولیت کے ساتھ منظور ورائج کیا جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت میں وہ دستور نامکمل ثابت ہوتا ہے۔ اور پھر اس کو تبدیل کرنے اور نیا قانون بنانے کی ضرورت

Marfat.com

پیش آتی ہے۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ انسانی فطرت اور مستقبل میں واقع ہونے والی تبدیلیاں اتنی متنوع اور اہم ہوتی ہیں کہ ان کا علم انسانی معلومات کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔ اس طرح آج وہ ایک قانون کو اپنے علم سے مکمل وصحیح ثابت کرتے ہیں۔ اور کل، تجربہ ان کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔ اس طرح انسان خدائی قانون کو چھوڑنے کی وجہ سے زندگی کی مشکلات میں مبتلا اور قانون سازی کی بھول بھلیوں میں الجھا چلا آرہا ہے۔

خدائی قانون

اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو صرف ایک ہی قانون ہے جو انسانی زندگی کو پُر امن اور کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور وہ وہی خدائی قانون ہے جسے اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کیونکہ یہ قانون کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ خالق کائنات نے جس طرح انسان کو پیدا کیا اسی طرح اس کی زندگی کے قوانین بھی خود ہی بنا کر بتلا دیے، تاکہ یہ انھیں قوانین پر کاربند ہو کر اپنا مقصدِ حیات حاصل کرے۔ اور دونوں جہان کی امن وسلامتی حاصل کرنے کے لیے تمام بنی نوع انسان کا متحد ہو کر اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ وہی ایک قانون ہے جو دینِ اسلام پیش کرتا ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ اور یہی وہ قانون ہے جو خواتین کو (کہ وہی انسانیت کی مادرِ جامعہ ہیں) اُن کے اعلیٰ درجۂ خاتونیت پر پہنچا سکتا ہے۔ برخلاف دیگر قوانین کے جو خواتین کو اُن کا صحیح مقام عطا کرنے کی بجائے پستی کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ اور جن کی پیروی میں یہ ارفع و اعلیٰ ہستی جسے خاتون کہا جاتا تھا حیوانیت کے کمترین مرتبہ تک نیچے آچکی ہے۔

اسلام میں خواتین کا صحیح مقام

اسلام نے زندگی کے امورات کو دو قسموں پر منقسم کیا ہے۔ ایک عمومی ہیں اور دوسرے خصوصی۔

Marfat.com

عمومی امورات میں مردوں اور خواتین میں کوئی تفریق نہیں ہے، جو حکم وقانون مرد کے لیے ہے وہی ایک خاتون کے لیے۔ مثلاً حصولِ علم، عبادات واخلاقیات، زہد وورع، ایثار وقربانی، حقوقِ النسانیت وغیرہ میں مردوں کے برابر ہے۔ لیکن خصوصی امارات میں مردوں کے لئے دوسرا حکم ہے اور خواتین کے لیے دوسرا۔ مثلاً امورات خانہ داری، پرورش اطفال، نامحرموں سے پردہ (نظر کا پردہ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن زینت وآرائش کی نمایش سے خصوصیت کے ساتھ خواتین کو روکا گیا ہے) اور شرافت نسوانی کی حفاظت وغیرہ عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ مردوں کا فرض ہے کہ وہ ان خصوصی امورات میں خواتین کی اعانت کریں۔ کیونکہ ان ہی امورات کی حفاظت میں صحیح نسوانیت کی بقا اور سلامتی ہے۔ اور بقائے نسوانیت کے بغیر النسانیت کو بقا، فروغ اور ترقی نہیں۔

مساوات

جہاں تک عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا تعلق ہے یہ مساوات سب سے زیادہ بلند ہے کہ فرمایا "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (یعنی یہ خواتین تمھارا لباس ہیں، اور تم ان کا لباس ہو) لباس اسے کہتے ہیں جو ہمارے جسم کو برہنگی اور عریانیت سے بچالیتا ہے۔ لباس دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ظاہری لباس جسے پہن کر ہم موسمی تکالیف اور دھوپ کی تمازت سے بچتے ہیں اور پردہ داری اور زینت کا کام لیتے ہیں۔ اسی طرح مرد وعورت ایک دوسرے کے لیے ظاہری لباس کی طرح ہیں کہ ظاہری اور ضروری محافظت اور پردہ داری کرتے ہیں۔ دوسرا باطنی لباس ہے جسے شعار وکردار کہتے ہیں۔ اس معنی یعنی اخلاقیات میں بھی ایک دوسرے کے لباس، یعنی محافظ اور پردہ پوش ہوتے ہیں۔ یعنی رجولیت نسائیت کے پردے میں پناہ لیتی ہے اور نسائیت

Marfat.com

رجولیّت کے پردے میں۔ اس طرح وہ شعار و کردار کی ترقّی اور بلندی میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔

خواتین اللہ کے حضور میں

مرد اور خواتین دونوں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں برابر ہیں۔ اور از روئے عبادت اللہ تعالیٰ نے جو نام مردوں کے رکھے ہیں وہی خواتین کو دیے ہیں۔ مردوں کو مسلمین کہا تو عورتوں کو مسلمات اسی طرح مؤمنین، مومنات، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں کی ان صفات پر اپنی خوشنودی کا اظہار اور مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی طرح خواتین کے لیے۔ چنانچہ از روئے عبادت نہ مرد کو خواتین پر فوقیت ہے اور نہ خواتین کو مرد پر۔ بلکہ جو بہتر اور افضل عبادات انجام دے اور تقویٰ اختیار کرے اسی کو برتری اور فوقیت حاصل ہوگی۔ پس جب کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں دونوں کا ایک مرتبہ ہے تو خواتین کو چاہیے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے میں مردانہ وار کوشش کریں۔ اور اس معاملہ میں قطعاً احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔

صحیح خواتین آئینۂ حق نما ہیں

اللہ تبارک و تعالیٰ نے خواتین کو اپنے حسن و جمال کا آئینہ بنایا ہے۔ اگر یہ آئینہ نگاہ و خیال کی کدورتوں سے پاک صاف رہ کر پوری آب و تاب نسوانیت کے ساتھ جلوہ گر ہو تو اس سے اللہ جمیل کے پاکیزہ انوار کی کرنیں بکھرنے لگتی ہیں۔ اور بیگانہ و مانوس نگاہیں سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے دلوں میں رحم، مروّت، شفقت، وفاداری، صبر و حلم، ایثار اور قربانی کا جذبہ اللہ تعالیٰ کے وہ ودیعت کردہ محاسن ہیں جو صحیح نسوانیت کے ساتھ اُجاگر ہوتے اور عفت و عصمت کی آب و تاب میں نشو و نما پاتے ہیں۔ پس خواتین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور بہتر و پاکیزہ تر صفتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اپنی کتابِ

Marfat.com

فطرت کا مطالعہ کریں اور اپنے صحیفۂ وجود میں رموزِ اسرارِ الٰہیہ، درجمال و کمالِ ذاتیہ وصفاتیہ کا مشاہدہ فرمائیں۔ اور اسی کتاب ابجد کا صحیح علم حاصل کرنے کے بعد اپنی روحانیات کی طرف قدم اٹھائیں۔

عالمِ روحانیات کا دروازہ

عالمِ روحانیات کا دروازہ کلمۂ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" ہے، جو عملی نفی و اثبات سے کھل جاتا ہے۔ اس عملی نفی و اثبات کے اسلامی طریقے (عمومیت کے علاوہ) طریقت کے ہر سلسلے میں جداگانہ اور مخصوص ہیں جن کی تعلیم اس سلسلے کے صحیح رہنما اور پیشوا سے حاصل کی جاتی ہے سلسلۂ مصطفائیہ میں بھی اس کا خاص دستور دیا جاتا ہے۔ اور خواہرانِ مصطفائی ان پر عمل کر کے روحانی مراتب میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔

روحِ انسانی کا کمال

جب انسان اپنے وجود کی طرف توجہ کرتا ہے تو کیفیتِ وجودی کی تنویر ساعۃً بعد ساعۃً بڑھتی جاتی ہے۔ وہ غور کرتا ہے کہ یہ قوتِ تکلم، یہ قوتِ سامعہ، قوتِ باصرہ، قوتِ حرکت وحیات اور قوتِ تعقل و تمیز کہاں سے آ رہی ہے۔؟ اور اس کے مبدأ کے تجسس میں اسی طرف رجوع کرتا ہے، جس طرف سے یہ قوتیں آ رہی ہیں۔ اور آخر کار اپنے باطن کی گہرائی میں پہنچ کر وہ گوہرِ مقصود یعنی معرفت حاصل کر لیتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ الٰہی تو نے مخلوق کو کیوں پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ (اے داؤد!) میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، اس لیے میں نے مخلوق کو پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی آخری مخلوق انسان ہے۔ اس لیے بہ اعتبارِ جسمانیت دُور تر اور کثیف تر ہے۔ لیکن ایک روحِ خاص جس کو روحِ انسانی کا نام دیا جاتا ہے

Marfat.com

اور جو خدائی صفات سے مزین اور قریب ترہے، اس انسان کو ودیعت فرمائی تاکہ انسان اپنی روح کے آئینہ میں، اللہ تبارک تعالیٰ کے کمالاتِ ذاتی وصفاتی اور جمالی وجلالی کو دیکھے اور پہچانے۔ یہ معرفت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اس آئینہ کی عمیق ترین فضاؤں میں سیر کرتا ہے۔ یہ سیر کامل توجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور سلوک میں توجہ کے چند طریقے ہیں:-

ذکر (یادِ خدا)

ایک طریقہ ذکر کا یہ ہے کہ اللہ تبارک کے اسمائے حسنیٰ میں سے کسی اسم کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا جائے۔ جب کسی اسم کا مسلسل اور پیہم ذکر کیا جاتا ہے تو اس اسم کی صفات ذاکر میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ان صفات کا کمال افعال بن کر ذاکر سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے پہلے اُس میں یہ کمال نہ تھا تو جان لیتا ہے کہ یہ اس اسم کا کمال ہے جس کا اُس نے ذکر کیا ہے۔ اور اسی اسم کے ذریعہ مسمیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

ذکرِ پاس انفاس

گزشتہ مہینے، میں نے آپ لوگوں کو کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کے ذکر کے بعد ایک اور خاص ذکر اسم جامع "اللہ" کا بہ طریقِ پاس انفاس بتلایا تھا کہ جب سانس اندر جائے تو اللہ کا نام بن کر اندر پہنچے۔ اور جب باہر آئے تو اللہ کا نام بن کر باہر آئے۔ اس ذکر میں نہ زبان ہلتی ہے اور نہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ صرف سانس کی رفتار بیچ میں ذرا رُک کر پوری ہوتی ہے۔ اور خود بخود اللہ کا نام بن جاتی ہے۔ یہ ذکر تمام اولیاء اللہ کا ابتدا سے انتہا تک شغل جاریہ ہوتا ہے۔ اس ذکر کو پاس انفاس کہتے ہیں۔ میں، آپ سب حاضرات اور دیگر خواتین کو جو اس وقت یہاں موجود نہیں، اگر وہ ہماری اس تقریر کو تحریر کی صورت میں پڑھ کر یا اخواتِ مصطفائی سے سن کر اس ذکر کو جاری کرنا چاہیں تو میں، سب کو اجازت دیتا ہوں ـــ وہ پہلے نفی واثبات اور پھر اسم جامع کی

Marfat.com

ذاکر بنیں۔ اور جیسے بتایا جاتا ہے ذکر کو جاری رکھیں :۔ اول

طریق ذکر

اوّل خیال کو دماغ میں جمع کریں۔ اور خیال کی روشنی کو اپنے باطن کی طرف اس طرح ڈالیں جیسے ٹارچ کی روشنی تاریک فضا میں ڈالی جاتی ہے اور سانس کے اندر جاتے وقت دل کی زبان سے کہیں "اللہ" اور نورِ الٰہی سے اپنے باطن کو منور دیکھیں۔ پھر سانس نکالتے وقت دل کی زبان سے کہیں "اللہ" اور قلبی و نفسانی کدورتوں اور ناکارہ خواہشات کو دماغ کی جھلیوں سے باہر نکالنے کا اس طرح خیال کریں جیسے جلی ہوئی سانس میں کدورتیں باہر نکلتی ہیں۔ اگر انسان کا باطن تفرقۂ خیال سے خالی ہو تو نورِ الٰہی اس کے باطن میں اُتر کر ماسوی اللہ کو باہر نکال دیتا ہے۔ اس طریقہ کو ہر وقت، باوضو، بے وضو ہر حالت میں، گرہستی کا کام کرتے وقت اُٹھتے بیٹھتے برابر جاری رکھا جائے۔ اس طریقِ ذکر سے نورانیت، لطافت، اطمینانِ قلب اور روح کا سُرور حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک نسبتِ خاص پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک کسی کو یہ نسبتِ خاص حاصل نہ ہو، وہ کمالِ روحانیت حاصل نہیں کرسکتا۔ اس نسبت کی بابت میں آپ کو کسی اور وقت بتلاؤں گا۔

طریق عبادت

عبادت کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حصولِ علم اور ذکر و فکر وغیرہ کو اپنے اپنے وقت پر بجالائے۔ اور دوسرا طریقِ عبادت یہ ہے کہ تمہاری حرکات و سکنات و گفتار سے کسی کا دل رنجیدہ نہ ہو۔ صفاتِ باطنی میں بخل، کبر و غرور، غیبت، تہمت اور حرص و لالچ جو صفاتِ رذیلہ ہیں تمہارے باطن سے دُور ہو جائیں۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی کے چال چلن کو بُرا کہتا اور اُسے عداوت کی نظر سے دیکھتا ہے یا بدگمانی کرتا اور خلقِ خدا کو تکلیف

Marfat.com

پہنچتا ہے تو اُسے کسی حالت میں حقیقی عبادات حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ عین اسی طرح ہے جیسے پاک صاف پانی کو گندے مشکیزے میں ڈال دیا جائے۔ نفسِ انسانی ایک ایسا مشکیزہ ہے کہ اگر یہ پاک وصاف ہو تو عبادات اور اعمالِ صالحہ بھی اس میں پاک صاف رہتے، اور مفید نتائج تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مشکیزۂ نفس ہی پاک صاف نہیں ہے تو بڑی سے بڑی عبادات اور اعمالِ صالحہ اس میں پہنچ کر کثیف و ناپاک ہوجاتے ہیں۔ اور ان سے خود بینی وغیرہ کے مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بہرحال عبادات و اعمال کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ یہ حالاتِ نفس کے ماتحت مقبول یا نامقبول ہوتے ہیں۔

بندگی کا فائدہ

اللہ تبارک تعالیٰ نے جن عبادات کا ہم کو حکم فرمایا، یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت مقرر فرمایا وہ سب ہمارے ہی فائدے کے لیے ہیں۔ اس میں خدا یا اُس کے رسولؐ کا سوائے رضا اور خوشنودی کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہماری عبادت و بندگی سے نہ تو اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کچھ زیادتی ہوتی ہے۔ اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتبِ رسالت میں کوئی ترقی۔ اگر ہم عبادات نہ کریں تو الوہیت و رسالت میں مطلق کوئی کمی نہ ہوجائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ بندگی ہمارے ہی فائدے کیلیے ہے اور ہم ہی کو اس کا بہتر نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔

طریقِ مراقبہ

جب اپنے دل کو تمام محسوساتِ عقلی وخیالی سے پاک اور خالی کر کے اس کی اس طرح نگہبانی کی جائے کہ خارج سے کوئی وارد اس میں داخل نہ ہو اور انتظار کیا جائے کہ باطن کی گہرائیوں سے کچھ علوم ومکاشفات ومشاہدات پانی کے چشمے کی طرح پھوٹ کر نکل آئیں اور دل و دماغ اُسے محفوظ کرلیں۔ جب مراقب کے باطن سے ایسے وارداتِ غیبی پھوٹنے لگتے ہیں تو علوم وعرفان کے ایسے دقیق نکات کا ظہور ہوتا ہے

Marfat.com

کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور باطن کے اسی چشمے کے ذریعہ وصولِ الی اللہ کا وہ راستہ مل جاتا ہے جس کے لیے سالک جد و جہد کرتا ہے۔ دل کی نگہبانی یعنی مراقبہ کا یہ طریقہ علمِ لدنی سے روشناس کرنے اور الہام کی مدد سے مرتبۂ عرفان تک پہنچنے کا وسیلہ بن جاتا ہے چند روز مراقبہ کی مشق سے جو مقصد حاصل ہوتا ہے وہ سالہا سال کی عبادت سے ممکن نہیں۔

طریق ربط ربط کے معنی آپس میں مل جانا ہے۔ عام طور سے لوگ پیر کی ظاہری صورت یا اُس کی تصویر کی طرف متوجہ رہنے کو ربطِ شیخ سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل ابتدائی اور بچگانہ سبق ہے۔ ہمارا دستور یہ ہے کہ آپ اپنی صورت اور کائنات کی ہر صورت سے اپنی نظرِ توجہ ہٹا کر ان کے معنی اور باطن کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ جب آپ کا اور ہر چیز کا باطن آپ کے سامنے کھل جائے گا تو اس میں پیر کا جلوہ صاف اور نمایاں نظر آنے لگے گا۔ یعنی آپ کی جو باطنی حقیقت ہے وہ پیر کی باطنی حقیقت کے ہم رنگ ہو کر اس طرح متحد ہو جائے گی، جیسے دو موم بتیوں کی روشنی ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ اگر یہ تصور آسانی سے قائم نہ ہو تو اپنے باطن کو ایک موم بتی کی طرح روشن سمجھ کر اس کے بالمقابل پیر کے باطن کو اُس سے زیادہ روشن اور تاباں سمجھیں۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اپنے باطن کی روشنی پیر کے باطن کی روشنی سے متحد ہوتی جا رہی ہے۔ اس اتحاد سے ایسے انوار پیدا ہوتے اور انبساط اختیار کرتے ہیں کہ نگاہیں ان کی حدود معلوم کرنے سے عاجز ہو جاتی ہیں۔ یہی ربطِ پیر ہے، جو سلوک میں سالک کا معاون ہوتا اور ہر ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی ربطِ پیر لطائف کی کھڑکیاں کھولتا اور باطنی عوالم کی سیر کراتا ہے۔ شرعی پردہ جو اجسام اور نفس تک محدود ہے ہر وقت ملحوظِ خاطر رہے۔ لیکن ارواح و قلوب و عقول کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

Marfat.com

لطائف باطنی باطنی عوالم کی ابتدا لطیفۂ قلب سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد روح سر خفی اور اخفیٰ لطائف امری ہیں۔ ربط کے مراقبے میں جس لطیفہ کی تعلیم دی جائے اُسی لطیفہ کی طرف توجہ کرکے اپنے پیر کے اسی لطیفہ کا تصور کرنا چاہیے۔ مثلاً لطیفۂ قلب کی تعلیم دی گئی ہے تو اپنے لطیفۂ قلب کو پیر کے لطیفۂ قلب کے بالمقابل کر کے یہ تصور کرنا چاہیے کہ پیر کے لطیفۂ قلب سے اپنے لطیفۂ قلب میں انوار اتر رہے ہیں۔ اور اس کی روشنی میں باطنی حقائق روشن ہو رہے ہیں۔ گویا پہلے یہ کمرہ تاریک تھا اور اس میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اب پیر کے لطیفہ کی شمع سے اس میں روشنی ہو گئی ہے۔ اور جو کچھ اس کمرے میں ہے صاف نظر آ رہا ہے۔ اس وقت انسان کو اپنے لطیفۂ قلب کے متعلق عین الیقین ہو جاتا ہے۔ یعنی جس لطیفہ کا اُس کو پہلے علم الیقین تھا اب اُسے اپنی بصیرت سے مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جب یہ حقائق باطنی، بصیرتِ قلب و رُوح کے ذریعہ مشاہدہ کیے جاتے ہیں تو اس کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہوتی۔ بلکہ گویا آنکھوں دیکھا یقین ہو جاتا ہے۔ یہی عین الیقین ارواح و ملائکہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کی طرف راستہ کھولتا ہے۔ اور ان ہی حقائق کا شہود حقیقۃ الحقائق یعنی حقائق الٰہیہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اس وقت وہ تقلیدی اور علمی مسلمان نہیں، بلکہ شہودی مسلمان ہو جاتا ہے۔ اور اُسے کوئی طاقت، کوئی دلیل، یا کوئی دباؤ راہِ حق و حقیقت سے نہیں ہٹا سکتا۔ کیونکہ اس نے خود اپنے باطن میں اس کا مشاہدہ کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب و معیت کے راز کو سمجھ لیا ہے۔

تقلیدی و شہودی مسلمان علمی و تقلیدی مسلمان زمانے کے ملحدانہ تاثرات و کلمات سے الحاد کی طرف مائل ہو سکتا ہے جیسا کہ اکثر لوگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن تحقیقی و شہودی مسلمان جو عین الیقین کی حد میں داخل ہو چکا ہے

Marfat.com

کسی طرح نہیں بہکایا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے شہود کا مرتبہ تمام اَدِلّہ و براہین پر بھاری ہوتا ہے اس کے برخلاف شہودی مسلمان کے انوارِ باطن ملحدوں، کافروں اور بھٹکے ہوؤں کو صحیح مسلمان بنانے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تاریک راستہ ان کے انوارِ باطنی سے روشن اور منور ہو جاتا ہے۔ اور وہ حق و باطل میں آسانی کے ساتھ تمیز کر سکتے ہیں۔ ایک کافر جب کسی صحیح مسلمان سے ملاقات کرتا ہے۔ اور اُس میں اسلامی کردار کے اُن انوار کو دیکھتا ہے جو کفر و الحاد میں اُسے نظر نہیں آتے تو وہ اسلام کی صداقت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ انوارِ باطن اس عالمِ اسباب میں تو ضرور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ لیکن اُخروی زندگی میں کسی کے نور سے کوئی دوسرا متمتع نہ ہو سکے گا۔ وہاں ہر شخص کا نورِ باطن صرف اسی کے لیے مخصوص ہوگا مثلاً کسی مسلمان کا کافر ہمسایہ قیامت میں اُس کے انوار دیکھ کر اگر یہ کہے کہ دنیا میں میں تمہارا ہمسایہ اور ساتھی تھا، آج تم اپنے انوار سے میری مدد کرو تو مسلمان کہے گا۔ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی۔ وہاں ہم دونوں کی کوششیں جداگانہ تھیں۔ ہم نے اور تم نے جو کچھ جمع کیا ہے اُس میں کوئی چارہ نہیں ہے۔ جب وہاں تم نے میرے نور سے کچھ حاصل نہ کیا جو مقامِ عمل تھا تو یہاں میں کیونکر اپنا نور تمھیں پہنچا سکتا ہوں۔ کیونکہ یہ دارالعمل نہیں، بلکہ دارِ جزا ہے۔ جب دنیا میں تمھارا راستہ میرے راستے سے الگ تھا تو آج ہمارا اور تمھارا راستہ کیونکر ایک ہو سکتا ہے۔ اب تم اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے اعمال سے نور حاصل کرو۔

پیر کامل و مکمّل

بہرحال راہِ سلوک کے مبتدیوں اور طالبوں کے لیے اوامر و نواہی کے بعد، ذکر، مراقبہ اور ربط دیگر نوافل سے زیادہ مفید ہے۔ بشرطیکہ اُس کو ہدایت دینے والا پیر صحیح سنتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیرو ہو، اور اس کا سلسلہ بلا انقطاع نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا ہوا ہو۔ ورنہ جو لوگ خواہشِ نفس ریاست طلبی

Marfat.com

بزرگ منشی یا دیگر اغراض ماسوی اللہ کے لیے عمامہ دسجادہ اختیار کرتے اور پیروں کی طرح ذکر وفکر کی تعلیم میں مصروف اور مشغول نظر آتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی نسبتِ خاص حاصل نہیں ہوتی۔ ان کی تقلید وارادت لوگوں کو ویسا ہی بنا دیتی ہے، جیسے وہ ہیں۔ اور ان سے راہِ سلوک میں ارشاد وہدایت کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مریض کو بجلی لگانے کے لیے کسی ایسے نااہل و ناواقف ڈاکٹر کے سپرد کر دیا جائے جو بجلی اور ایکسرے کی ماہیت اور اُن کے اثراتِ مابعد سے کماحقہٗ واقف نہ ہو تو کیا مریض کو یقینی شفا حاصل ہو سکے گی؟ نتیجہ یہی ہوگا کہ اگر ابتدائی اثر خلافِ مزاج ہے تو مریض فوراً مر جائے گا۔ اور اگر اثراتِ مابعد موافق نہیں ہیں تو اگرچہ مریض فی الحال آرام وسکون محسوس کرے گا اور سمجھے گا کہ صحت پا رہا ہے لیکن اثراتِ مابعد شروع ہوتے ہی یا تو ہلاک ہو جائے گا، یا پہلے سے زیادہ تکلیف میں مبتلا ہوگا۔ یہی حال سلوک میں ایک راہنما پیر کا ہے کہ اگر وہ کامل ومکمل ہے تو رشد وہدایت کا کام صحیح طور سے انجام دے کر لوگوں کو خدا رسیدہ بنا سکے گا۔ ورنہ اپنے ساتھ انھیں بھی لے ڈوبے گا ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔۔۔ پس بہر دستے نباید داد دست

(ترجمہ) ہیں بہت ابلیس بھی شکل بشر ۔۔۔ ہاتھ مت دینا ہر اک کو خوش گہر

طریق استفادہ وسلوک

اگر آپ کسی پیر سے بیعت کرنا اور سلوک اختیار کرنا چاہتی ہیں تو پہلے اپنے خاوند سے اجازت لیں۔ پھر یہ معلوم کریں کہ اس پیر کا سلسلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک صحت کے ساتھ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور وہ خود اپنے ظاہر وباطن کے ساتھ اعمالِ شریعت کا پابند ہے یا نہیں۔ اور پابندیِ شریعت کے ساتھ کمالاتِ روحانی کا بھی حامل ہے یا نہیں۔ جس طرح ہر ایک فن کے لیے اس کے مخصوص ماہرِ فن استاد کی تلاش ضروری ہے، اسی طرح علمِ تصوف اور عملِ سلوک کیلیے بھی کامل ومکمل کی

Marfat.com

ضرورت ہے۔ اور جب یہ محقق ہو جائے کہ وہ صاحبِ حال اور جذب و سلوک کا منزل رسیدہ ہے تو بالضرور اس کی خدمت سے فیض حاصل کرنا چاہیے۔ انشاء اللہ مقصود تک رسائی ہوگی۔

بیعتِ بدل یہ امر مسلمہ ہے کہ جو سلوک سے جذب یا جذب سے سلوک، فنا سے بقا اور جمع سے مقامِ جمع الجمع کو نہ پہنچ گیا ہو وہ کسی کو اپنی بیعت میں داخل نہیں کر سکتا۔ اور نہ منازلِ سلوک کو طے کرا سکتا ہے۔ مگر ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مقام رسیدہ مرشد سے اجازت لے کر لوگوں کو اپنے پیر کے نام پر بیعت کرے۔ جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خواتین یا دُور افتادہ لوگوں کو بیعت میں داخل فرمانا چاہتے تو صحابہؓ میں سے کسی کو اجازت دیتے اور وہ ان لوگوں کو اپنے توسّل سے حضور صلیّ اللہ علیہ وسلّم کی بیعتِ مبارک میں داخل کر لیتے تھے۔ اور ایسی بیعت کے لیے یہ اظہار ضروری ہے کہ وہ کس کی بیعت میں داخل کر رہا ہے۔ اس صورت میں بیعت قبول کرنے والا اس اصل بزرگ کی بیعت میں داخل ہوتا ہے نہ کہ موجودہ بیعت لینے والے کی بیعت میں۔ اور اس کی روحانیت بھی اسی اصل بزرگ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی سے ربط پیدا کرنا چاہیے۔ جب ربطِ پیر کے ابتدائی مراحل طے ہو جائیں گے تو رسول صلیّ اللہ علیہ وسلّم تک رسائی ہوگی۔ اور ربطِ رسولؐ حاصل ہوگا۔ اس وقت سالک کی حقیقت نورِ رسالت کے ربط سے منوّر و تاباں ہو جائے گی۔ اور جب رسولِ اکرم صلیّ اللہ علیہ وسلّم سے ربط حاصل ہو گیا تو تصرفِ ولایت سے وہی ربط حضرتِ ذاتِ معبود سے بدل جاتا ہے۔ اور یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب طالب میں یقینی وارداتِ غیبی اور حقائقِ الٰہی کے دیکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کو منتہائے کمالِ انسانیت کہتے ہیں۔ پس سلوک کو درجہ بدرجہ طے کرنے کے یہی معنی ہیں اور یہی بیعت کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

Marfat.com

خلاصہ ایک طریقِ عبادت فرائض و نوافل، تلاوتِ قرآن اور نوافل روزے ہیں۔ ان کا حکم عمومی ہے۔ ہر شخص ان کا مجاز ہے۔ لیکن اگر پیر کے حکم کے مطابق ہو تو زیادہ مفید ہے۔ دوسرا طریقِ عبادت، سلوک، نسبت اور ربط ہے۔ اس دوسرے راستے سے اللہ تبارک و تعالیٰ سالک کے باطن میں وہ حقائق ظاہر فرماتا ہے جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو مراتب کمالاتِ عرفانی تک رسائی عطا فرمائے۔ اور آپ کے انوار و فیوض سے دوسروں کو بھی فیضیاب کرے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِین۔

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۳

بدایت و نہایت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَلِکِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی ھَادِیِ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْم۔

نہایت فی البدایت

تصوف کی اصطلاح میں بدایت "سیر الی اللہ" کو اور "نہایت" "سیر من اللہ" کو کہتے ہیں۔ اور "سیر فی اللہ" کو بعض متصوفین بدایت اور بعض نہایت میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن یہ قائل اس کو بدایت ہی مانتا ہے۔ سیر الی اللہ کے معنی ہیں اللہ کی طرف جانا، سیر فی اللہ کے معنی اللہ میں سیر کرنا۔ اور سیر من اللہ کے معنی اللہ کی طرف سے واپس آنا ہے۔ بعض سلاسل سلوک کی ابتدا لطائف خلقی (لطیفۂ خاک، لطیفۂ آب، لطیفۂ باد، لطیفۂ نار اور لطیفۂ نفس) سے کرتے ہیں۔ اور آخر میں لطائف امری کی طرف مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک لطائف خلقی بدایت میں اور لطائف امری نہایت۔ اور چونکہ وہ آخر میں جا کر جذبہ حاصل کرتے ہیں اور فنا و بقا کے بعد توحید وجودی کے مقام پر پہنچتے ہیں اس لیے اس کو نہایت سمجھتے ہیں۔ لیکن سلسلۂ نقشبندیہ میں بزرگوں اور مرشدوں کا مقولہ ہے کہ اس سلسلہ میں نہایت فی البدایت ہے۔ بعض اس سلسلہ میں

Marfat.com

نہایت فی البدایت ہے یعنی اس سلسلہ میں ایک تو سلوک لطائف امری سے شروع ہوتا ہے جو دوسرے سلاسل میں نہایت کہے جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہاں جذبہ سلوک پر مقدم اور چونکہ جذبہ دوسرے سلاسل میں نہایت ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں ابتدا ہی نہایت سے ہوتی ہے۔ اور اس کی نہایت ولایت ملائکہ اور کمالِ انبیا علیہم السلام ہے جس کے بعد حقائق الٰہیہ ظہور کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے سلسلۂ نقشبندیہ کا سلوک نہایت فی البدایت ہوتا ہے۔

ہمہ اوست اور ہمہ از وست

مقامِ وحدت الوجود میں ایک خاص حالت ہوتی ہے کہ سالک ہمہ اوست کہتا اور ہمہ اوست ہی سمجھتا ہے۔ لیکن یہ حالت تغیر پذیر ہوتی ہے۔ اور آخر تک قائم نہیں رہتی جب وہ اس سے بلند مقام وحدت الشہود پر پہنچتا ہے تو وہ پہلی حالت زائل ہو جاتی ہے۔ اس وقت سالک ہمہ از وست کہتا اور ہمہ از وست سمجھتا ہے۔ ہمہ اوست کے معنی "سب وہی ہے"۔ اور ہمہ از وست کے معنی "سب اُسی سے ہیں"۔ دیکھو ان دونوں میں کتنا فرق ہے؟ سب میں، فانی، جاہل، خاطی و عاصی اور ظالم و جابر بھی ہیں۔ اور ہم وجوب کے ساتھ ان صفات کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ صفات سلبیہ ہو سکتے ہیں، کہ جہاں حیات، علم، قدوسیت اور رحم و حلم نہ ہوگا، وہاں یہ صفات از خود ثابت ہو جائیں گی۔ اس طرح یہ صفات سلبی ہونے کے اعتبار سے خدا کی طرف منسوب ہو سکتی ہیں۔ پس یہ کہنا کہ یہ صفات "وہی" ہے غلط ہوگا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ صفات بھی اسی سے ہیں۔ اور ان واصفین کا وجود اسی کی طرف سے ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہمہ اوست کے مقام سے ہمہ از وست کا مقام بلند ہے۔ جبکہ دیگر سلاسل کی نہایت وحدت الوجود پر ہوتی ہے نقشبندیہ سلسلہ کے سالکان وحدتِ وجود کے

Marfat.com

بعد وحدت الشہود تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلہ کی بدایت دیگر سلاسل کی نہایت ہے۔ اور اس مسئلہ وحدت الشہود کو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز نے منکشف فرمایا ہے اور اس کو انھیں کے نام سے منسوب بھی کیا جاتا ہے۔

سلاسل کا اختلاف

بعض متصوفین اور سلاسل کے سجّادہ نشین حضرات کے درمیان وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے متعلق اختلافات پیدا پیدا ہو گئے ہیں۔ خیر، اجتہادی اختلافات تو قابلِ گرفت نہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اُنھوں نے علمائے ظواہر کی طرح اپنے اختلافات کو نفاق اور تعصب کی حدود میں داخل کر لیا ہے یہ اس زمانے کی بدترین مثال ہے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کبھی ان سلاسل حقہ کے درمیان کبھی افتراق و عصبائیت کا شائبہ تک نہیں پایا گیا۔ وہ ہمیشہ اپنے اختلاف کے باوجود "حزب اللہ" کے رشتے میں منسلک رہے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نفاق و عصبیت "حزب الشیطان" کے لیے مخصوص ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نفاق و تفرقہ اور جھگڑا فساد شیطان کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اتفاق و یگانگت اور اتحاد و مودّت کو پسند فرماتا ہے۔ پھر علمی اختلافات کو نفاق و فساد کا سبب بنا لینا کیونکر "حزب اللّٰہیت" سمجھا جا سکتا ہے۔ اشد ضرورت اس بات کی ہے کہ وجودی حضرات شہودیوں پر لعن و طعن کرنے کی بجائے مقامِ شہود تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اور شہودی حضرات وجودیوں کو بُرا بھلا کہنے کی بجائے جذبۂ اخوت کے ماتحت انھیں اپنا بھائی اور سالکِ طریق سمجھیں اور مقامِ شہود تک پہنچنے کا انتظار کریں۔

صوفیوں کا تواضع

جو شخص جتنا برتر اور بالاتر ہوتا جاتا ہے اتنا ہی حلیم و متواضع ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے سالکینِ راہِ تصوّف کے لیے ضروری ہے کہ وہ جیسے جیسے بلند مقامات تک پہنچتے جائیں زیادہ سے زیادہ متواضع ہوتے جائیں۔ کیونکہ

Marfat.com

تواضع بلند سے بلند مقامات پر پہنچنے کے لیے سیڑھی بن جاتا ہے۔

کمالِ تواضع

حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ اپنے مریدوں کو ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے اور سلوک کو جاری رکھنے کی تاکید فرماتے تھے اور ان کو کھانے پینے کی فکر سے بچانے کیلیے خود جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور شہر میں بیچ کر اپنے مریدوں کا آزوقہ فراہم فرماتے تھے۔ ایک دن بازار میں لکڑی دیر سے فروخت ہوئی اور جب وہ سامان لے کر آئے تو مریدین کچھ کھائے بغیر سو چکے تھے۔ آپ نے خود آگ جلانی شروع کی۔ ایک مرید کی آنکھ کھلی۔ اُس نے دیکھا کہ حضرت چولھا پھونکنے میں منہمک ہیں۔ اور آپ کی ریشِ مبارک زمین پر لوٹ رہی ہے۔ وہ بے چین ہو کر آپ کے پاس آیا اور عرض کی کہ حضرت تکلیف نہ فرمائیں آپ نے فرمایا نہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ آج لکڑیاں دیر سے بکیں اور آپ لوگ انتظار کرتے کرتے سو گئے۔ میں ابھی کھانا تیار کرتا ہوں۔" اُس نے کہا "حضرت، ہم سب فارغ ہو کر سوئے ہیں صرف آپ باقی ہیں۔ لائیے، میں آپ کے لیے کھانا تیار کر دوں۔" آپ نے فرمایا "مجھے اپنے لیے ضرورت نہیں ہے۔ میں تو آپ لوگوں کے لیے کام کرتا ہوں۔ آپ نے سامان اُٹھا کر رکھ دیا۔ اور سو گئے۔ یہ وہی ابراہیم ادہمؒ ہیں جنھوں نے بادشاہت کو چھوڑ کر خرقۂ فقر اختیار کیا تھا۔ اور جب شیخِ طریقت ہوئے تو مریدوں کو اپنا خدمت گار نہیں بنایا، بلکہ خود ان کی خدمت کرتے رہے۔

رُوحانی سلطنت

جب حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ عنہ نے بادشاہت کو فقر پر قربان کر کے گمنامی کی زندگی اختیار کی تو وزراے سلطنت اُن کو ڈھونڈتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ اُس وقت وہ سمندر کے کنارے بیٹھے اپنے خرقہ کو پیوند لگا رہے تھے۔ ارکانِ سلطنت زمینِ ادب کو چوم کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ وزیر نے عرض کی "حضرت آپ کو اس فقیری میں کیا لذت ملی کہ اپنی بادشاہت چھوڑ کر اس حالت میں یہاں بیٹھے خرقہ دوزی

Marfat.com

زمادہ ہے ہیں ؟ آپ نے فرمایا "تم کو نہیں معلوم اِس سلطنت اور اُس سلطنت میں کیا فرق ہے ؟" اُس نے کہا۔ "کیا یہ بھی کوئی سلطنت ہے ؟" فرمایا "ہاں، کیا تم ہماری سلطنت دیکھنا چاہتے ہو ؟ اچھا دیکھو!" یہ کہہ کر آپ نے اپنی سوئی، جس سے خرقہ سی رہے تھے سمندر میں ڈال دی اور حکم دیا "مچھلیو میری سوئی لاؤ !" وزیر نے دیکھا بے شمار مچھلیاں اپنے اپنے منہ میں سونے چاندی کی سوئیاں لیے ساحل پر جمع ہوگئی ہیں۔ آپ نے پہچان کر اپنی سوئی لے لی۔ اور سب کو واپس کر دیا۔

انسان سے حیوانات کا گریز

چونکہ ہم نے خود کو اختلاف، افتراق اور نفاق سے نہیں بچایا ہے اس لیے حیوانات ہم سے ڈرتے اور بھاگتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے باطن کی ناموافقت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم دوسروں کو نفرت اور بُری نگاہ سے دیکھیں۔ اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی طرف سے بھی ہم کو نفرت ہی ملتی ہے۔ اگر ہمارا باطن موافق ہو تو ہم کسی کو نفرت سے نہ دیکھیں اور سب ہماری موافقت و فرمانبرداری کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور اپنے باطن میں موافقت پیدا کرنا خود ہمارا کام ہے۔ جب تک ہم اپنی باطنی حالت میں تبدیلی پیدا نہ کریں اللہ تعالیٰ ہم کو موافقت عطا نہ فرمائے گا۔ قرآن ناطق ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔ اللہ تبارک تعالیٰ کسی قوم کی نسبت وحالت (رحمت و انعام کے اعتبار سے) اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفاق و افتراق کو اتحاد و وحدت سے نہ بدل دے۔ جب کوئی قوم اپنے افراد کی اصلاح کر کے اجتماعیت حاصل کرتی ہے تو اُس پر اللہ تعالیٰ نزولِ رحمت فرماتا ہے۔

امتِ مرحومہ پر خصوصی رحمت

ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ امین رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے تو حضورؐ نے اگلی امتوں کے زوال اور نزولِ عذاب کے متعلق دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کی یارسول اللہ

Marfat.com

بعض امتوں پر آسمانی عذاب پتھر، بجلی اور زعد وغیرہ کی شکل میں آیا جس سے وہ فنا ہو گئیں۔
حضورؐ نے دعا فرمائی "الٰہی میری امت کو ایسے عذاب سے محفوظ رکھ!" دعا مقبول ہوئی۔ اور حضورؐ کو الہامی طور پر بتایا گیا کہ اس امت پر اجتماعی صورت میں ایسا عذاب نہیں آئے گا کہ ساری کی ساری امت فنا ہو جائے۔ (گذشتہ اقوام پر جب عذاب الٰہی نازل ہوتا تھا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اُس کے صالحین کو حکم دیتا تھا کہ وہ اُس قوم سے نکل کر دوسری جگہ چلے جائیں۔ یعنی جب اُس قوم میں صالحین نہ رہ جاتے تو اُس پر عذاب نازل ہوتا۔ معلوم ہوا کہ کسی قوم میں صالحین کا ہونا باعثِ رحمت و برکت ہے۔ ہمارے درمیان اولیائے کرام کا وجود بھی مانعِ عذاب ہے۔ اور ہم اُن کی برکت سے اجتماعی طور پر محفوظ رہتے ہیں۔) پھر جبریل علیہ السلام نے عرض کی "یا رسول اللہؐ دوسری قسم کا عذاب عذابِ ارضی تھا جو بین الاقوامی جنگ، قحط یا طاعون و ہیضہ کی صورت میں نازل ہوا اور قومیں تباہ ہو گئیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دعا فرمائی۔ "الٰہی میری امت کو عذابِ ارضی سے نجات دے۔" اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہ امت اجتماعی طور پر عذابِ ارضی سے محفوظ رہے گی۔ (اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی گاؤں یا شہر میں وبا نہ آئے گی، طاعون نہ آئے گا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ تمام امت کو بیک وقت اجتماعی طور پر ایسے عذاب میں مبتلا نہ کیا جائے گا) پھر حضورؐ نے استفسار فرمایا کہ تیسری قسم کا عذاب کیا تھا؟ حضرت جبریلؑ نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! تیسری قسم کا عذاب یہ تھا کہ ان قوموں کے علماء میں اختلاف ہو جاتا، اور وہ اپنا اپنا راستہ الگ الگ بنا لیتے اور مخاصمت کی بنا پر ایک دوسرے کو کافر جہنمی اور بدعتی کہتے، ایک دوسرے سے نفرت کرتے اور اپنی عبادت گاہوں میں داخل نہیں ہونے دیتے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے کا ارادہ فرمایا وحی آئی۔ "اے محمدؐ، اس کے لیے ہاتھ نہ اُٹھانا، اس امت کے لیے یہی ایک عذاب مقدر

Marfat.com

ہوچکا ہے۔ اس امت کے علماء (سوء) میں اختلاف یقینی ہے جو فرقہ بندی کا باعث ہوگا جو علماء آپ کے نقشِ قدم پر ہوں گے وہی اپنے پیرووں کے ساتھ جنت میں جائیں گے"۔

امتِ مرحومہ کا اختلاف

ہمارے موجودہ علماء کے درمیان یہ عذاب الٰہی بدیہی صورت میں نمایاں ہے۔ فرقہ بندیوں کے ساتھ آپس کی خصومت عام ہے ایک دوسرے سے نفرت کرتے اور درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔ ان کی مسجدیں اگرچہ روبقبلہ ہیں، لیکن اپنے اپنے گروہ کے لیے مخصوص ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی مسجدوں میں آنے تک نہیں دیتے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ کا یہ فضل واکرام ہے کہ جب خانۂ کعبہ میں جاتے ہیں تو ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ہر فرقہ اپنی جگہ صرف اپنے کو ناجی اور باقی کو ناری سمجھتا ہے۔ غور کیجیے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان بھی بعض بعض مسائل و امور میں اختلاف ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ بیانِ حدیث کے موقع پر معتبر گواہ اور شاہد طلب کرتے تھے۔ یہی اجتہادی اختلافات ان کے لیے سبب کمال تھے۔ اور آج ہم ان کے اختلاف کے ذریعہ مسائل کی اصل حقیقت کو معلوم کرتے ہیں۔ لیکن کبھی انھوں نے اپنے اختلاف کو وجہ مخاصمت نہ بنایا تھا۔ کیونکہ اسلام میں اجتہادی اختلاف جائز ہے۔

اجتہاد کا ثواب

اگر کوئی مجتہد کسی مسئلہ پر اجتہادی کوشش کرے اور صحیح مسئلہ سامنے لائے تو اس کو دوگونہ ثواب ہے۔ ایک اجتہادی کوشش کا، اور دوسرا صحیح مسئلہ بتانے کا۔ لیکن اگر کوئی مجتہد نیتِ خالص کے ساتھ کسی مسئلہ میں جدوجہد کرے اور صحیح مسئلہ سامنے نہ لاسکے تو بھی جدوجہد کا ایک ثواب تو ضرور اُسے ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی سعی و کوشش کو رائگاں نہیں فرماتا۔ ہاں دوسرا ثواب اس سے ضرور منقطع ہو جائے گا۔ اور اُن کے متبعین بھی ان کے ساتھ ثواب میں یکساں ہوں گے۔

Marfat.com

حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْل "میری اُمّت کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔ لیکن نبی نہیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام غلطی سے اس لیے محفوظ ہوتے ہیں کہ وحیِ الٰہی ان کو ہر وقت غلطی سے مطلع کرتی ہے۔ لیکن نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس امت کے علماء و مجتہدین اجتہادی مسائل میں غلطی کریں۔ اور چونکہ مجتہدین کے لیے اجتہاد فرض ہے۔ اور بعض علماء آیت وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کو اس معنی سے بھی مراد لیتے ہیں۔ اس لیے اُن کو اجتہاد کا ثواب بالضرور حاصل ہوگا۔ خواہ وہ صحیح مسئلہ نہ نکال سکنے کی وجہ سے اس کے ثواب سے محروم ہو جائیں۔ اور جب دینِ اسلام اور اس کے قوانینِ شریعت میں اس درجہ لوچ لچک ہے تو بہت مشکل ہے کہ ایک شخص پنج ارکانِ اسلام کو قبول و اختیار کرنے کے باوجود کافر، مشرک یا جہنمی ہو جائے۔

آپس کی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا۔ تم میں سے کوئی جنت میں نہیں جائے گا جب تک ایمان نہ لائے۔ اور کوئی فرد ایمان میں کامل نہ ہوگا جب تک آپس میں محبت نہ رکھے۔ اسلام میں آپس کی محبت گویا تکمیلِ ایمان کا وسیلہ ہے۔ اور افتراقِ بین المسلمین یعنی دشمنی اور مخاصمت تنزلِ ایمان کا سبب ہو جاتا ہے۔ آپ اپنا ایمان بچانے کے لیے بھی دوسروں کی نسبت حسنِ ظن سے کام لیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر ایک شخص کے اعمال میں ۹۹ فیصدی کفر کا شائبہ ہو اور صرف ایک فیصدی خالص اسلام پایا جائے تو اُس کو کافر نہ کہو۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے "جو شخص رو بقبلہ سنتِ رسول کے مطابق نماز پڑھتا ہو، میں اُس کو

Marfat.com

کافر نہیں کہوں گا۔

مجدّد اور مجدِّد کی تعریف

ایک مجدَّد ہے اور ایک مجدِّد۔ مجدَّد وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے اُن اصولِ مسلمہ کو جو عوام میں متروک ہو گئے ہیں، اور طریقِ سنت کی بجائے بدعتوں نے جڑیں پکڑلی ہیں ان کو اپنے اجتہاد سے ثابت کر کے تجدید فرمائے۔ یعنی طریقِ سنت کو از سرِ نو ثابت و رائج کرنے کیلیے مسائل کی حقیقت کو واضح کرے۔ اور مجدِّد وہ ہے جو مطلقاً کوئی ایسی نئی بات اپنے دماغ سے تخلیق کر کے عوام میں رائج کرے جس کا قرآن و سنت سے کوئی ثبوت نہ ہو۔ اسی کو بدعت کہتے ہیں۔ اور یہ بدعت سیئہ ہے۔ میں نے جو کچھ بیان کیا یہ مجدَّد الف ثانیؒ کی طرف سے ہے مجدِّدین کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ مجدَّد اور مجدِّد میں تمیز پیدا کر کے رائے قائم کریں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن۔

Marfat.com

دو ۲
ساغر ۴

صوفیانہ یا سپاہیانہ زندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَلِکِ الْعَلِیِّ الْکَرِیْمِ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْمُتَّصِفُ بِالْخُلُقِ الْعَظِیْمِ۔

صُوفیا کی رُدپوشی

صوفیائے کرام اپنے آپ کو الفاظ اور ناموں کے پردے میں چھپا لیتے ہیں۔ مثلاً اگر اُن سے پوچھا جائے کہ آپ کو صوفی کیوں کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ چونکہ ہم اُون پہننے والے ہیں اور اُون کو عربی میں صوف اور فارسی میں پشمینہ کہتے ہیں اس لیے ہمیں صوفی یا پشمینہ پوش کہا جاتا ہے۔ لفظ صوفی کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ درحقیقت ایک مکر (یعنی خفیہ تدبیر) ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی خیر الماکرین ہے۔ اور جب ایک مومن اُس کی صفتِ مکر کے ماتحت آتا ہے تو وہ غیروں سے اپنے کو چھپانے کے لیے ایسی تدبیریں کرتا ہے جو اُس کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ رجوعِ خلق ان کی طرف زیادہ نہ ہو جائے۔ اور منع رجوعِ خلق اس لیے ہوتا ہے کہ تمام افرادِ انسان مؤظف نہیں ہیں کہ وہ صاحبِ طریقت و صاحبِ تصرف بن جائیں۔ پس ان کے ہجوم و التفات سے صوفی پر ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونا وہ اپنے لیے فریضہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ

Marfat.com

از روئے شریعت عوام پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہ مسائل کے ہر سوال کو خواہ وہ علمی ہو، عملی ہو، یا جانی و مالی بہر صورت پورا کریں۔ شریعت نے عوام کی استطاعت کے مطابق ذمہ داریاں تفویض فرمائی ہیں۔ اور عام انسان شریعت کے ہلکے پھلکے قوانین کے مطابق ذمہ داریاں برداشت کرتا ہے۔ مگر صوفی اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے کچھ اور بڑھ کر ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔ اور عوام ناواقفیت کی وجہ سے اس سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ پس ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کثرتِ رجوعِ خلق سے بچا جائے۔ اس لیے وہ لطیف مکاری کا لباس اوڑھنے کی کوشش کرتے ہیں

شریعت کی آسانی

آدابِ شریعت کے عام قوانین اس درجہ ہلکے پھلکے اور آسان مقرر کیے گئے ہیں کہ ایک ۹ برس کی لڑکی اور ۱۵ برس کا لڑکا بھی اس کا مؤظف ہو سکتا ہے۔ اور یہی اس کے انتہائی آسان ہونے کی دلیل ہے۔ اگر شریعت سخت گیر ہوتی تو ہرگز ان بچّوں کو اس کا مؤظف نہ بنایا جا سکتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بندوں پر سخت گیر نہیں بلکہ مرحمت و اکرام کرنے والا ہے۔ وہ خدائے رحمت ہے اس لیے اُس نے اپنے رسول کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے۔ تمام انبیائے کرام بندوں پر رحیم و مہربان تھے۔

صوفیا کی مہربانی

صوفی اپنے آدابِ ظاہری و باطنی جسمانی و روحانی دنیوی و اُخروی میں خاص ذمّہ داریاں اپنے اوپر عائد کر لیتے ہیں اور اِنھی آدابِ رسوم کی بنا پر ان کا باطن مصفّٰی اور مجلّٰی ہو جاتا ہے۔ اسی تصفیہ و تجلّیہ کی بنا پر ان کا لقب صُوفی ہوتا ہے۔ یعنی پاک صاف باطن۔ اور اس لقب کو صوف پہننے کی طرف منسوب کرنا اس لیے ہوتا ہے کہ اُن کو اپنے صفائے باطن کی وجہ سے خود پرستی و خود نمائی لاحق نہ ہو جائے اور اس کے نتیجے میں لوگ اس کے سامنے سجدوں میں نہ گرنے لگیں جیسا کہ

Marfat.com

بعض ادیان کے پیشوایانِ مذہبی اپنے اندر اتنی بلندی اور علویت کے قائل ہوجاتے ہیں کہ دوسرے ان کو دیوتا یا خدا ماننے لگتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں ہمارے اندر خدا کا ظہور ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ ان عام انسانوں میں بھی، جن سے وہ خود کو برتر و افضل سمجھتے ہیں، خدا کا اسی طرح ظہور ہے جس طرح ان میں ہے۔ برتری تو صرف اعلیٰ کردار کی ہے۔ اور اعلیٰ کردار کے معنی خود کو متواضع اور خاکسار سمجھنا ہے۔ اور صوفیہ اسی مقام پر فائز ہوتے ہیں جو کہتے ہیں ہم تو گدڑی اور صوف پہننے والے ہیں۔ لیکن ان گدڑیوں میں جواہرات کے تلاش کرنے والے ان کے جواہر سلیمہ و عقلیہ کو پہچانتے ہیں۔ اور اسی کی قدر کرتے ہیں۔

بذل و ایثار

اس سے پیشتر، صوفی کی مثال میں حضرت ابراہیمؒ ادہم کا واقعہ بیان کیا گیا، کہ کس طرح وہ اپنی دنیاوی سلطنت چھوڑنے کے بعد روحانی سلطنت کے بادشاہ ہوئے، اور کردار یہ کہ اپنے خادموں کے لیے کھانا پکانے اور چولھا پھونکنے میں ان کی ریش مُبارک زمین پر لوٹتی تھی۔ اور کھانا تیار کر کے پہلے خادموں کو کھلاتے تھے، پھر خود کھاتے تھے۔ اور یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو مختصر کھانا آپؐ کے گھر میں تیار ہوتا، اگر مہمان آجاتے تو پہلے اُن کو شکم سیر کھلاتے، کچھ بچتا تو خود کھاتے ورنہ یوں ہی گزار دیتے۔ اکثر تین تین پانچ پانچ دن اپنا کھانا مہمانوں یا سائلوں کو عنایت فرماتے اور خود پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔ یہی حال حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کا تھا۔ فاقے تو اکثر ہی ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت علی مرتضیٰ ایک یہودی سے پسائی کے لیے جَو لائے اور حضرت فاطمہؓ کو پیسنے کے لیے دیا۔ شام کو اُس سے جو مزدوری کا آٹا ملا اُس سے پانچ روٹیاں پکائیں۔ اس لیے کہ گھر میں پانچ ہی افراد تھے۔ افطار کے وقت

Marfat.com

دروازے پر سائل نے آواز دی "اے اہلِ بیتِ کرم' اور اے اہلِ بیتِ رسولؐ' میں دو دن کا بھوکا ہوں' مسکین ہوں اگر ہو سکے تو مجھے کھانا کھلا دو۔" یہ سُن کر حضرت علیؓ نے اپنا حصہ مسکین کو دے دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے بھی اُن کی تقلید کی تو فضہ آپ کی کنیز نے بھی ایثار کرنا مناسب جانا۔ یہ دیکھ کر حسن اور حسین علیہما السّلام نے بھی' اگرچہ خورد سال تھے مگر سخاوت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی اپنی روٹیاں بھی سائل کو دے دیں۔ اسی طرح دو دن مزید ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ یہ تھا فقرائے صوفیہ کا طریقِ ایثار۔ یہ لوگ فقراء اور مساکین کو اپنے اوپر مقدم سمجھتے تھے۔ خود کما کر دوسروں کو کھلاتے اور خود فاقہ سے بسر کرتے تھے۔ یہی معنی ہیں تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے۔ انھیں کی شان میں آیات نازل ہوئیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے لیے نذر کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ اور اپنے کھانے سے مسکین' یتیم اور اسیر کو افطار کراتے ہیں۔ خود صبر کرتے اور شاکر رہتے ہیں۔

رزقِ غیبی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنی بیٹی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے' اور فرمایا "فاطمہؓ' کچھ کھانے کیلیے ہو تو لاؤ۔ حضرت فاطمہؓ خودداری اور ادب کی وجہ سے خاموش رہیں۔ حجرے میں جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کی "اے رزّاق' تیرے حبیب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکین فاطمہ کے گھر آئے ہیں اور کچھ کھانا طلب فرماتے ہیں۔ تو عالم الغیب اور دانائے راز ہے کہ آج فاطمہ کے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اپنی رزّاقیت سے کچھ عنایت فرما۔ اُسی وقت غیب سے اپنے سامنے خوانِ نعمت موجود پایا۔ اور خوشی خوشی رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر حاضر کیا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے سرپوش اُٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر فرمایا۔ "بیٹی فاطمہ' یہ کھانا تو تمھارے گھر کا نہیں ہے! اور نہ دنیا کا کھانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے آیا؟ حضرت فاطمہؓ نے ماجرائے حال بیان کیا۔

Marfat.com

تو حضورؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور فرمایا "الحمد للہ! کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے میری امت بلکہ اہل بیت میں ایک ایسی خاتون پیدا کی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کی طرح غیب سے اپنا رزق حاصل کرتی ہے۔

رزقِ بے حساب

جب حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریمؑ کے پاس جاتے، تو بے فصل میوہ جات اور کھانے کی چیزیں ان کے پاس موجود پاتے۔ پوچھتے "یَا مَرْیَمُ، اَنّٰی لَكِ ھٰذَا" (اے مریم، یہ کھانے کی چیزیں تمھارے پاس کہاں سے آتی ہیں؟)۔ "قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (وہ جواب دیتیں، یہ میرے پروردگار کے پاس سے آتی ہیں۔ "اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ"۔ (اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔) اس نصِ صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بلا سبب، غیب سے روزی دینا داخل ہے۔ (لیکن اس قدرت کے لیے اُس کی مرضی بھی ضروری ہے۔ اور چونکہ اس کی مرضی کا علم کسی کو نہیں ہے اور نہ اُس کی مرضی کو دعا، عبادت اور وظائف سے مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے شریعتِ ظاہرہ وباہرہ میں بلا سبب توکل کرنا داخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسباب کے ساتھ توکل کا حکم دیا گیا ہے۔

توکل بلا سبب

وہ مردانِ خدا جو بلا سبب توکل اختیار کرتے ہیں چونکہ ان کیلیے روزی پہنچنا، اور نہ پہنچنا دونوں برابر ہو جاتا ہے، یعنی اگر چالیس چالیس دن رزق میسر نہ آئے تو اُن کے دل میں مشیئتِ الٰہی سے شکایت کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا، اس لیے اُن کو بلا سبب کے توکل کرنا جائز ہے۔ یہ عام مدعیوں کا کام نہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سادگی

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جب اپنے صحابہؓ کے درمیان بیٹھتے اور کوئی ناواقف انسان آجاتا

Marfat.com

تو ظاہری طور طریق اور انداز سے نہ جان سکتا کہ ان میں سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ (ہاں ایمان والوں کے لیے انوار کی تابانی پوشیدہ نہ رہ سکتی، اور جب وہ اپنی رُوح کو فدا ہوتے ہوئے دیکھتے تو پہچان لیتے کہ آپ رسولؐ ہیں) نہ آپ کے لیے مسند تھی نہ تکیہ۔ اور نہ کوئی مخصوص جگہ، سب کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے۔ لباس و پوشاک میں بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔ غرض عوام کے ساتھ اس درجہ شمولیت تھی کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کے برخلاف دیگر مذاہب کے پیشوایانِ روحانی اس درجہ متمیز اور الگ تھلگ رہتے ہیں کہ اُن کے معتقدین و مریدین کو بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اور اگر سال میں ایک مرتبہ کسی موقع پر دیدار نصیب ہوا تو وہ اپنے لیے انتہائی سعادت مندی سمجھتے ہیں۔ اور اسی مشکل حصول کی بنا پر ان کو خدائے روئے زمین، یا مظہر خداوندی سمجھتے ہیں۔ اور اس ایک دیدار کے بدلے میں اپنی دولتیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نیازمندی کے ساتھ پیش کی ہوئی دولتوں سے سال بھر کی عیاشی اور فضول خرچی کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ کیا یہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اور اسی کو پیرویٔ حق و مطابعتِ رسُول کہتے ہیں؟

صُوفیہ کا لباس

وہ صوفی، درویش یا عارف جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کو رہنما بنا کر مقاماتِ روحانی طے کرتے اور کسی حالت میں خلافِ سنّت کا ارادہ نہیں کرتے بے شک ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اور چونکہ وہ پیغمبر نہیں ہوتے اور نہ براہِ راست تبلیغ ولایت پر مامور کیے جاتے ہیں اس لیے اُن کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی ولایت کا اظہار کریں۔ پس وہ عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتے اور معمولی لباس میں اپنے کو چھپا لیتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کا صوفیانہ خرقہ اس طرح ان کو چھپا لیتا تھا کہ اُمرا اور اہلِ ثروت حضرات اُن کو اپنی نظر میں کوئی جگہ نہیں دیتے تھے۔ آج وہ زمانہ نہیں ہے

Marfat.com

عوام نے خرقہ اور سوف میں بھی ان کو تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے آج ایک صحیح صوفی زیادہ سے زیادہ عالمانہ یا اوسط معمولی اور یا کم عزت لباس کو اختیار کرتا ہے۔ اور اس میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ تاکہ عوام کی زد اور اُن کے کثرتِ رجحان سے بچ سکے۔ لیکن وہ ان پردوں کے باوجود خواص کی نگاہوں سے نہیں بچ سکتے۔ وہ ان کو ہر لباس میں پہچان لیتے ہیں۔

دیدۂ خواہم کہ باشد شہ شناس تا شناسد شاہ را در ہر لباس (رومیؒ)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ میں وہ بصیرت تلاش کرتا ہوں جو شاہ شناس ہو اور شاہ کو ہر لباس میں پہچان لے۔ اور یہ صاحبانِ بصیرت شاہ شناس ہوتے ہیں۔ یہاں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلچسپ مثال دی ہے :-

شاہ شناسی

محمود غزنوی راتوں کو بھیس بدل کر غریب رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے شہر میں گھوما کرتے تھے۔ ایک رات ایک ویرانے میں گزر ہوا۔ تین آدمیوں کو مشتبہ حالت میں دیکھا اور معلوم کر لیا کہ یہ بالضرور چور ہوں گے۔ ان کے پاس آئے۔ اُنھوں نے پوچھا "تم کون ہو؟" بادشاہ نے جواب دیا "میں چور ہوں اور اکیلا ہوں۔ اگر کسی کا ساتھ ہو جائے تو مل کر اپنا کام کریں"۔ ان لوگوں نے کہا "تمھارے پاس اس کام کے لیے کوئی ہنر بھی ہے؟"۔ کہا "ہاں ایک ہنر ہے، مگر اپنے ہنر کو اُس وقت تک ظاہر نہیں کروں گا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ آپ لوگ بھی چور ہیں"۔ ان میں سے ایک بولا "ہم لوگ واقعی چور ہیں۔ اور اگر تم ہمارا ہنر جاننا چاہتے ہو تو میں نقب زنی کا استاد ہوں۔ اتنی صاف اور صحیح نقب لگاتا ہوں کہ آج تک کبھی غلط نہیں ہوئی"۔ دوسرے نے کہا "میں جانوروں کی زبان جانتا ہوں۔ کوئی جانور آواز نکالے، مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کیا کہتا ہے"۔ تیسرے نے کہا "میں اگر کسی آدمی کو ایک مرتبہ اندھیرے میں بھی دیکھ لوں اور وہ کہیں کسی لباس میں

Marfat.com

میرے سامنے آئے میں اُسے ضرور پہچان لوں گا۔ اب تم بتاؤ تم میں کیا ہنر ہے؟" محمود نے جواب دیا۔ "میرا ہنر یہ ہے کہ اگر میرے ساتھی گرفتار کر لیے جائیں، اور اُن کو پھانسی کا حکم دیا جائے۔ اُس وقت اگر میں ڈاڑھی ہلا دوں تو وہ پھانسی پر سے اتر آئیں۔" ان لوگوں نے کہا بھئی تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔ تمھاری ڈاڑھی میں بڑی اچھی کرامت ہے جس کے ہلنے سے مجرم پھانسی کے تختے سے اُتر آتا ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ مل جاؤ تو ہم بڑی بڑی جگہ چوری کریں۔ محمود نے کہا۔ "اچھا بولو، اب کہاں چلنا ہے؟" ایک نے کہا "چلو ملک التجار کے گھر میں چلیں۔" دوسرا بولا فلاں رئیس کے یہاں ہاتھ ماریں۔ محمود نے کہا۔ "نہیں، ان چھوٹی چھوٹی جگہوں پر کیا مال ہاتھ آئے گا۔ کیوں نہ ہمت کر کے بادشاہ کے خزانے کو لوٹا جائے۔" سب نے یہ مشورہ پسند کیا۔ اور روانہ ہو گئے۔ ایک مناسب جگہ پہنچ کر نقب زن نے اتنی صحیح نقب لگائی کہ چاروں کو قلعہ کے اندر خزانہ کے پاس لا کھڑا کیا۔ اسی وقت ذرا سی آہٹ سے چونکنے ہو کر کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ اُس زبان جاننے والے نے حیرت اور تعجب سے کہا۔ "عجیب بات ہے۔ ایک کتے نے جب بھونکنا شروع کیا، تو دوسرا کتا اُسے روکنے لگا اور بولا۔ کیوں بھونکتے ہو، خاموش ہو جاؤ۔ دیکھتے نہیں ہو بادشاہ ان کے ساتھ ہے۔" غرض ان لوگوں نے خزانے کا تالا توڑا۔ اور اندر داخل ہو کر اپنی مرضی کے مطابق خوب مال اسباب لوٹا۔ اور اسی راستے سے آسانی کے ساتھ نکل آئے جس راستے سے داخل ہوئے تھے۔ رات کا زیادہ حصہ اسی کد و کاوش میں گزر گیا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ اس لیے طے یہ پایا کہ سارا مال ویرانے میں ایک جگہ دفن کر دیا جائے۔ کل رات تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیں گے ۔ صبح محمود کے اشارے پر جاسوسوں نے تلاش کر کے تینوں چوروں کو گرفتار اور تمام مال مسروقہ برآمد کر لیا۔ اقرار جرم کر لینے کے بعد بادشاہ نے تینوں کو پھانسی کا حکم دیا۔ جس وقت جلاد انھیں پھانسی کے لیے لے جانا چاہتا تھا، اُس

Marfat.com

تیسرے نے بادشاہ سے عرض کیا۔ اعلیحضرت اس جرم کے مرتکب چار چور تھے۔ دو آدمیوں نے اپنا اپنا کمال ظاہر کیا۔ حضور عالی میں اپنے ہنر کے مطابق اس چوتھے چور کو بھی دیکھ رہا ہوں جو اس وقت دربار میں حاضر ہے۔ اعلیحضرت اُسے بھی گرفتار کیا جائے۔ کیونکہ یہ وقت اس کے کمال کے اظہار کا ہے کہ وہ اپنی ڈاڑھی ہلادے اور ہماری جان بخشی ہو جائے"۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا" اچھا، اگر تم کو چھوڑ دیا جائے تو تم اس فعل قبیح سے باز آکر سلطنت کے تمام چوروں کو گرفتار کرا دو گے؟" ان کے اقرار کرنے پر انھیں رہا کر دیا گیا۔ اور سلطنت کے تمام چور اُن کی نشان دہی پر گرفتار کر لیے گئے۔ اور ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ اسی قصہ میں مولانا رومؒ نے فرمایا ہے :-

دیدۂ خواہم کہ باشد شہ شناس　　تا شناسد شاہ را در ہر لباس

صوفی عارف ہوتا ہے

پس صوفی وہ ہے جو خدا کو ہر صفت میں پہچانتا ہے۔ ہر مظہر میں خدا کا ظہور پاتا اور ہر صفت کو اسی کا آئینہ بناتا ہے یعنی جب اُس کا آئینۂ دل صاف ہو جاتا ہے تو شش جہت ایسے روشن ہو جاتے ہیں کہ جس طرف سے، جس رنگ لباس میں جس روپ اور بہروپ میں اُس کے جلوے اُبھرتے ہیں، وہ دھوکا نہیں کھاتا۔ اور صاف پہچان لیتا ہے۔ اسی لیے اس کو کسی کے ساتھ بغض و عناد، جھگڑا فساد اور دعویٰ یا انتقام نہیں ہوتا۔ ہر شے کے ساتھ محبت کرتا اور ہر مخلوق کو شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اعلیٰ کردار کی بنا پر آئینۂ خدا نما بن جاتا ہے۔ اور اس قربِ خاص کے عوض خود اللہ تبارک تعالیٰ اس کی ہستی کو اپنے جمال و کمال کے ظہور کا مرحشمہ بنا لیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اچھی اور بُری تمام مخلوق کو عیال اللہ، مظاہر اسما اور پرتوِ افعال الٰہی سمجھتا ہے۔

Marfat.com

آئینۂ ایمان اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِن حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یعنی مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔ جب ایک مومن دوسرے مومن کے سامنے آتا ہے تو اُس کے آئینے میں اپنے ایمان کا نور دیکھتا ہے اور اُسے پسند کرتا ہے۔ لیکن صوفی کا آئینۂ ایمان اس درجہ منور و متجلّٰی ہوتا ہے کہ ذاتِ الٰہی کے جملہ صفاتِ واسعہ پوری تابانی کے ساتھ اس میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور ہر صاحب بصیرت اس کے خلقی کردار میں خالق کے اسماء و افعال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ خدا کو اپنے باطن اور اپنے آپ کو خدا کے علم میں صورِ علمیّہ کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔

اعیانِ ثابتہ اصطلاح تصوف میں اعیانِ ثابتہ کے معنی اشکالِ اسماءِ الٰہی ہیں، جن سے صورِ علمیہ مراد لی جاتی ہے۔ یعنی مخلوق و حادث کی وہ شکل جو قبل حدوث خزانۂ علمِ الٰہی میں موجود تھی، آج بھی اُسی طرح ہے اور آئندہ بھی اسی طرح رہے گی۔ یا یوں کہیے کہ اللہ تبارکؐ تعالیٰ کے بے حد و لا انتہا اسماء میں تشکیلِ اَشکال کی جو قابلیّت ہمیشہ سے موجود تھی ان قابلیتوں کے علم میں مصوّر و متشکل ہو جانے کو اعیانِ ثابتہ کہتے ہیں۔ مثلاً کمہار جو مٹی گوندھ کر تیار کرتا ہے تو اُس کے علم ذہن میں اس مٹی سے بن سکنے والی تمام اَشکال پہلے ہی موجود ہوتی ہیں۔ اب جب اُس کمہار کی قوت فعّالیہ بالارادہ متحرک ہوتی ہے تو وہی اَشکال اس مٹی سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں جو اُس کے علم میں پہلے سے موجود تھیں۔ وہی اعیانِ ثابتہ ہیں ۔ (انسان کی ایک شکل تو وہ ہوتی ہے جو اُس کے عینِ ثابت کے ماتحت وجود میں آئی۔ اور دوسری شکل وہ ہوتی ہے جو اُس کے کردار کے ماتحت وجود میں آتی ہے۔ اگر انسان کے کرداری اشکال اس کے عینِ ثابت کے عین مطابق ہوں تو وہ اسمِ الٰہی جو اُس عین کا مربی ہے پوری طرح اس میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ یہی مقامِ تصوف ہے۔ اور اگر

Marfat.com

اس کے کرداری اشکال اُس کے عینِ ثابت کے متضاد ہوں اور ایک دوسرے کے ایسے مخالف ہوں کہ ان میں کوئی رشتۂ یگانگت واتحاد نہ پایا جائے اس کا نام ابلیسیت ہے اس تشریح سے بہ آسانی یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ سالک کا کام اپنے کرداری اشکال کو اپنے عینِ ثابت سے ملانے کی کوشش کرنا ہے۔ اور اُس کی کامیاب کوشش کا نتیجہ تصوّف وولایت ہے۔ پس یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنے کردار کو اس صورِ علمیّہ سے مطابق کرکے جو خاص علمِ الٰہی میں تھا، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ یعنی اس کے کرداری اشکال بعینہٖ ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسے صورِ علمیۂ الٰہیہ میں ہیں۔ تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے عینِ علم میں داخل ہو جاتا ہے۔)

صوفیہ کے کردار

وہ صوفی جو اپنے کو اعیانِ ثابتہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے نفرت وانکار سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خدا کی طرف سے دیکھتا ہے اور خالق کی مخلوق سمجھتا ہے۔ اور خالق چونکہ حکیم ہے اور حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہر شے میں اس کی حکمت تلاش کرتا ہے۔ اور حکمت معلوم کرلینے کے بعد اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

موافقت

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ کا مقولہ تھا کہ "مجھے ہفتاد ودو ملت سے صلح وموافقت ہے"۔ یہ سن کر ایک فقیہ حیرت میں پڑ گیا۔ اُس نے اپنے ایک طاقتور مرید کو بلا کر سمجھایا کہ تم مولانا روم کے پاس جاؤ، اور ان سے اس مقولہ کے بارے میں دریافت کرو۔ اگر وہ اس کا اقرار کریں تو اُن کو بتاؤ کہ تم قرآن کریم کی صریحی نافرمانی کے مرتکب ہو کہ قرآن فرماتا ہے وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (باطل کو حق نہ بناؤ)۔ اور وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ (برائیوں کو بھلائیوں کے برابر نہ بناؤ)۔ پس تم حکم قرآن کے

Marfat.com

متنفر ہو اس لیے تمھاری توہین ہمارے لیے جائز ہے۔ پھر خوب اُن کو بُرا بھلا کہو۔" جب اُس نے مولانا کے پاس جا کر اُن کے اس مقولہ پر اعتراف کرایا، اور بُرا بھلا کہنا شروع کیا، تو آپ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ تھک کر چپ ہو گیا تو آپ نے ہنس کر فرمایا۔ "بھائی! تم تہتر ہوئیں گروہ میں ہو اور مجھے تم سے بھی موافقت ہے۔

مصائب کے صبر پر انکشاف اسرار

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادہمؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی زندگی میں سب سے بہتر وقت کون سا گزرا ہے؟ آپ نے فرمایا۔" میں ایک طویل سفر میں تھا۔ اتفاقاً ایک مسجد میں ٹھہرا۔ اور اس قدر تھکا ہوا تھا کہ مجھ میں اُٹھنے کی بھی سکت باقی نہ تھی۔ بعد نمازِ عشا خادم نے آکر مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میری ہمت جواب دے چکی تھی، میں اسی طرح پڑا رہا۔ خادمِ مسجد نے میرے پاؤں پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا داخلِ مسجد سے صحنِ مسجد میں لایا۔ اور وہاں سے کھینچتا ہوا دروازے سے باہر لایا۔ دروازے سے نیچے اترنے کی سات سیڑھیاں تھیں وہ مجھے کھینچتا ہوا نیچے اتر گیا اور ساتوں سیڑھیوں پر میرا سر کھٹ کھٹ سات مرتبہ شدّت کے ساتھ ٹکرایا اور ہر ٹکر پر میرے سامنے ایک ایک عالمِ سرِّ الٰہی منکشف ہو گیا۔ اور اُن پر پڑے ہوئے پردے اُٹھ گئے۔ میں نے سوچا، اور آج بھی سوچتا ہوں کہ اے کاش سات سیڑھیوں کی بجائے ستّر سیڑھیاں ہوتیں اور ان ستّر سیڑھیوں سے میرا سر ٹکراتا، تو کس درجہ عوالمِ سِر میرے سامنے منکشف ہو جاتے۔ میری زندگی میں یہ وقت سب سے بہتر گزرا ہے اور میں آج بھی اس وقت کو یاد کرتا، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور اس خادم کو دعائیں دیتا ہوں۔

بلند اخلاق ہی صوفیہ کے اعمال ہوتے ہیں

دنیا کو عیسویت نے حلم کا سبق دیا تھا کہ اگر ایک طرف طمانچہ

Marfat.com

مارا جائے تو دوسرا رخ بھی آگے بڑھا دو ۔ لیکن آج دنیا میں کوئی عیسائی یا کوئی قوم ایسی حلیم نہیں ہے جو اس تعلیم پر عمل کرے۔ لیکن اسلام کا یہ فرقہ تصوف ہے جو اسلامی حلم کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہوا۔ وہ بدلہ لینے کے مقابلے میں عفو و درگزر کرنے کو اپنا شعار بناتے ہیں جیسا کہ اسلام کی تعلیم ہے کہ ۔ اگر کوئی شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اتنا ہی بدلہ لے لو اور اگر تم عفو کرو تو اللہ محسنین کے اجر کو ضایع نہیں فرماتا چنانچہ اس حلم اور احسان کو تصوف نے اپنا لیا ہے۔

صوفی سپاہی اور سپاہی صوفی ہوتا ہے

اگر یہ کہا جائے کہ صوفیہ کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پشمینہ پوش ہوتے ہیں، تو ضروری ہے کہ سرد ممالک کے تمام فوجیوں کو صوفی کہا جائے۔ اس لیے کہ وہ پشمینہ ہی پہنتے اور کمبل اوڑھتے ہیں۔ لیکن آپ ان کو صوفی کبھی نہیں کہتے۔ ہاں، ایک چیز کر میں اس بات پر ضرور زور دوں گا کہ آپ اُن کو بھی صوفی کہیں۔ کیونکہ ان فوجیوں کے اندر ایک ڈسپلن اور ستھرا انتظام ہوتا ہے۔ وہ صرف فرمانبرداری جانتے ہیں۔ اور حکم پر جان دیتے ہیں۔ اُن کا ہر ہر قدم آپس کے اتحاد و اتفاق کے ساتھ اور اطاعت امیر کے ماتحت اُٹھتا ہے۔ وہ خلق اللہ کی حفاظت کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور دوسروں کو آرام پہنچانے کے لیے خود تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ اگر آپ ان اوصاف کے اعتبار سے ان فوجیوں پر نظر ڈالیں تو ان میں صوفیانہ اخلاق شدت سے محسوس کریں گے۔ کیونکہ ایک تربیت یافتہ صوفی کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ امیر کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ اپنے پیر کے ادنیٰ اشارے پر جان قربان کرتا ہے۔ وہ کسی حکم پر یہ نہیں سوچتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہ حکم کو صرف حکم جانتا ہے اور اُس کے صحیح یا غلط ہونے کی اُلجھن میں نہیں

Marfat.com

پڑتا۔ جس طرح ایک فوجی جوان اپنے افسر کے کسی حکم پر یہ خیال نہیں کرتا کہ اس کے نتیجے میں اس کی جان جائے گی، یا شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی طرح صوفی خدا، رسول اور پیر حکم کے متعلق کسی تدلیل اور توجیہ سے کام نہیں لیتا وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کا انجام موافق ہوگا یا مخالف وہ صرف اس کی تعمیل کرتا ہے۔ آپس کے اتحاد و اتفاق اور اخوت و موانست کی مثالیں قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے سدِ رمق کو برقرار رکھنے کے لیے پینے کا ایک کٹورا پانی اپنے لیے نہیں بچاتا وہ اپنے پیاسے ساتھی کو پانی پلا دیتا ہے، اور خود پیاسا مر جاتا ہے۔ غرض صوفیوں کی زندگی سرتاپا اخلاص اور ایثار ہے۔ وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو مقدم سمجھتا ہے وہ خود اپنے راستے پر آگے بڑھنے میں کسی کو پیچھے نہیں ہٹاتا۔

سپاہی اور صوفی کا فرق

اگرچہ اکثر امور میں سپاہیوں کے کردار صوفیانہ کردار سے مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ یعنی ایک سپاہی اپنے مقررہ اوقات کے علاوہ آزاد ہوتا ہے۔ اس حالت میں نہ تو اُس پر کوئی پابندی ہوتی ہے۔ اور نہ کسی بات میں مکلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے آرام کے اوقات میں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف آرام کرتا ہے۔ لیکن ایک صوفی کی ساری زندگی، اور زندگی کی ہر ہر سانس اُس کے قبضۂ و اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ کوئی ساعت اس کی نہیں۔ کوئی آرام اُس کے لیے نہیں۔ وہ خدا کی ایک ایسی مشین ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اور کبھی بند نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اُس کے پُرزے گھِس گھِس کر نسیت و نابود ہو جائیں سپاہی صرف اپنے ظاہری اور جسمانی اعمال سے، اپنے امیر کا تابع ہوتا ہے۔ اس کی رُوح اس کا ضمیر اور اُس کا دل آزاد ہوتا ہے۔ لیکن صوفی کا ظاہر و باطن یکسانیت کے ساتھ اپنے امیر (پیر) کا تابع ہوتا ہے۔ بہر حال اس فرق کے باوجود ایک سپاہی بڑی حد تک صوفیانہ

Marfat.com

کردار سے متخلّق ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک ادنیٰ سی ترغیب اُس کو سلوک اور تصوّف کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور وہ مراتب کمال تک بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ اور اکثر اللہ کے چھپے ہوئے بندے سپاہیانہ لباس میں رہتے ہیں جن کو صرف اہلِ بصیرت ہی دیکھ اور پہچان سکتے ہیں۔ ؎

دیدۂ خواہم کہ باشد شہ شناس تا شناسد شاہ را در ہر لباس

پس ہر شخص کے ساتھ خوش گمانی سے پیش آنا چاہیئے۔ ہر شخص کو اپنے سے بہتر اور مقام کے اعتبار سے بالاتر سمجھنا چاہیئے۔ تاکہ تواضع سے متصف ہو جائے جس کے بغیر حصولِ ولایت ناممکن ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۵

نسبت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَلِکِ الْاَکْبَرِ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْبَشَرِ۔

فتح باب اور نسبت عرفاء کے نزدیک مراتب سلوک کے چند درجات ہیں۔ جس میں ابتدائی درجے کے آخری مرحلہ میں ایک مقام آتا ہے جس کو نسبت کہتے ہیں۔ جب تک نسبت حاصل نہ ہو جائے سالک مرتبۂ ولایت یعنی فنا و بقا میں نہیں پہنچ سکتا۔ پہلے نسبت حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد ولایت۔ ہاں نسبت حاصل کرنے سے پہلے فتح باب ہو جاتا ہے۔ جس کی علامت یہ ہے کہ جب سالک حالتِ ذکر میں اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے جس میں وہ دیکھتا ہے کہ میرے دل سے دماغ اور دماغ سے عرش تک ایک نورانی ستون روشن ہو گیا ہے۔ خواہ یہ حالت ایک لمحہ کیلیے ہو یا دائمی ہو جائے اسی حالت کو فتح باب کہتے ہیں۔ اس فتح باب کے بعد نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

نسبت کے اقسام نسبت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں چند اقسام کا بیان کیا جاتا ہے۔ ان نسبتوں کو علماً جاننے کے بعد عملاً روشناس ہونا ذوق و جذبہ کے لیے ضروری ہے۔

Marfat.com

فطری نسبت | یہ ایک خلقی یا فطری نسبت ہے جو ہر مخلوق کو اپنے خالق اور ہر مملوک کو اپنے مالک کے ساتھ مربوط و متوجہ رکھتی ہے۔ جب کوئی بندہ اس نسبت سے منسوب ہو جاتا ہے تو وہ طلب حق کی اُس منزل پر آجاتا ہے، جو اس کی پیدائش کا اصل مقصود ہے۔ اس کا نتیجہ سلوک و محویت ہوتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے فنا و بقا حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ولایتِ الٰہیہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہ فطری نسبت صرف انسان ہی کو نہیں، بلکہ ہر مخلوق، معادن و جمادات، نباتات و حیوانات میں سے ہر ایک کو فطرۃً حاصل ہوتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر مخلوق شعوری و لاشعوری، ارادی یا غیر ارادی طریقہ پر اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جس کا اظہار قرآنِ کریم نے فرمایا ہے "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے یعنی ان کے قوائے فطریہ اُس کے فرمانبردار اور اُسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ یہی فطری نسبت ہے جو انسان کو بھی حاصل ہے۔ لیکن دوسری مخلوق کے برخلاف انسان کے ارادہ کی مختاریت نے انسان کے اندر اس نسبت کو پوشیدہ کر دیا ہے۔ اب جیسے جیسے ارادہ و نیت میں پاکیزگی اور اعتقادیت آتی ہے (اور دوسری نسبتوں سے بھی مدد ملتی ہے) تو یہ نسبت اُبھرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ مرتبۂ عشق تک پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ عشق اُس کی خودی و خود بینی کے تمام لوازمات اور زندگی کے علل و اسباب کو اُس کے شعور میں بے قدر و بے منزلت کر دیتا ہے کیونکہ "اَلْعِشْقُ نَارٌ یُحْرِقُ مَا سِوَی الْمَحْبُوْبِ"۔ عشق وہ آگ ہے جو سوائے محبوب کے ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے۔ یہی ذاتِ محبوب میں حبیب کا فنا ہو جانا ہے۔

شعوری و لاشعوری محبّت | جو شخص شعوری طور پر اللہ تعالےٰ سے محبت کرتا ہے وہ مؤمن ہوتا ہے۔ اور وہ شخص جو لاشعوری یعنی فطری

Marfat.com

طریقہ پر خدا سے محبت کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ کس سے محبت کرتا ہے تو اس کا یہ عدم ادراک طلب و سلوک میں مقامِ تفرقہ اور غفلت تک پہنچا دیتا ہے جو کفر ہے۔ یہاں کفر سے ہماری مراد کفرِ معروف نہیں ہے جو بطریقِ فتویٰ کسی پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس کفر کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس حقیقت کو نہیں پہچانتا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ بلکہ اس لباسِ تعین ہی کو عین محبوب سمجھتا ہے۔ جس نے محبوب کی حقیقت کو چھپا لیا ہے۔

کفر و شکر

کفر "ضدِ شکر" ہے۔ شکر کے معنی منعم و محسن کے انعام و احسان کو ظاہر کرنا ہے۔ اور کفر وہ ہے جو اس انعام و احسان کو چھپالے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عقل اور سمجھ دی ہے اور یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ اور اسی عقل سلیم کی بنا پر ہم دیگر حیوانات سے ممتاز ہیں۔ اگر ہم اس نعمت کا شکر ادا نہ کریں، یعنی اپنی عقل اور سمجھ سے بندے اور خالق کے درمیان محبت کے رشتہ کا احساس نہ کریں تو یہ ایک عظیم کفرانِ نعمت ہے۔ بس کسی نعمت کو منعم کی منشار کے مطابق استعمال کرنا صحیح تشکّر ہے۔ اور اس کے حکم کے خلاف استعمال کرنا کفر ہے۔ اس طرح ہمارے اعضاء ہمارے حواس، ہمارے قویٰ اور عقول و صفات و ارواح سب انعاماتِ الٰہی ہیں۔ اور ان کا شکر ادا کرنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان تمام انعامات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کریں۔ ورنہ اس کے برخلاف کفر (لغوی) کا اطلاق کیا جائے گا۔ اور یہی کفر اور شکر کا فرقِ ما بہ الامتیاز ہے۔

کفر و اسلام

اب، جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ کفر اور شکر کیا ہے، یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اسلام اور ایمان کیا چیز ہے؟ اسلام انعاماتِ الٰہی کو تسلیم اور اس کا اظہار کرنا، اللہ کو اللہ جاننا۔ اپنے کو بندہ سمجھنا۔ بندگی کا حق ادا کرنا اور مولیٰ کے حقوق کو بجا لانا ہے جب تم نے حقوق اللہ کو ادا کیا۔ اور بندگی میں ثابت قدم رہے تو تم مسلمان ہو۔ اور اگر ایسا

Marfat.com

نہیں ہے تو خواہ تمھارا نام حسن ہو یا حسین، عمر ہو یا ابوبکر، علی ہو یا سلمان، محمد ہو یا مصطفےٰ تم کفرانِ نعمت کی بنا پر اسلام سے دُور اور کفر سے قریب ہوتے جاؤ گے۔ اسلامی نام کسی عمل کفر پر غالب نہیں آسکتا۔ انبیائے کرامؑ نے برائے نام تم کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ عملی ایمان کی طرف تم کو رجوع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے حقیقتِ اسلام اور حقیقتِ ایمان طلب کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً"۔ اسلام میں پوری طرح یعنی قولاً، فعلاً، اعتقاداً اور ارادۃً داخل ہو جاؤ۔ یہ نہیں کہ ایک طرف اسلام کا دعویٰ کرو، اور دوسری طرف اعمال سے کفرانِ نعمت کرو۔

مرتبۂ ایمان مافوق الاسلام ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا مرتبہ اسلام کے مرتبہ سے بالاتر ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو لیکن مؤمن نہ ہو۔ ہاں، جو شخص مؤمن ہو وہ بالضرور مسلمان ہوتا ہے۔ "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" عرب کے بدّو لوگ کہتے تھے کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا۔ کیونکہ ابھی تک تمھارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔

مؤمن و مسلمان

اگر ایک شخص مسجد میں آئے اور کہے کہ میں اب تک دوسرے مذہب کا پیرو تھا، اب میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں تو آپ اس کو کس طرح اسلام میں داخل کریں گے۔ یعنی اس سے کہیں گے پڑھو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" وہ کلمہ پڑھے گا۔ پھر آپ اس کو ارکانِ اسلام نماز، روزہ وغیرہ کی زبانی تعلیم دیں گے۔ وہ قبول کرے گا۔ بس اب وہ مسلمان ہے۔ اگر ایک گھنٹہ کے بعد مر جائے تو مسلمان اُس کے جنازے کی نماز پڑھیں گے اور اسلامی طریقہ پر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیں گے۔ وہ مسلمانوں کا وارث اور

Marfat.com

مسلمان اُس کے وارث بن جاتے ہیں۔ اگر وہ زندہ رہے گا تو مسلمانوں میں اُس کو رشتہ دیا جائے گا۔ لیکن اگر اُس کے رشتہ دار مسلمان نہ ہوں تو اُن کو اس کا وارث نہ سمجھا جائے گا۔ اگرچہ آپ کو اُس کے دل کی خبر نہیں ہے کہ اُس کے دل کی کیا حالت ہے؟ وہ کس نیت سے مسلمان ہوا ہے۔ اور اس تحقیق کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ ایمان دل سے تعلق رکھتا ہے، اور دلِ مومن خدا کا عرش ہے۔ اس کو صرف خدا ہی جان سکتا ہے۔ ہم حکمِ شریعت کے مطابق، جو ظاہر سے تعلق رکھتی ہے، صرف اس کے کلمہ پڑھنے کا اعتبار کریں گے۔ اور جبکہ وہ ہماری طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا اُس پر کفر کا اطلاق نہیں کریں گے یہاں تک تھا اسلام۔ اب اگر وہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی اختیار کرے گا تو صحیح مومن اور کامل مسلمان ہو جائے گا۔ اور یہی معنی اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً کے ہیں۔ مومن کا ہر کام اسلامی شریعت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ صرف وہی عمل اختیار کرتا ہے جو اس کا ایمان جائز سمجھتا ہے۔ اور ایمان ہرگز اُس عمل کو جائز نہیں سمجھتا جو انبیاء علیہم السلام کے سنن و احکام کے خلاف ہو۔ اب رہا ایمان کی حالت میں گناہ اور خطا کا مرتکب ہونا خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ایک مسلمان کو صرف اُس وقت دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے جب وہ گناہ کی حرمت کا انکار کر دے۔ اور ایک گناہگار مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہے کہ مسلمان گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتا ہے اور کافر گناہ کو ثواب یا گناہ نہ سمجھ کر کرتا ہے۔ مثلاً جب ایک کافر شراب پیتا ہے تو جانتا ہے کہ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ وہ آزادانہ استعمال کرتا ہے اور اپنے اس عمل پر پشیمان نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف جب ایک مسلمان شراب پیتا ہے تو اعتقاداً جانتا ہے کہ حرام ہے، اور اپنے اس عمل پر شرمندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں ہر وہ چیز جس میں نشہ ہو حرام ہے۔ گنہگار مسلمان کا گناہ کو گناہ اور حرام کو حرام سمجھنا اس کے اسلام کی دلیل اور اس پر

Marfat.com

پشیمان ہونا ایمان کی نشانی۔ اب اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ کو معاف فرما دے گا۔ ورنہ قیامت میں اپنے گناہ کی موافق سزا پا کر بخش دیا جائے گا۔ لیکن بندوں کے حقوق کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ بندوں کے گناہ بندوں ہی سے معاف کرانے چاہئیں۔

محب و محبوب میں نسبتِ محبت یہ وہ نسبت ہے جو مسلمان بندے کو اپنے مولیٰ کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ اس کا بہتر طریقہ قرآن کریم میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ آپ کہہ دیجئے، اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اگر تم کو صرف اللہ سے محبت ہے تو یہ کافی نہیں ہے۔ اللہ کے ساتھ محبت صحیح معنوں میں اُس وقت محبت ہو گی جب اللہ بھی تم سے محبت کرے۔ اور اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو رسول کی اتباع کرتے ہیں۔ ہمارے حضرت صاحب قبلہ موہڑہ شریف قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ مرید کا یقین پیر کی نسبت کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ مرید کو تو اپنے پیر کا یقین ہوتا ہی ہے۔ پیر کو مرید کا یقین ہونا چاہئیے، تب کام بنتا ہے۔ اگر پیر کو یقین آجائے کہ یہ مرید مستعد ہے کہ اس کو کمال پر پہنچایا جائے تو اُسے کمال پر پہنچانے میں کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ لیکن اگر مرید کو یقین ہو کہ میرا پیر کامل ہے۔ اگر وہ چاہے تو ذرا دیر میں مجھے ولایت تک پہنچا سکتا ہے تو اس یقین سے اُس کا کوئی کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ جب تک پیر کو مرید کی اہلیت کا یقین نہ ہوگا وہ کمال کی طرف اُس پر توجہ نہیں کرے گا۔ اسی طرح تمھاری محبت خدا کے ساتھ ہے۔ جب خدا بھی تم سے محبت کرے تو تمھاری محبت کارآمد ہوگی، ورنہ نہیں۔ یقیناً اس محبت میں ہر شخص یکساں مرتبہ پر نہیں ہوتا۔ کوئی

Marfat.com

افضل ہوتا ہے کوئی اُس سے ارفع و اعلیٰ کسی کو محبت کا شعور و عرفان ہوتا ہے، کسی کو نہیں۔ کسی کو محبت کا ایقان و ادراک ہوتا ہے کسی کو نہیں۔ اور یہی فرقِ بین المراتب ہے۔

نسبتِ زہد ایک نسبت "نسبتِ زُہد" ہے۔ زہد کے معنی ہیں جائز، حلال اور پاک چیزوں میں بھی ضرورت سے کم اختیار کرنا۔ اس لیے زاہد خوراک، لباس اور آرام میں حتی الامکان کمی کرتا ہے، اور جس حد تک روک سکتا ہے روکتا ہے۔ کلام میں زہد اختیار کرتا ہے، یعنی بلاضرورت نہیں بولتا۔ اور کلام کو فضولیات سے پاک رکھتے ہوئے حکمت آمیز گفتگو کرتا ہے۔ کلام میں زہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے باطن میں حکمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ زُہاد خوراک میں یہاں تک زہد اختیار کرتے ہیں کہ بقدرِ سدِّ رمق پر گزارا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیب سے اُن کو غذا پہنچتی ہے اور وہ مادّی خوراک کے بغیر بھی تندرست اور توانا رہتے ہیں۔ لباس میں یہاں تک زہد اختیار کرتے ہیں کہ کم سے کم اور معمولی سے معمولی لباس پر گزر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے لباس کو طویل زندگی عطا کی جاتی ہے۔ اُن کا لباس کئی پُشت تک کام آنے کے بعد بھی بطور تبرک باقی رہتا ہے۔ سکونت میں اس درجہ زہد اختیار کرتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا حجرہ اُن کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے باطن میں وہ وسعت حاصل ہوتی ہے کہ جس میں عرش و فرش و ما فیہا سما جاتے ہیں۔ غرض جو لوگ ایسے ہوتے ہیں ان کو نسبت زہد حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ باطن بھی ظاہر سے موافقت کرے۔

غیر اسلامی زُہد کبھی مجازاً یا مزاحاً کسی امیر یا بادشاہ کو بھی زاہد کہہ دیتے ہیں۔ ایک رات ہارون رشید بے اطمینانی کی حالت میں ایک بزرگ صوفی کی خدمت میں پہنچا اور کہا "السلام علیکم"! انھوں نے جواب دیا "وعلیکم السلام ایّھا الزّاہد"! یہ سنتے ہی خلیفہ ہارون الرشید جو اپنے اگلوں پچھلوں میں سب سے زیادہ وسیع

Marfat.com

دولت و سلطنت کا مالک تھا، حیرت میں ڈوب گیا۔ عرض کی "حضرت زاہد تو آپ ہیں، میں کیونکر زاہد ہو سکتا ہوں؟ اس صوفی عارف نے فرمایا "ہاں، تمھارا زہد ہمارے زہد سے زیادہ بڑا ہے۔" ہارون رشید نے کہا "حضرت، آپ نے دنیا میں سے ایک لوٹا ایک جانماز اور اس چھوٹی سی جھونپڑی پر قناعت کی ہے۔ اور میں دنیا کی بڑی دولت اور وسیع سلطنت کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پھر میرا زہد کیونکر ثابت ہو سکتا ہے؟" انھوں نے کہا "نہیں، تم تو بہت بڑے زاہد ہو۔ تم نے آخرت کی بڑی بڑی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی اقل قلیل دولت و سلطنت کو اختیار کیا ہے، یہ کوئی معمولی زہد نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی ہارون رشید چیخ مار کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے، لیکن شریعت میں زہد کے یہ معنی نہیں۔ اسلامی زہد وہ ہے جس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے۔

زہدِ رسولؐ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر زہد اختیار فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ مسلمان کو ایسا زہد اختیار کرنا چاہیے، جس میں محتاجی، طعنہ زنی اور حقوق ناشناسی کو دخل نہ ہو۔ آپؐ کو رہنے کے لیے ایک معمولی کچّا سا مکان تھا۔ بیویوں کے واسطے ایک ایک کمرہ تھا، جن کو بقدر خوراک سالانہ گیہوں، جَو اور کھجور وغیرہ آپؐ مرحمت فرماتے تھے۔ خود اپنے لیے کچھ نہ رکھتے تھے۔ آپؐ کے پاس چمڑے کا ایک بستر تھا، ایک یا دو جوڑے کپڑے، ایک سواری، ایک زرہ، ایک تلوار (بعض اوقات زرہ اور تلوار گرو رکھ دی جاتی تھی۔) ایک پیالہ تھا اور ایک بکری۔ یہ اُس بادشاہِ دوجہاں کا کل اثاثہ تھا جو دوسروں کو دامن دامن سونا تقسیم فرماتے، فقیروں کو بادشاہ اور مسکینوں کو اہلِ نصاب بنا دیتے تھے۔ صبح خزانے سامنے آتے اور شام تک تقسیم کر دیے جاتے۔ یہ وہ حقیقی اور اسلامی زہد ہے، جس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اس میں رہبانیت یا ترکِ دنیا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

Marfat.com

یہ قوم پر ایثار و احسان کی تعریف میں آتا ہے۔ یعنی خود کم لینا، اور قوم کو زیادہ دینا۔ لیکن ایسا زہد اختیار کرنا جس سے دوسری اقوام یا اپنی قوم کے بعض افراد مسکین و محتاج سمجھ کر نفرت کریں، یا اغراطعنہ دیں، یا رشتہ داروں کے حقوق سلب ہو جائیں، ہرگز جائز نہیں ہے۔ اسلام نے دوسروں کا دست نگر ہونے، یا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو سخت معیوب قرار دیا ہے۔

نسبت عبادت عبادت کے یہی معنی نہیں ہیں کہ کسی گوشے میں بیٹھ جائے۔ صائم النہار (دن بھر روزہ رکھنے والا) اور قائم اللیل (اذکار و نوافل میں رات گزارنے والا) ہو۔ بلکہ ہر وہ کام جو خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے عبادت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو کام کرو اُسے خدا کے لیے مخصوص بنا کر کرو۔ تجارت کرو تو اس لیے کہ خدا کا حکم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ سنت ہے۔ اس کو اسی طرح انجام دو جس طرح خدا نے حکم دیا ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ (مرد تو وہ ہیں جن کو بیع و تجارت خدا کے ذکر سے غافل نہیں کرتی ہیں) اور رسولؐ کی سنت کے مطابق، یعنی جس طرح آپؐ نے تجارت میں امانت کو ملحوظ خاطر رکھا اسی طرح تم بھی کرو۔ بس یہ تجارت تمھاری عبادت ہو جائے گی۔ صبح اُٹھتے ہی نیت کرو کہ "بارِ الٰہا! میں تیری اور تیری مخلوق کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہوں، میں بازار جاتا ہوں، مجھے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی توفیق عطا فرما۔ اور تجارت میں طریقِ سنت پر کاربند رہنے کی ہمت دے"۔ اور اگر نوکری کرتے ہو تو گھر سے نکلتے وقت ہی نیت کرو کہ اے اللہ! جن لوگوں کی خدمت میرے سپرد کی گئی ہے اُن کی بہتر خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرما۔ اور تیرے جس بندے کا کام میرے فرائض میں داخل کیا جائے اُسے اپنی مرضی کے مطابق پورا کرنے کی طاقت اور ہمت دے۔ اس طرح اگر تم نے صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر تجارت یا ملازمت کا کام سرانجام دیا تو

Marfat.com

وہ تمھارے لیے عبادت ہو جائے گی۔ اپنے اوقات کو فضول ضایع کرنے سے پرہیز کرو۔! بیکاری اور سستی کو قریب نہ آنے دو۔ کسی نہ کسی کام میں لگے رہو۔ اگر یہ اندازِ عمل تمھاری عادت بن گیا، تو سمجھ لو کہ تم کو نسبت عبادت حاصل ہو گئی۔ یہ نسبت بھی تم کو ذوق و جذبہ کے ساتھ مرتبۂ ولایت تک پہنچا دے گی۔

نسبتِ تواضع ایک نسبت کسرِ نفسی ہے۔ یہ نسبت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور دوسری نسبتوں کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے سے زیادہ رفعت دینا اور خود کو سب سے کمتر سمجھنا نفس کے اوپر بہت شاق و دشوار ہوتا ہے۔ نفس میں اپنی برتری ظاہر کرنے اور خود کو سب سے افضل و اعلیٰ سمجھنے کی ایک فطری خُو ہوتی ہے۔ یہ نفس ہی ہے جو کچھ نہ ہونے کے باوجود خدائی کے مقام پر پہنچ جانا چاہتا ہے۔ یہ کسی حالت میں اپنی پستی اور شکست کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور اس کی یہی وہ شیطانی صفتِ تکبّر ہے، جو فرشتوں کے مقام سے گرا کر شیطان کے مرتبہ میں ڈھکیل دیتی ہے۔ دوسری نسبتوں کے ذریعہ انسان جو بلند مقام حاصل کرتا ہے وہ صرف اسی ایک صفت کے ذریعہ سے چھن جاتے ہیں۔ شیطان بھی اسی تکبّر کی وجہ سے اپنے بلند مقام کو کھو کر مردودیت کے پست ترین مرتبے میں گرا دیا گیا۔ اگر دوسری نسبتوں کے ساتھ نسبت تواضع بھی حاصل ہو تو انسان بلند سے بلند تر مقامات پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس نسبت کے ذریعہ اللہ تبارکؐ تعالیٰ کی طرف سے وہ انعامات حاصل ہوتے ہیں جو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ غرض نسبتِ تواضع کو "نسبتِ اہلِ بیت" اور "نسبتِ ائمہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ ائمہ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین بہت منکسر المزاج تھے۔

نسبتِ رسولی ایک اور نسبت جو سلسلۂ نقشبندیہ کو خصوصیت سے حاصل ہوتی ہے، وہ

Marfat.com

نسبتِ رسولی ؐ ہے۔ اس نسبت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ ایسے صاحبانِ نسبت ہر کام کو اسی طرح انجام دیتے ہیں جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا، یا حکم فرمایا ہے۔ ویسے تمام نسبتیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منسوب ہوتی ہیں۔ لیکن اس نسبت میں سنت کا اجراء اور اُس کا قیام و دوام جس قدر پایا جاتا ہے اور کسی نسبت میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ بڑی اہم نسبت ہے۔ اگر کسی شخص کو صرف یہی ایک نسبت حاصل ہو اور وہ اُسے قائم رکھے تو بالضرور فنا و بقا اور عرفان تک پہنچ جائے گا، بشرطیکہ اُس کے ساتھ مجاہدہ شامل ہو، کیونکہ ایک حد نسبت تک مجاہدہ لازم ہوتا ہے اگر مجاہدہ سے سالک رُک جائے گا تو نسبت خاموش ہو جائے گی۔ ہاں انتہائی نسبت پر پہنچ کر مجاہدہ کا التزام موقوف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر سالک سرتاپا مجاہدہ بن جاتا ہے۔ اُس کے ہر فعل سے مجاہدہ کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن اس کو مجاہدہ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ مجاہدہ تو وہ ہے جو تکلیف اور کوشش کے ساتھ انجام دیا جائے۔

سلوک میں مجاہدہ اگر کوئی بڑے سے بڑا کام بلا احساسِ تکلیف اور بغیر تکلف کے انجام پائے تو وہ مجاہدہ کی تعریف سے باہر ہوتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کو نمازِ فجر کے لیے اُٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اب وہ اس تکلیف کو برداشت کرنے کیلئے جہاد و کوشش کرے گا۔ پس یہ اُس کا مجاہدہ ہوگا۔ لیکن جب چند روز کے بعد ایسی عادت ہو جائے گی کہ بغیر تکلیف اور کوشش کے صبح کے وقت خود بخود اُٹھ بیٹھے گا۔ اور فرحت محسوس کرے گا تو اب یہ اُس کے لیے مجاہدہ نہ رہ جائے گا۔ ہاں مجاہدہ کو آگے بڑھانے کے لیے وہ تہجد کے وقت اُٹھنا شروع کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے ایک ہی فعل ہمیشہ مجاہدہ نہیں رہتا، بلکہ جب آسان ہو جاتا ہے تو مجاہدہ کا اطلاق بھی اُٹھ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ مجاہد

Marfat.com

رہنے کے یہ معنی ہیں کہ برابر آگے بڑھتا جائے۔ یعنی جب ایک عمل آسان ہو جائے تو اُس کے ساتھ دوسرا اختیار کرے۔ اور جہاں تک راستے کھلتے جائیں برابر آگے بڑھتا رہے۔ جس قدر وہ آگے بڑھے گا راستے کھلتے جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ (جو ہماری طلب میں مجاہدہ اور کوشش کرے گا ہم اُسے اپنے راستے کی ضرور ہدایت کریں گے۔) مجاہدہ اسی وقت تک ہے جب تک سلوک تمام نہ ہو۔ (یعنی جب تک کسی بھی نیک کام کے سرانجام دینے میں تکلّف اور رکاوٹ محسوس ہو۔) لیکن جب سلوک تمام ہو جائے، اور سالک اپنی منزل "مقامِ وصالِ حقیقی" پر پہنچ جائے تو مجاہدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ (کیونکہ اب کوئی کام ایسا نہیں رہ جاتا جس میں سالک کو کوئی تکلیف یا رکاوٹ ہو۔ وہ تمام کام ایسے محیر العقول طریقہ پر انجام دیتا ہے، جس کی عوام میں نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی اُس کے مقام قرب تک پہنچنے کی دلیل ہوتی ہے۔) پس جہاں تک سلوک کا راستہ واضح نظر آتا ہے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ جہاں تم اپنی کمزوری سے رُکو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ یہاں تک کہ جاذبہ الٰہی تمھیں کھینچ کر لے جائے گا۔ اور اُس مقام پر پہنچا دے گا جہاں تمھارا وہم و خیال بھی نہ پہنچا ہو گا۔

مقامِ جمع

یہ نسبتیں سیر الی اللہ کے آخر میں درست ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتا ہے۔ اس مقام پر سالک کو اسماء و صفاتِ الٰہی کی سیر ہے کبھی ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا مظہر تام بن جاتا ہے۔ وہ جدھر دیکھتا ہے اللہ کو پاتا ہے۔ اسی مقام کو "مقامِ جمع" کہتے ہیں جو "فرق" کا ضد ہے۔ سیر فی اللہ کے ضمن میں سالک کو فنائیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد مقامِ بقا یعنی مقامِ ولایت آتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مقامِ جمع یعنی فنا و بقا کے حاصل ہوئے بغیر ولی کی ولایت ثابت نہیں

Marfat.com

ہوتی یہی نیم دائرۂ عروج ہے۔

فرقِ بعد الجمع

یہاں فنا و بقا اور مقامِ جمع ختم ہوتا ہے، وہیں سالک کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے خلعتِ ولایت عطا فرمایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ مقامِ ولایت ہے اور یہ ولیِ کامل ہے، مگر مکمّل نہیں ہے۔ ولیِ کامل نے جتنے مراتب عروج طے کیے تھے اُتنے ہی مراتب نزول طے کرنے کے بعد اُسے مکمّلیت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی مقامِ جمع پر اللہ تعالےٰ اپنی ولایت و دیدار سے سرفراز فرمانے کے بعد پھر اُس کو اسی مقام کی طرف لوٹا دیتا ہے جس مقام سے اُس نے عروج کیا تھا۔ اسی واپسی کو "سیر من اللہ" کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی پہلی حالت پر قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی فراق کی حالت سے وصال تک پہنچا تھا، اب وصال سے فراق کی حالت میں واپس لوٹ آتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو "فرقِ بعد الجمع" کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر وہ منتہی اپنی ابتدائی حالت میں اس درجہ پوشیدہ ہو جاتا ہے کہ عمومی آنکھیں اُس کے مقام کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اور عمومی اذہان اُس کے مراتب کو نہیں پہچان سکتے۔ لیکن چونکہ وہ ہدایتِ بندگان کے لیے واپس لوٹایا جاتا ہے اپنے اسی کارِ ہدایت کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے یعنی وہ جس درجہ کامل ہوتا ہے اُسی قدر اُس کے ہدایت یافتگان زیادہ کامل ہوتے ہیں۔ (یہاں زیادہ سے مراد کثرتِ افراد و اعداد نہیں، بلکہ وفورِ فیضان ہے جو مستعدین کو اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ اکتسابِ نور کرتا ہے۔)

جمعِ باطن اور تفرقۂ ظاہر

ایسے کامل اور مکمّل ولی اللہ کا فرق و فراق و تفرقہ سیرِ عروجی سے پہلے کے فرق و فراق و تفرقہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ سیرِ عروج سے پہلے جو فرق و فراق ہے وہ بغیر جمع و وصال کے ہے۔ اور سیرِ نزول کے مقام پر فرق بعد الجمع (یعنی فرقِ مع الجمع اور فراق مع الوصال) ہوتا ہے — یہی

Marfat.com

وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت ہے۔ اس مقام پر تفرقۂ ظاہر مانع جمعِ باطن اور جمعِ باطن مانعِ تفرقۂ ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں جب یہ ولی اللہ عین تفرقہ میں عباداتِ ظاہر، خدمتِ خلق، رتق و فتق امور میں مشغول ہوتا ہے تو اُس کا باطن عین جمع میں ہے۔ اور جب وہ عین حالتِ جمع میں حضرتِ احدیت کی بارگاہِ قدس میں ہوتا ہے اپنے پیروؤں کی بہبود اور مصالح امورِ خلق سے غافل نہیں رہتا۔ "اَرِحْنِیْ یَا بِلَالُ" اور "کَلِّمِیْنِیْ یَا حُمَیْرَاءُ" انہی دو حالتوں کی ترجمانی ہے۔ یہ مراتب نیم دائرۂ نزول کے ضمن میں مندرج ہوتے ہیں۔ اس وقت سالک جذب و سلوک ختم کر کے سُکر سے مرتبۂ صحو میں آ جاتا ہے۔ اور شریعت کا پابند ہو کر نیابتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفراز ہوتا ہے۔

نسبتِ اویسی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی راہِ سلوک کو محدود و مقید نہیں فرمایا ہے۔ اَلطُّرُقُ اِلَی اللّٰهِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ۔ ہر سالک کے لیے اللہ تعالیٰ نے علیحدہ راستہ بنایا ہے۔ بعض ایسے سالک بھی ہیں جن کو کسی پیر کے ذریعہ مذکورہ نسبتوں میں سے کوئی نسبت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُن کو بلا واسطہ اپنی خاص نسبت عطا فرماتا ہے، جو اُس کی آخر تک رہنمائی کرتی ہے۔ اس نسبت کو "نسبتِ اویسی" کہتے ہیں۔ وہ نہ کسی سے پوچھتے ہیں کہ میں کیا کروں، نہ دریافت کرتے ہیں کہاں جاؤں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رسّی میں بندھے ہوئے خود بخود منازل و مقامات طے کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یقیناً اُن کو باطنی صورت میں کسی ولی یا نبی سے روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔ مگر بظاہر اس کا کوئی ثبوت وجود نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ وہ بھی ان تمام مقامات سے گزر کر ولایت تک پہنچتے ہیں لیکن اصطلاحاتِ سلوک و تصوف کے مطابق اسماء و افعال کا علم ہونا اُن کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اصل کیفیت منزل پر پہنچنے کی ہے نہ کہ منزل کا نام جاننے کی۔ منزل کا نام تو نارسیدہ بھی جانتے ہیں۔ اگر مقام رسیدہ نام نہ جانیں، تو

Marfat.com

اُن کا کیا نقصان ہے۔ ہاں، جب وہ ہدایتِ عوام کے لیے مامور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اُس کو اسماء و افعال کا علم بھی عطا فرمائے گا تاکہ کارِ ہدایت میں دشواریاں لاحق نہ ہوں۔ اگر علم اسماء و اصطلاحات نہ دیا جائے یعنی کسی بندۂ خدا سے صحبتِ ظاہر اور سلسلۂ طریقت قائم نہ کرلے تو اس کو اجازت نہ ہوگی کہ شیخوخت کا کام سرانجام دے، یا کسی کو تربیت دے کر منازلِ سلوک طے کرائے۔ البتہ جس طرح وہ روحانی طریقہ سے ولیِ کامل ہوا ہے روحانی طور پر اپنی حیات میں یا بعد ممات لوگوں کو فیض پہنچا سکتا ہے۔ وہ کسی کو بصورتِ ظاہر اس لیے تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا کہ اُس نے خود ظاہری تعلیم و تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ اُس نے روحانی طریقہ پر مشکوٰۃِ نبوت سے انوار کمالات حاصل کیے ہیں روحانی ہی طریقہ پر دوسروں کو دے سکتا ہے۔ اسی کو "اویسی مشرب" یا نسبتِ اویسی" کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے مرید ہیں۔ بلکہ انھوں نے باطنی طریقہ پر فیض حاصل کیا ہے، جس طرح حضرت اویس قرنیؒ نے حاصل کیا تھا۔

وصول و علوم اگر تم کسی فطری سواری اونٹ، گھوڑا اور کشتی پر یا غیر فطری سواری موٹر، ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرو اور ایک "منازل شناس رہنما" تمھارے ساتھ ہو تو جس مقام پر تم پہنچو گے وہ رہنما اُس کے نام، حالات اور خصوصیات تم کو بتائے گا۔ اور تم ہر چیز سے باخبر ہوکر وہاں سے گزرو گے۔ لیکن اگر کوئی واقف و آگاہ رہنما تمھارے ساتھ نہیں ہے، تو تم اُن مقامات کے نام و حالات سے لاعلم رہو گے۔ لیکن گزرنا جو اصل مقصد ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہی رہے گا۔ دونوں حالتوں میں تم ایک ہی منزل پر پہنچو گے۔ ایک میں لاعلم رہ کر اور دوسرے میں باعلم ہوکر۔ اور ظاہر ہے کہ باعلم بہرحال لاعلم پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے باعلم واپس آکر کارِ ہدایت کو بطریقِ احسن انجام دیتا ہے۔ اور لاعلم کارِ ہدایت کو انجام نہیں دے سکتا۔ اگرچہ خود کامل ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اویسی مشرب بزرگان کا

Marfat.com

سلسلہ آگے نہیں بڑھتا۔ کامل اویسی مشرب بلا اظہار بطریقِ روحانیت جس کو چاہے تربیت دے سکتا ہے لیکن اصطلاحی علوم سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ ایسے اُویسی سالکین ایک روشنی دیکھتے اور اُس میں قدم اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اس روشنی ڈالنے والے کو نہیں دیکھتے جو اُن پر روشنی ڈالتا ہے۔ جیسے کوئی شخص بیٹری کی تیز روشنی تمہارے سامنے ڈالے تم روشنی دیکھو گے مگر جو روشنی ڈال رہا ہے اُس پر تمہاری نظر نہ پڑے گی۔ ایسے لوگوں کو مرید کرنے اور دوسروں کو راستہ بتانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہاں جس کو خدائے تعالیٰ ہدایتِ بندگان کے لیے مقرر فرماتا ہے اُس کو وصول کے ساتھ علوم بھی عطا فرماتا ہے۔ اور وہ دونوں حیثیت سے کامل ہو کر کارِ ہدایت انجام دیتے ہیں۔ ان نکات کا جاننا سمجھنا، اور آنکھ کھول کر راستہ اختیار کرنا تمہارا کام ہے۔ ورنہ سے

اے بسا ابلیس آدم روے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

دور ۲
ساغر ۶

بیعت خرقہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی مَنْ قَالَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔

بیعتِ رسولؐ یہ طریق بیعت جو اہلِ تصوف کا معمول ہے حضور نبی کریم خاتم الانبیا صلوات اللہ علیہم اجمعین کی خاص سنتوں میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے کئی قسم کی بیعت لیتے تھے بیعت کے معنی عہد و پیمان کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کے ترک یا اختیار پر عہد واثق کرنا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی سے عہد و پیمان لیتے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تلقین فرماتے تھے۔ تازہ اسلام لانے والوں سے اسلام پر قائم رہنے اور کسی حالت میں اُس سے نہ پھر جانے کا عہد و پیمان لیتے۔ مسلمانوں سے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور ارکانِ ایمان کو استوار رکھنے کی بیعت لیتے۔ کسی سے عمل صالح کی بیعت لیتے۔ کسی کو شہادت تعلیم فرماتے۔ اور کسی کو مرتبۂ صدیقیت پر پہنچاتے تھے۔ یا جہاد کے وقت ثباتِ قدم کی بیعت فرماتے۔

بیعتِ ترکِ سوال ایک صحابیؓ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر بیعت لی کہ کسی سے سوال نہ کریں گے۔ اور انھوں نے اس بیعت کی اس درجہ حفاظت کی کہ ایک مرتبہ اونٹ پر سوار جا رہے تھے، غلام بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اتفاقاً

Marfat.com

اُن کا چابک ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ غلام سے کہنے کی بجائے، اُنھوں نے اونٹ کو روکا، بٹھایا اور چابک اُٹھا کر پھر سوار ہو گئے۔ غلام نے کہا "حضرت، آپ نے اتنی تکلیف کی، ارشاد فرماتے تو میں اُٹھا کر دے دیتا۔" انھوں نے جواب دیا "میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر پر بیعت کی ہے کہ کسی سے کوئی چیز نہ مانگوں گا۔"

بیعتِ رضوان ایک مرتبہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجاہدین سے اس بات پر بیعت لی کہ جہاد سے اس وقت تک منہ نہ موڑیں گے جب تک فتح یا پھر شہادت حاصل نہ ہو جائے۔

تکرارِ بیعت فتح مکّہ کے موقع پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مخاطب فرمایا کہ سب آ کر بیعت کریں۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ہم تو پہلے ہی بیعت کر چکے ہیں" ارشاد فرمایا "پھر بیعت کرو!" چنانچہ سب نے از سرِ نو بیعت کی۔ اس روایت سے تجدید بیعت کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک ہی مرشد کے ہاتھ پر بار بار بیعت کرنا بھی جائز ہے۔

بیعتِ خواتین حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جس طرح مردوں کو بیعت فرماتے اُسی طرح عورتوں کو بھی بیعت فرماتے تھے۔ بعض خواتین فطرۃً باتونی ہوتی ہیں ضروری مسائل میں غیر ضروری باتیں بھی چھیڑ دیتیں۔ اس لیے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فتح مکّہ کے موقع پر مردوں کے بعد چند خواتین سے بیعت لی۔ اور دوسری خواتین کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ کو فرمایا کہ جا کر ہماری طرف سے بیعت لو۔ اور انھوں نے حسب الحکم آپ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پیر کی موجودگی میں کسی اور کا اُس کی طرف سے بیعت لینا بھی جائز ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ بیعت لینے والا اپنی بیعت میں نہیں، بلکہ اپنے امیر یا مرشد کی بیعت میں داخل

Marfat.com

کرتا ہے۔ اور بیعت کرنے والا اُس کا نہیں، بلکہ اُس کے پیر کا مرید ہوتا ہے۔

اسلام کا زرّیں اصول

نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے امّت مسلمہ کے لیے ایک نہایت اہم اور ایسا اصولِ زندگی مقرر فرمایا ہے جو تمدّنی، معاشی، اخلاقی اور خاندانی فلاح و بہبود کے لیے اٹل اور ضروری ہے۔ اور وہ ہے ہر حالت میں ایک امیر چننا اور اُس کی کماحقہٗ پیروی کرنا۔ انتہا یہ کہ اگر دو آدمی سفر کریں تو حکم ہے کہ ایک ان میں امیر کی حیثیت اختیار کرے اور دوسرا ماموری۔ اگر دو آدمی نماز کے لیے کھڑے ہوں تو ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی۔ خاندانی معاش کے لیے بھی یہی اہم اصول اسلام کا زرّیں اصول قرار پایا کہ ایک مرد اور ایک خاتونِ خانہ، جب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایک خاندان کی بنیاد ڈالیں تو مرد گھر کا امیر یا سردار بنے اور خاتون اس کی نائب۔ خاندان میں مرد کی افضلیت اُس کے اہم کاموں اور خاص ذمّہ داریوں کی وجہ سے اور بیرونی امورات کی خاص اہلیت کی وجہ سے ہے۔ اور خواتین کی نیابت اس کی اندرونی امورات کی صلاحیتوں اور مخصوص ذمّہ داریوں کی وجہ سے ہے۔ حضور نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے ساتھ کیا تو دوسرے دن صبح کے وقت آپؐ اُن کے یہاں تشریف لے گئے، اور تلقین فرمایا کہ اے فاطمہؓ گھر کے اندرونی کام تمھارے ذمّہ ہیں، اور باہر کے کام علیؓ کے ذمّہ (دونوں کو چاہیے کہ اپنی ذمّہ داریوں کو محسوس کریں)

بیعتِ خلافت

جب آفتابِ رسالتؐ نے سحابِ قدس میں پردہ فرمایا تو قوم کو ایک امیر کی ضرورت ہوئی۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوئے۔ سب نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک جلیل القدر صحابیِ رسولؐ ہونے کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک

Marfat.com

پر، بیعتِ خلافت کے باوجود بیعتِ طریقت بھی کی۔ اور یہ سلسلہ نقشبندیہ اُن کے ذریعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنے اپنے زمانے میں بیعتِ خلافت کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں سے بیعتِ طریقت بھی لی۔ لیکن اصحابِ ثلٰثہ کا زمانہ چونکہ سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا اس لیے اُن کی بیعتِ طریقت بیعتِ خلافت کے مقابلے میں اجاگر نہ ہو سکی۔

بیعتِ طریقت حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے بیعتِ خلافت کے مقابلے میں بیعتِ طریقت پر اس درجہ توجہ دی کہ وہ اُن کی بیعتِ خلافت پر غالب آگئی اور آپ نے اپنے بعد آنے والے جانشینوں کو تعلیم دی کہ بیعتِ طریقت کو بیعتِ خلافت (امارت) سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں آج جس قدر سلاسلِ طریقت پائے جاتے ہیں، وہ سب حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے ملتے ہیں۔ اور یہ بھی آپ کے "بابُ العلم" ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے۔ جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔" یہاں علم سے خصوصیت کے ساتھ علمِ طریقت ہی مراد ہے۔ اس کے بعد ائمۂ معصومین اور ان کے بعد دوسرے تمام مرشدین نے بیعتِ امارت کو امراء و سلاطین کے لیے چھوڑ کر (جو اِس وقت متروک ہے) بیعتِ طریقت کا سلسلہ جاری رکھا، جو آج تک چلا آرہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

خرقۂ تصوّف جب یہ سلسلۂ بیعتِ طریقت بھی آمرانِ وقت کے لیے مشکوک اور باعثِ تکدرِ خاطر ہوا تو دفعِ شبہات کے لیے ان بزرگانِ عظام نے بجائے بیعت کے سالکین وقت کو خرقہ (یعنی پیوندی لباس) پہنانا شروع کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ طمعِ دنیا سے دُور اور امورِ سلطنت و سیاست سے الگ تھلگ ہیں۔ یہ

Marfat.com

امن وسلامتی کے علمبردار ہیں اور ان سے کبھی کسی قسم کے خطرے کا امکان نہیں ہے۔ اس سے ایک طرف تو امرائے سلطنت مطمئن ہو گئے کہ یہ گروہ اُن کا حریف یا مدِّمقابل نہیں ہے۔ اور دوسری طرف عوام نے راہِ سلوک و طریقت کی نشان یابی کے لیے ان کو اپنا رہنما بنایا۔ اس طرح یہ گروہ خرقہ پوش، پشمینہ پوش یا صوفی مشہور ہو گیا۔ یہ خرقہ، خرقۂ خلافت نہ تھا، بلکہ ارادت و سلوک کا محض ایک نشان ہوتا تھا۔

خرقۂ خلافت خرقۂ خلافت ایک سندِ کمال ہے جو سالک کے مقام رسیدہ ہونے کے بعد مرشد کی طرف سے اُس کو عنایت کیا جاتا ہے۔ اور یہ سنتِ رسول "صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔ کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ ظاہر کے آخری لمحات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ارشاد فرمایا کہ میرا یہ جُبّہ لے جا کر اویس قرنیؓ کو پہنچا دیں۔ اور امت کے لیے دعا کرنے کو کہیں۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہؐ! حضرت اویس قرنیؓ کو جو محبت حضور کی ہے، ظاہر ہے اور حضور بھی اس درجہ اُن سے محبت فرماتے ہیں کہ اپنا خرقۂ مبارک ان کو عنایت فرماتے ہیں۔ لیکن وہ کبھی آپ کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ یہ اتباعِ شریعت کی وجہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ اور سوا اُن کے اُن کی ضعیفہ ماں کا اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ دن کو اونٹ چراتے اور شام کو اُن کی اجرت سے اپنی ماں کو کھلاتے پلاتے اور اُن کی خدمت کرتے ہیں۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب بطریقِ ظاہر بالکل سچ اور حقیقت پر مبنی تھا۔ مگر ظاہر کے ساتھ باطن کا ہونا لازم ہے۔ اس کی کوئی باطنی وجہ بھی ضرور ہوگی، یہی محب و محبوب اور عاشق و معشوق کے درمیان وہ راز ہے جسے ظاہر نہیں کیا جاتا، اور کراماً کاتبین کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ الیسا تو نہیں تھا کہ حضرت اویس

Marfat.com

قرنی رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ کی باطنی زیارت سے مشرف نہ ہوتے ہوں۔ لیکن ظاہری زیارت کی رُکاوٹ کی یہ وجہ ممکن ہوسکتی ہے کہ اگر ظاہری زیارت ہوتی تو خدا جانے عاشق کس طرح اپنے محبوب و معشوق کے حضور میں حاضر ہوتا اور خدا جانے کیا کیا پوشیدہ راز ظاہر ہو جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ظاہری زیارت سے محروم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب)

چنانچہ مطابق ارشاد رسول ؐ اپنی خلافت کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے وہ خرقہ مبارک حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو پہنچایا۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دیا۔ حضرت اویس ؓ قرنی اس خرقہ مبارک کو لے کر اس قدر روئے کہ ان کی حالت غیر ہوگئی۔ پھر دعا کے بعد خرقہ مبارک پہنا اور بشارت بھی دی کہ اللہ تعالیٰ نے امّت کی بخشش کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس طرح خرقہ دینا یا پہنچانا سنتِ رسول ؐ ہے۔

عطیہ کلاہ

اسی طرح کلاہ کے متعلق بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک کلاہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں پیش کی اور عرض کیا "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ کلاہ اپنے سر مبارک پر رکھیں اور اس کے بعد جس کو چاہیں عنایت فرمادیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلاہ اپنے سر مبارک پر رکھی، اور جو صحابی آپ کی خدمت میں آتے آپ اُن سے دریافت کرتے کہ یہ ایک ٹوپی ہے اگر تم کو دی جائے تو تم اس کو پہن کر کس طرح اس کا حق ادا کرو گے؟ ہر ایک اپنے اپنے خیال کے مطابق جواب دیتا۔ کوئی کہتا میں بہت عبادت کروں گا۔ کوئی کہتا میں بہت خیرات کروں گا۔ کوئی کہتا، میں بڑے حسنات انجام دوں گا۔ کوئی کہتا میں اس کو پہن کر جہاد میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ غرض ہر ایک اپنے جذبۂ باطنی کے مطابق جواب دیتا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت فرمایا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر یہ کلاہ مجھے عنایت کی گئی

Marfat.com

تو میں اس میں خلق خدا کے عیوب کو چھپالوں گا۔ پس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلاہ حضرت علیؓ کو مرحمت فرمائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سنت کو برقرار رکھتے ہوئے حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت کمیل بن زیادؓ اور حضرات امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو کلاہ تفویض فرمائی۔ اور یہاں سے کلاہ عنایت کرنے کی سنت جاری ہوئی۔

خرقہ و کلاہ کی حقیقت

خلافت و امامت کے بعد اُمراء اور سلاطین بنو امیہ نے اس بیعتِ سلوکِ روحانی کو خلافِ سلطنت و حکومت سمجھنا شروع کر دیا۔ اور اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ اگر ان روحانی رہنماؤں کو اکثریت کی طاقت حاصل ہوئی تو یہ سلطنت و حکومت پر قبضہ کرلیں گے۔ اس لیے انھوں نے اس سلوکِ روحانی کے راستے میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنی شروع کی۔ اور ان رُوحانی رہنماؤں پر بڑی سختیاں اور مظالم توڑے اب اُن کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ حکومت سے الگ تھلگ رہنے اور عوام سے روپوش ہونے کے لیے گوشہ نشینی اور خانقاہیت سے کام لیں۔ اس لیے انھوں نے بیعت کو پشمینہ پوشی سے تبدیل کر کے اس روحانی راستے کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اور ظاہری حکومت کے ان تمام اَدوار میں صوفی یا خرقہ پوش کو تارک الدنیا سمجھا جاتا رہا۔ اور امرا و سلاطین اُن کے اس رویّہ سے مطمئن ہو گئے کہ اب یہ اُن کے اقتدار و حکومت کے لیے باعثِ مضرت نہیں ہیں۔ جب یہ دَور ختم ہوا، اور عوام و حکومت کو اس فرقہ کی سلامت روی کا اعتبار و اعتماد حاصل ہو گیا تو ان روحانی رہنماؤں نے از سرِ نو سلوکِ روحانی کی تدوین کی۔ بیعت کو سلوکِ روحانی کے لیے مخصوص کر دیا۔ خرقہ و صوف کو عام مریدوں سے بچا کر خواص کے لیے مقرر فرمایا۔ اور عطیۂ خرقہ و کلاہ کو وہی بلند مقام عطا فرمایا جو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منشا تھا اور اس کے یہ معنی ثابت کر دیے گئے کہ جب کوئی مرشد اپنے کسی کامل مرید کو خرقہ یا کلاہ عنایت

Marfat.com

فرماتا ہے تو اُس کو مرتبۂ کمال اور اخلاقِ حسنہ میں ایسی صلاحیتوں کا حامل تصور کرتا ہے جو اُس کی صحیح جانشینی کے جملہ امورات کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔ قرآن کریم میں "لِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ط ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط" (لباسِ تقویٰ ہی بہتر لباس ہے یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے) تقویٰ کو لباس کہا ہے یعنی یہ ایک اخلاقی اور روحانی لباس ہے۔ اور جب ایک سالک اللہ کے فضل سے یہ روحانی لباس پہن لیتا ہے اور پیر ومرشد اس کو اس لباس کے لیے معتبر خیال کرتا ہے تو اُسے اپنا لباس عطا کرکے اس کے ظاہر کو بھی اس کے باطن کے مماثل بنا دیتا ہے۔ اور اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ مرید اپنے پیر کی روحانیات اور اخلاقیات کا پورا پورا حامل ہے اور اس قابل ہو گیا ہے کہ اُس کی تقلید کرکے اخلاقیات اور روحانیات کو سنوارا جا سکے۔

آدابِ سلوک میں ایک خاص نکتہ

اکثر وبیشتر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک سالک کیلئے ایک ہی مرشد پیرِ بیعت بھی ہوتا ہے اور پیرِ ارشاد بھی، پیرِ صحبت بھی ہوتا ہے اور پیرِ خرقۂ وکمال بھی یعنی ایک ہی پیر سے سب کچھ اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سالک کے لیے پیرِ بیعت اور ہوتا ہے اور پیرِ ارشاد او. پیرِ صحبت اور ہوتا ہے اور پیرِ خرقۂ وخلافت اور۔ ایسی صورت میں جب ایک مرید اپنے پیر کے کمالات حاصل کر لیتا ہے اور پیر کا برتن خالی ہو جاتا ہے (یا اپنے بعض کمالات کیلئے وہ اُس کو اہل نہیں پاتا) تو وہ خود اُس مرید کو کسی دوسرے بندۂ خدا کے حوالہ کرتا ہے جہاں اُس کو اہلیت و صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اُس کے مقامات کھُل جاتے ہیں۔ اگرچہ طریقت میں اس چیز کی اجازت ہے کہ اگر کوئی مرشد اپنے مرید کو مزید کچھ دینے سے عاری ہو تو وہ کسی دوسرے اہل اللہ کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ایک خطرناک کام ہے۔ کیونکہ اگر اس میں مرید کچھ

Marfat.com

پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لیے پیر سے اُس کو کچھ نہیں مل رہا ہے۔ اور وہ یہ خیال کرکے کہ میرا پیر میرے لیے خالی ہو گیا ہے اُس سے انکار کرے گا۔ اور دوسرے پیر کے پاس جائے گا تو اِدھر سے راندۂ درگاہ اور اُدھر سے درماندۂ راہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اُس نے اپنے نفس و خواہش کی پیروی میں اپنے شیخ سے انکار کیا ہے اور جس طرح ایک نبی کے انکار سے کل انبیاء کا انکار ثابت ہوتا ہے، اسی طرح ایک ولی کے انکار سے کل اولیا کا انکار واقع ہوگا۔ اور اُس کا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ پس ہر حالت میں طریقت کی اس اجازت کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کہ اُسے دوسرے پیر کے پاس جانے یا بیعت کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ اپنی جگہ صبر سے کام لینا اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور جب تک خود پیر حکماً کسی کے پاس نہ بھیجے، نہ جانا چاہیے۔ یہ بہت نازک مقام ہے۔ یہاں کی ذرا سی غلطی دین اور دنیا دونوں جہان کی بربادی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

ایقانِ بیعت کی مثال

(پیرانِ پیر دستگیرؒ کے زمانے میں ایک شخص کسی محنتی کو باکمال ولی اللہ سمجھ کر اس کا مرید ہو گیا۔ اور ایک زمانہ تک اُس کی خدمت کرتا رہا۔ اُس کا دستور تھا کہ جب راستے میں حضرت پیرانِ پیرؓ کو آتے ہوئے دیکھتا تو کسی گوشے میں منہ چھپا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور جب وہ گزر جاتے تو اپنا راستہ لیتا۔ عرصہ کے بعد ایک دن حضرت پیرانِ پیرؓ نے ایک گلی میں جا کر اُس کو پکڑ لیا، جہاں وہ منہ چھپائے آپ کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا، اور پوچھا۔ "بھئی، آخر کیا بات ہے، تم کیوں مجھ سے گریز کرتے ہو؟ مجھ میں کون سی بُرائی تم نے دیکھی جو میرے سامنے نہیں آتے اور ہمیشہ منہ چھپا کر کھڑے ہو جاتے ہو؟" اُس نے نگاہیں نیچی کیے ادب کے ساتھ عرض کیا۔ "یا حضرت، میں ایک کچھنیا کا مرید ہوں اور آپ بغداد کے ایک مشہور و معروف بزرگ ولی اللہ ہیں۔ میں اس لیے آپ کے سامنے آنے سے ڈرتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کو دیکھوں اور آپ کی شانِ ولایت سے مرعوب ہو کر

Marfat.com

اپنے پیر سے بدظن ہو جاؤں۔" حضرت پیرانِ پیرؓ کو اُس کا یہ جواب اور ادب و الیقان بیعت بیعت پسند آیا۔ توجہ باطنی سے اُس کے پیر پر نظر ڈالی۔ دیکھا اُس کا پیر بالکل کورا اور مطلق خالی ہے۔ آپ کو اُس مرید پر رحم آیا۔ فرمایا "جاؤ، تم کو تمھارے پیر ہی سے سب کچھ ملے گا۔" حضرت پیران پیر دستگیر رضی اللہ عنہ نے اپنے خاص وقت میں کچھ ایسی توجہ فرمائی کہ رات کی رات وہ مخنث ولی کامل ہو گیا۔ اُس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ دولت اُسے کہاں سے اور کیسے ملی۔ صبح جب وہ شخص اپنے پیر کی خدمت میں پہنچا تو اُس پیر نے مرید کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا "بھائی تیری وجہ سے مجھ کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے۔ اس دولت کا تو حقدار ہے۔ لے اپنی امانت سنبھال"۔ یہ کہہ کر اُس کو سینے سے لگایا اور سب کچھ دے دیا۔) پس اگر اس درجہ ایقانِ بیعت حاصل ہو تو اُسے اپنے ہی پیر سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض کسی وجہ سے حاصل نہ ہو تو اپنی کمزوریوں اور صلاحیتوں کی کمی کو تلاش کرنا چاہیے، نہ کہ انکاری کیفیت کو دل میں جگہ دینا۔ انکار تو اس وقت بھی جائز نہیں ہے جب پیر اپنے مرید کو کسی دوسرے پیر کے حوالے کر دے اور اُس کو وہاں زیادہ نعمت حاصل ہو۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ زیادہ نعمت بھی اپنے پہلے ہی پیر کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔

ایک عیسائی خاتون کا مشرف بہ اسلام ہونا

جیسے آج ایک عیسائی اور تعلیم یافتہ خاتون نے یہاں آکر اسلام قبول کیا تو اُس کو تعلیم دی گئی کہ تم اس نیت سے مسلمان نہ ہو نا کہ تمھارا خاوند تم سے بدسلوکی کرتا ہے اور تم اُس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو، یا تمھارے اوقات تنگی سے گزرتے ہیں، اور تم مسلمانوں سے امداد لینا چاہتی ہو۔ بلکہ اسلام کو ایک سچا اور برحق مذہب جان کر اختیار کرو۔ دیکھو مذہب اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انکار یا دشمنی نہیں سکھاتا، بلکہ عیسائیت سے زیادہ محبت اور

Marfat.com

احترام کا سبق دیتا ہے۔ احترام اور محبت کی نشانی یہ ہے کہ حکم مانا جائے۔ کیا تم نے عیسائی ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کا حکم مانا؟ اُن کا حکم تو یہ ہے کہ "میرے بعد ایک روح صداقت آنے والا ہے، جس کا نام "احمد" ہے تم اُن پر ایمان لانا اور اُن کی پیروی کرنا" عیسیٰ علیہ السلام کی اس پیشین گوئی اور حکم پر مسلمان پوری طرح عمل کرتے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی یہ اسی طرح محبت کرتے، اور اُن پر ایمان لاتے ہیں، جس طرح اور تمام انبیاء سے محبت کرتے اور ایمان لاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں نے عیسویت کو ترک نہیں کیا ہے بلکہ حقیقتاً عیسائی یہ مسلمان ہی ہیں جو حضرت عیسیٰ کے مقصد نبوت کو ان کی مرضی کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ وہ عیسائی عیسائی نہیں جو زبان سے عیسویت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن کا عمل اس کے برخلاف ہے۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ تم میٹرک کرنے کے بعد ایف۔ اے، اور ایف۔ اے کی تکمیل کر کے بی۔ اے میں داخل ہوتے ہو تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اپنے پرانے ماسٹروں اور پروفیسروں سے تم کو خصومت یا دشمنی ہو جائے۔ اور تم ان کا انکار کرنے لگو۔ بلکہ ان کی تعلیمات کا وقار تم قائم رکھتے ہو، جن کی روشنی نے تم کو آگے ترقی کرنے کے قابل بنایا۔ اور جس قدر تم آگے ترقی کرتے ہو ان کا احترام تمھارے دل میں پہلے سے زیادہ جاگزین ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام عیسویت کی ایک ترقی یافتہ اعلیٰ شکل ہے۔ یعنی پہلے خدا کا بیٹا کہہ کر ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اور اب اُن کو روح اللہ، عبداللہ اور مسیح علیہ السلام کہہ کر اُن کی حقیقی تعریف کے ساتھ احترام کیا جاتا ہے۔" اس بیان و تعلیم کے بعد وہ خاتون مع دو بالغ لڑکیوں اور ایک لڑکے کے مسلمان ہو گئی۔ (پھر تقریباً دو ماہ کے بعد اس کا خاوند بھی جو ملازم پیشہ تھا آ کر مشرف بہ اسلام ہو گیا)

طریقت میں متعدد پیروں کا جواز

ان بیانات اور اشارات کے ذریعہ ہم آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر مرید میں الیقان بیعت

Marfat.com

کامل ہے تو اُسے کسی دوسرے پیر کی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہ صرف اپنے پیر پر اکتفا کرے تو اُس کی تقدیر کا سب کچھ اُسے ایک ہی پیر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیر سے بھی بلند مقامات حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص پیر کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلی پیش کرتا ہے اور وہ اُس تھیلی کو اپنے مرید کو دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اشرفیاں اُسے اپنے پیر ہی سے ملی ہیں۔ لیکن پیر کے پاس اتنی اشرفیاں نہیں ہیں جتنی اس مرید کے پاس ہیں۔ ایسی حالت میں وہ پیر بھی اپنے مرید کی اس ترقی کو تسلیم کرتا ہے۔ جیسے حضرت پیران پیر دستگیر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ "قَدَمِیْ عَلٰی رَقَبَۃِ کُلِّ اَوْلِیَاءِ اللہِ۔ اگرچہ یہ مرتبہ اور اس کی اہلیت اُن کو اپنے پیر ہی کے توسط سے حاصل ہوئی۔ لیکن ان کے پیروں نے بھی اُن کے سامنے سر جھکا کر ان کے مرتبے کی اس بلندی کا اعتراف کیا۔ پس اگر ایقانِ بیعت کے ذریعے پیر کے ساتھ یہ ربط و نسبت قائم رہے تو اُسے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں۔ نہ پیر کی حیات میں اور نہ پیر کے وصال کے بعد۔ لیکن چونکہ کامل مرید ہونا اور اس درجہ ایقان کے ساتھ ربط و نسبت قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے عام مریدوں کو بعض حالتوں میں دوسرے پیر سے تعلیم ارشاد و صحبت سلوک کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً (۱) کسی شخص کا پیر اُس سے کہیں دُور دراز مقام پر ہے جہاں سے کچھ حالات معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اس بات کی اُمید ہے کہ آیندہ اس سے ملاقات ہوگی۔ (۲) یا ربط و نسبت قائم ہونے اور کمال حاصل کرنے سے پہلے پیر کا وصال ہو گیا ہے۔ (۳) یا پیر اُس کے لیے بالکل خالی ہو چکا ہے (یا اُس نے وثوق کے ساتھ یہ یقین کر لیا ہے کہ اب اُسے اس پیر سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔) ان صورتوں میں بغیر کسی انکاری تاثر کے وہ دوسرے پیر کے پاس جا کر تجدید بیعت کر سکتا ہے۔ جیسے حضرت بایزید بسطامی یا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ۔ پھر بھی جہاں تک ممکن ہو اپنی رائے کو دخل نہ دے، اس لیے کہ ہر

Marfat.com

مرید کا نفس جب تک اَمّارگی کی حالت میں ہے اپنے پیر سے ناراض اور شاکی رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح مرشد مرید کے نفس کو مجاہدات، ریاضات، شکستگی اور عاجزی میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے مرید کا نفسِ امارہ اپنے پیر کو اپنا دشمن سمجھتا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر اپنے نفس کا کہنا مان کر پیر سے بھاگے گا تو دونوں جہان میں محروم اور شرمسار رہے گا۔

سلامتی کا راستہ

اس بات کی صحیح تشخیص کرنا تو آسان اور عام لوگوں کا کام نہیں کہ اس کا تجدیدِ بیعت کے خیال سے کسی دوسرے پیر کے پاس جانا شیطانی یا نفسانی وسوسہ سے نہیں بلکہ خالصًا تلاشِ حق کے لیے ہے۔ اکثر لوگ اس مقام پر دھوکا کھاتے اور پشیمانی اُٹھاتے ہیں۔ اس لیے امن و سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ اپنی جگہ قائم رہ کر صبر و انتظار سے کام لے اور اپنی نیت و ارادہ کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ وابستہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو ہر قسم کی رکاوٹیں دُور ہو جائیں گی اور غیب سے اُس کے لیے راستہ کھل جائے گا، کیونکہ اللہ تعالےٰ کسی کی محنت، سلوک اور جہاد کو ضایع نہیں فرماتا۔ وہ اس انتظار کے زمانے کو بھی اُس کے سلوک میں شامل فرما کر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔
وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۷

عبدیّت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِ اللّٰہِ۔

عبدیّت کی تعریف

عبدیت کے معنی بندگی ہیں۔ یعنی اپنی نیّت وارادہ اور قول وفعل میں اپنے بندہ ہونے کا اعتراف، اور عجز وانکساری کے ذریعہ فرمانبرداری بجالائے۔ بندہ یعنی غلام اُس کو کہتے ہیں جو کسی کی ملکیت ہو۔ یہی اِنَّا لِلّٰہِ کے معنی ہیں۔ جب ہم اپنے کو خدا کے لیے سمجھیں گے تو ہماری ہر چیز خدا کی ملکیت ہو جائے گی لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ ہم اپنی کسی چیز کو اپنی نہیں بلکہ خدا کی تصور کریں گے۔ جب عبدیّت کا یہ تصور قائم ہو جائے گا تو ہم کسی چیز کو اپنی ذات کی طرف نسبت نہ دیں گے۔ بلکہ ہر چیز کو خدا کی طرف منسوب کریں گے۔ جب ہم خدا کی ملکیت ہوں گے تو ہماری سماعت ہماری بصارت اور دیگر قویٰ وافعال ہر چیز خدا کی (ملکیّت) ہو جائے گی۔ اور عبدیّت کا یہی وہ مقام ہے جہاں قربِ نوافل حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب بندہ اپنی ہر چیز کو خدا کی ملکیّت میں دے دیتا ہے، اور اپنے پسندیدہ اعمال پر استقامت حاصل کرتا ہے تو خدا بھی اس کی چیز کو اپنی ملکیّت بنالیتا ہے۔ اور یہ حدیث قدسی اس کی گواہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِالنَّوَافِلِ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ

Marfat.com

كُنْتُ سَمْعَهُ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ يَبْطِشُ بِهٖ الخ (میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میری قربت حاصل کرتا ہے اور جب میں اُس سے محبت کرتا ہوں تو اُس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا (کام کرتا) ہے۔ (الحدیث)

قربِ نوافل قربتِ نافلہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جب بندہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے، اپنی دولت کو خدا کی دولت اور اپنی حکومت کو خدا کی حکومت سمجھتا ہے تو اپنی دولت کو خدا کے بندوں، اور اپنی حکومت کو خدا کی رعایا کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اور جب وہ اپنی ہر چیز کو خدا کی چیز بنا دیتا ہے تو خدا بھی اُس کی ہر چیز کو اپنی چیز بنا لیتا ہے۔

اور یہ راستہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور سنت سے ثابت فرما دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی دولت سے مالدار اور مستغنی کر دیا تو آپؐ نے اس دولت کو اللہ کی ملکیت سمجھ کر بندگانِ خدا کے کاموں میں صرف کرنا شروع کیا۔ غلاموں کو آزاد کرایا۔ قرض داروں کا قرضہ ادا کیا۔ مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کو سہارا دیا۔ اور ساری دولت خدا کے نام پر خرچ کر دی۔

دولتِ باقی نوبت یہاں تک پہنچی کہ عرب کی سب سے زیادہ متمول اور دولت مند خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا مسکینیت کی حالت کو پہنچ گئیں کہ اُن کے جسم پر سوائے پیوندی لباس کے ثابت کپڑا، اور گھر میں سوائے بوریا اور چٹائی کے کوئی اچھا بستر بھی باقی نہ رہا تھا۔ اُن کے سنہری زمانے کی سہیلیاں ان کی ملاقات کو آتیں اور اُن کو ابتری افلاس کی اس حالت میں دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، عرض کرتیں "اے خدیجہؓ، تم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نکاح کر کے برباد ہو گئیں۔ کہاں وہ امارت و نعمت کہاں یہ افلاس و نکبت

Marfat.com

حضرت خدیجہؓ جواب دیتیں ۔ "مبارک ہے میرے لیے کہ میں نے فانی دولت کو باقی دولت سے بدل لیا ہے ۔ اور آج میں اتنی بڑی دولت مند ہوں کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی ۔ میری وہ دولت جس نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کیا تھا اس درجہ فانی تھی کہ اگر اس زندگی میں ساتھ دیتی بھی تو مرنے کے بعد تو یقیناً چھوٹ جاتی ۔ اور دوسری زندگی میں میرے ساتھ نہ جا سکتی ۔ لیکن اللہ نے میرے اوپر فضل و کرم فرمایا کہ میں نے اپنی فانی دولت سے وہ باقی دولت خرید لی ہے جو مرنے کے بعد میرے ساتھ جائے گی ۔ اور ہمیشہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی ۔ یعنی جب حضرتِ خدیجہؓ نے دولت و مال اور جاہ و جلال کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدمت خلق میں صرف کر دیا (یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت و نعمت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما دیا) اور سب کچھ ترک کر کے عبادتِ نافلہ کے اُس مقام پر پہنچ گئیں جہاں اللہ تعالیٰ بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو مقامِ قرب عطا فرمایا ، اور ان کے ظاہری اعضا اور باطنی قویٰ کو اپنی طرف منسوب فرما لیا ۔ اُن کے لیے اس مرتبہ سے بلند تر مرتبہ اور کیا ہو سکتا تھا ، کہ وہ خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ نبوت کے وقت اُن کی تشفی بخش ساتھی تھیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے قرب و وصال سے سرشار و سرفراز ہوئیں ۔

عبدیتِ رسولؐ

قبلِ بعثت عرب کا عہدِ جاہلیت مشہور رہے ۔ اُس وقت کے بڑے بڑے محققین ، مفکرین اور مدبرین نے اپنے تمام علوم و اعتقادات کو بت پرستی ، شراب خوری ، زناکاری ، لغو شاعری اور بیہودہ رسم و رواج کے دائرے میں محدود کر دیا تھا ۔ قبائلی امتیاز اور متعصبانہ بغض و عناد آئے دن فتنۂ و فساد کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ۔ اور مجبوروں اور بیکسوں پر ظلم ڈھانا شجاعت و مردانگی سمجھا جاتا تھا ۔ کوئی ابنِ منات تھا تو کوئی عبد عزیٰ ، کوئی پرستار لات تھا تو کوئی بندۂ ثالثۃ الاخریٰ ۔۔۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر آشوب

Marfat.com

زمانے میں زندگی کے ابتدائی چالیس سال بسر فرمائے۔ ابھی کسی نے خدائے قدوس کا توحیدی تصور ان کے سامنے نہ رکھا تھا۔ ابھی جبریل امینؑ نے بھی آکر طریقِ عبادت اُن کو نہ بتایا تھا۔ لیکن اُنھوں نے، جو باطناً "اَنَا کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ" کے اولوالعزم مرتبہ پر فائز تھے خود اپنے باطن سے اپنی رسالت فرمائی، اپنی عبدیت کو سنوارا۔ اظہارِ عبدیت اور ذکر و فکر کے طریقے اختیار کیے۔ خدائے ربُّ العزۃ کی مخصوص عبادت کے اصول مرتب فرمائے۔ غارِ حرا میں اعتکاف کا راستہ تلاش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنؐ کے لیے اپنی معرفت کے راستے کو روشن و منوّر فرمایا۔ آپؐ نے مقامِ خاتمیت پر پہنچ کر دو جہان کی مشکلیں آسان فرمائیں اور رحمۃ للعالمین بن کر تختِ رسالت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور یہ سب کچھ چالیس سال کے عرصہ میں ہو چکا تھا۔ (بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ چالیس سال کے بعد جبریل علیہ السلام نے آکر آپ کو نبوت و رسالت پہنچائی۔ نہیں، بلکہ جبریل علیہ السلام تو بشارتِ نبوت اور اللہ تعالیٰ کا پیغام و سلام لے کر آئے تھے اور آپ کے رسول و نبی ہونے کی خوش خبری پہنچا کر آپ کی تصدیق کی تھی۔ پہلے اعتقاد میں یہ نقص واقع ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کے درمیان ایک تیسرا واسطہ حائل ہو جاتا ہے جو برزخیتِ تامّہ کے منافی ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان برزخِ کبریٰ تو خود آپؐ ہیں۔ آپ کے درمیان جبریلؑ کی کیا مجال ہے کہ برزخ بن کر سامنے آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی جو اللہ ربُّ العزۃ سے جبریل علیہ السلام کو ملتا تھا وہ نورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ اور واسطے سے ملتا تھا۔ نورِ رسالت نہ ہوتا تو جبریلِ امینؑ پیغامِ خداوندی حاصل نہ کر سکتے۔ یہاں پہلے اعتقاد کے حاملین یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں وحی بالواسطہ کی نفی ہوتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی کی گئی سب بلاواسطہ ہی تھی بالواسطہ کچھ نہ تھی۔ اور جبریل علیہ السلام کا وجود مہمل اور لایعنی ہو جاتا ہے۔ تو اس کا یہ جواب ہے

کہ یہ واسطہ خدا اور رسولؐ کے درمیان نہیں تھا، بلکہ نورِ رسالت اور ظہورِ رسالت کے درمیان تھا۔ یعنی جبریل علیہ السلام کا کام یہ تھا کہ نورِ رسالت سے پیغامات اور کلمات کو لے کر ظہورِ رسالت تک پہنچا دیں۔ یہ معرفتِ رسالت کا اہم مقام اور خاص نکتہ ہے جو عارفانِ رسولؐ کے سوا شاذ و نادر ہی لوگ اس سے واقف ہوں گے۔ (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ)

رسولؐ کا طریقِ تفکر

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین، آسمان، چاند، ستارے بلکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ پر نور و ظلمت کے اعتبار سے غور و تفکر فرمایا ہے۔ اور چونکہ ہر چیز آپؐ ہی کے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ اور جو چیز آپؐ کے نور سے قریب ہے منور و تاباں ہے۔ اور جو چیز بہ اعتبار صفات آپؐ کے نورِ مبارک سے جتنی دُور ہوتی گئی ہے۔ تاریکی و ظلمت میں پڑ گئی ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ان چیزوں کو اپنے نورِ رسالت کے آئینہ میں موازنہ فرمایا۔ اور نور و ظلمت کے اعتبار ہی سے ان کی حدود مقرر فرمائیں۔ کعبۂ مکرمہ میں آپؐ نے بتوں کو دیکھا۔ یہ مادی ظلمتوں کے سنگین مجسمے، یہ انسانی صنعتوں کا دبیز غلاف اوڑھے ہوئے شیطانی اصنام مطلق بے نور نظر آئے، کیونکہ ان کی خلقت کا فطری نور بھی انسانی صنعت کے قعرِ ظلمت میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کا انکار لازم تھا۔ قبلِ بعثت ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بتوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور کبھی ان کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ آپؐ نے حقیقتِ کعبہ پر نظر ڈالی اور وہاں "رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ" کی نسبتِ ربوبیت کا مشاہدہ فرمایا۔ اس لیے اُس سے متعلق رہے۔ حضورؐ کعبہ میں تشریف لے جاتے وہاں آیات اللہ پر غور و فکر فرماتے پُرخلوص عباداتِ الٰہی بجالاتے اور الٰہ باطلہ کو نظر انداز کر کے سُبْحَانَ اللّٰهِ حَقًّا وَّ اِلٰهًا وَّاحِدًا کی معرفت حاصل فرماتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفات و آیاتِ الٰہی سے گزر کر مقامِ ذات تک پہنچے تو حقیقت واضح ہوئی کہ ذات قابلِ تفکر و تذکر نہیں ہے۔ یہاں عقل و فہم و ذکر و فکر کو

Marfat.com

کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے ارشاد فرمایا "تَفَكَّرُوا فِي آيَاتِ اللهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي ذَاتِ اللهِ"

رسولؐ کا طریقِ تذکر

حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مخلوقات کی فطرت پر غور فرمایا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے ذکر میں مشغول ہے۔ لیکن اس ذکر تک پہنچنا اور معلوم کرنا کہ وہ کس قسم کا ذکر ہے اور کیا ہے تفکر کے صحیح راستہ کا متقاضی تھا۔ اور وہ راستہ یہ ہے کہ جملہ مخلوقات کے ذکر کو معلوم کرنے کے لیے اکمل ترین مخلوق پر غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ فطرۃً اپنے خالق کا ذکر کس طرح بجا لاتی ہے۔

اور چونکہ وہ اکمل مخلوق انسان اور انسانوں میں اکمل ترین خود آپؐ کی ذاتِ مبارکہ تھی، جب آپؐ نے اپنے قلبِ مطہرہ و منورہ پر غور فرمایا تو فطرۃً اُس کو اسمِ ذات "اللہ" کے ساتھ ذاکر پایا۔ اور خود اپنی فراست اور الہامِ ربّانی کی ہدایت سے معلوم کر لیا کہ ذاتِ معبودِ مطلق تک پہنچنے کا سچّا اور سیدھا راستہ یہی اسمِ ذات "اللہ" ہے۔ ہم "اللہ اللہ" کہہ کر ہی اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ پس آپؐ نے یہی طریقِ ذکر اختیار فرمایا۔ اور غارِ حرا کی تنہائیوں میں اس کے مدارج و مراتب کو طے فرماتے ہوئے ذکر کے مقام سُلْطَانًا نَّصِيرًا پر فائز ہوئے جہاں آپؐ نے مشاہدہ فرمایا کہ کائنات کا ایک ایک ذرّہ اسی ذکر کے ساتھ اپنے خالق و مالک کی تسبیح و تقدیس بجا لا رہا ہے۔ پس حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ذات تک پہنچ کر ذات کا مشاہدہ فرمایا۔ اور اُس کی معرفت حاصل کی تو نظریۂ تثلیث اور کثرتِ معبودانِ باطلہ کو لغو اور مہمل جانا۔ کیونکہ جب باطل ہی میں حق موجود ہو تو حق کا ثبوت باطل کا انعدام اور باطل کی نفی حق کا اثبات بن جاتی ہے۔

پس آپؐ نے کلمۂ توحید "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کی تصدیق و تعلیم فرمائی۔ اور جب دیکھا کہ سوائے اپنے نورِ رسالت کے اللہ تعالےٰ سے پیغام لینے یا اُس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اور وسیلہ نہیں ہے۔ (اگر ہوتا تو کسی استاد یا رہنما یا معلّم کی صورت میں سامنے آتا۔) پس آپؐ نے ارشاد فرمایا

Marfat.com

اَنَا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خدا پر ایمان لانے والوں کو اقرب ترین راستہ دکھادیا۔ "اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔" یہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ تذکیر تھا۔ اور سالکینِ راہِ حق کے لیے یہی وہ ایک کمند ہے جو ان کو اسفل السافلین سے لے کر اعلیٰ علیین تک پہنچاتی ہے۔ یہی وہ ابتدا ہے جس پر عروج کی انتہا ہوتی ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جو حیات و نجات کے راز کو آشکار کرتا ہے۔ وَھُوَ اللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَان۔

عبدیّت کی نسبت انسان کے ساتھ

جملہ مخلوقاتِ عالم میں عبدیّت کا اطلاق صرف انسان و جنات پر کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک عبدیت کا مرتبہ اس درجہ بلند ہے کہ ارواح و ملائکہ تک کو اس مرتبے تک رسائی نہیں۔ کیونکہ بندگی کے لیے مکلّف ہونا شرط ہے۔ اور مکلّف ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ارادہ اور نیّت کے ساتھ اپنے کو کسی کام کے لیے مجبور کرنا۔ یعنی اگر خلقاً اور فطرۃً کسی سے کوئی فعل سرزد ہو تو وہ بندگی نہیں کہا جائے گا۔ مثلاً ایک مشین کپڑا سینے کے لیے بنائی گئی تو اُس کا کپڑا سینا بندگی نہیں، بلکہ خلقت ہے۔ برخلاف ایک درزی کے کہ درزی کا کپڑا سینا بندگی اور فرمانبرداری[1] ہے۔ فعل خلقی اور بندگی میں یہ فرق ہے کہ امر خلقی اپنی فطرت اور خلقت کے خلاف انجام نہیں دیا جا سکتا۔ برخلاف بندگی کے کہ بندے کو جس طرح امتثالِ امر کا اختیار ہوتا ہے اسی طرح اختیال و انفصال کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ اسی قوّتِ اختیار پر بندگی کا دار و مدار ہے اور یہی وہ طاقتِ انسانی ہے جس نے امانت کے بوجھ کو اُٹھایا ہے۔ پس عبدیت انسان (و جنات) کیلیے مخصوص ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انس و جن کو عبادت و معرفت کے لیے تخلیق فرمایا تو اسے اس کی

---

[1] یہ وہ اہم نکتہ ہے جو ہاتھ کے کام اور مشین کے کام میں فرق و امتیاز کو واضح کرتا ہے کہ دستی کام میں نورِ عبدیّت کا ظہور ہوتا ہے اور مشین کے کام میں نورِ عبدیّت نہیں ہوتا۔

Marfat.com

ضروریات ولوازمات بھی عطا فرمائے جس نے جس درجہ عبدیت کا مظاہرہ کیا اُسے اتنی ہی معرفت حاصل ہوئی۔

رسولؐ کی عبدیتِ تامّہ

جس طرح مخلوقات میں انسان اکمل واشرف ہے اسی طرح انسانوں میں مؤمنین، مؤمنین میں اولیائے کرامؒ اولیا میں انبیائے عظامؑ اور انبیائے عظام صلوٰت اللہ علیہم اجمعین میں حضرت خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکمل واشرف ہیں۔ اور جس قدر آپ اکمل واشرف ہیں اُسی قدر آپؐ سے اکمل ترین عبادات کا ظہور ہوا۔ آدم وانسان تو حیاتِ ظاہر میں آنے کے بعد عبادت سے مکلّف ہوئے، اور بندگی بجالائے۔ لیکن آپ کا نورِ مبارک تخلیق کائنات سے قبل بھی عبد تھا، عبادات سے مکلّف تھا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل و تحمید و تقدیس کرتا رہا تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس نورِ مبارک کی یہی عبادات تھیں جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کائنات کی صورت میں ظاہر فرمایا۔ اور یہ معرفت حاصل کر لینے کے بعد "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" کا پوشیدہ راز روزِ روشن کی طرح ظاہر و آشکار ہو جاتا ہے۔ اس نور نے اپنے عالمِ خاص یعنی عالمِ واحدیت یا عالمِ جبروت میں جو عبادات انجام دیں اُس کا نتیجہ عالمِ ملکوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر آپؐ نے اپنے عالمِ ملکوت میں جو عبادات انجام دیں اُن کا نتیجہ عالمِ ناسوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (یعنی زمین، آسمان، جمادات، نباتات اور حیوانات پیدا ہوئے) اور جب اُس نور نے اپنی عبادت سے خلقتِ آدمؑ کو منوّر فرمایا تو وہ مقامِ صفوت پر پہنچے۔ نوحؑ میں جلوہ گر ہوا تو وہ مقامِ نجا کو پہنچے۔ ابراہیمؑ پر تابانی فرمائی تو لباسِ خلت پہنایا۔ اسمٰعیلؑ پر عکس ریزی کی تو بغیر ذبح "ذبیح اللہ" کا خطاب دلایا۔ موسیٰؑ کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں تو کوہِ طور پر لے جا کر ان کو خدا کا جلوہ دکھایا۔ جب

Marfat.com

لنساء العالمین میں حضرت مریم کو اصطفا بخشا تو عیسیٰؑ کو روح اللہ بنا ڈالا۔ اور یہ تمام عبادات ظہورِ رسالت سے قبل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور آپؐ کے اظہارِ عبدیّت سے انجام پائیں۔ (اس راز کا منکشف ہونا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مجسّم نور اور نورٌ علیٰ نور تسلیم نہ کر لیا جائے۔ کیونکہ جب عبدیّت کا اطلاق جسم اور رُوح دونوں کے اتصال پر ہے تو بغیر جسم کے عبدیّت سے مکلّف ہونا بعید از قیاس ہو جائے گا۔ اور ایمان بھٹکتا پھرے گا۔)

عبدیّتِ رسولؐ کا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہونا

اللہ تبارک تعالیٰ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیّت اس درجہ محبوب و مطلوب تھی کہ اُس نے سلسلۂ تخلیق کے ازمنۂ ثلاثہ پر اس کو محیط فرمایا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ماضی میں عبد تھے اسی طرح حال میں عبد رہے۔ اور آپؐ کا مستقبل بھی آپؐ کی عبدیّت سے اُسی طرح منوّر و تاباں ہے اور رہے گا جس طرح آپ کا ماضی و حال رہا۔ اور یہی تقاضائے محبوبیّت و مطلوبیّت تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں آپ کی ذات، بلکہ آپ کی نبوّت و رسالت کی بھی حفاظت فرمائی۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے دعا فرمائی تھی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ الخ (اے پروردگار ان میں اپنا ایسا رسولؐ مبعوث فرما۔) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی اور آپؐ کو پیدا کر دیا۔ کیا، اگر حضرت ابراہیمؑ دعا نہ فرماتے تو اللہ تعالیٰ آپ کو پیدا نہ فرماتا۔؟ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپؐ کے نورِ مبارک کو مشاہدہ فرمایا اور دیکھ لیا کہ آپؐ جس طرح عالمِ باطن میں رسولؐ ہیں اسی طرح عالمِ ظاہر میں جلوہ فرمانے والے ہیں تو تو خیال کیا۔ ممکن ہے دنیا کی کسی دوسری امت یا قوم میں آپؐ

Marfat.com

مبعوث کیے جائیں اور قومِ عرب اس شرفیابی سے محروم رہ جائے۔ اس لیے دعا فرمائی کہ قومِ عرب میں آپ پیدا ہوں ۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیئت کو دیکھا کہ وہ آپؐ کو اس امت میں مبعوث فرمانے والا ہے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ارادے کے ساتھ اپنی دعا اور تمنا کو بھی شامل فرمادیا تاکہ جس طرح اللہ تعالیٰ متمنی ہے اسی طرح آپ بھی اُن کے متمنی ہو کر موافقیتِ الٰہیہ کا مرتبہ حاصل کریں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وادیِ غیر ذی زرع میں مامون و محفوظ رکھا۔ پھر باپ کی چھری کے نیچے سلامتی بخشی ۔ پھر حضرت عبداللہ کو قربان گاہ میں قتل ہونے سے بچایا۔

عرب کی رسمِ جاہلیت اور حضرت عبداللہ

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا دستور تھا کہ اگر مسلسل دس بچے نرینہ پیدا ہوتے اور درمیان میں کوئی لڑکی نہ ہوتی تو اُس دسویں بچے کو خدا کے نام پر قربان کر دیتے۔ اُن کی اس رسم میں اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کو کوئی دخل نہ تھا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے عوض دنبہ قبول فرمایا تو اس سے ثابت ہوگیا، اور سنّتِ الٰہیہ معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ انسانی قربانی کے عوض جانور کی قربانی پسند اور مقبول فرماتا ہے۔ حضرت عبدالمطلب کے اور جتنے بیٹے تھے اُن میں سے کسی کا نام عبدالشمس تھا کسی کا نام عبدالعزیٰ یعنی اکثر نام بتوں کے نام پر تھے۔ لیکن دسویں بچے کا نام انھوں نے عبداللہ رکھا۔ غیرتِ الوہیت کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ اس کے محبوب بندے کی نسبت بتوں کے ساتھ کی جائے۔ اور یہ بھی اس نورِ رسالت کا ایک معجزہ ہی تھا کہ جب حضرت عبداللہ کی پیشانی میں وہ نور جلوہ افروز تھا تو کیونکر ان کا نام بتوں کے نام پر رکھا جاتا۔

حضرت عبداللہ کا بچپن

حضرت عبداللہ خلقۃً اور فطرۃً اپنے بھائیوں میں

سب سے زیادہ حسین تھے۔ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن میں کچھ ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا رہ جاتا۔ ماں باپ اُن پر فدا تھے تو عزیز و اقارب جاں نثار۔ عورت، مرد، بچہ، بوڑھا ہر شخص ان پر جان قربان کرتا، انھیں دیکھ کر دل بہلاتا اور تسکین پاتا تھا۔ اس طرح آپ مکہ کے سب سے زیادہ محبوب اور ہر دلعزیز بچے تھے۔

حضرت عبداللہ کی قربان گاہ

حضرت عبدالمطلب نے آپ کی پیدائش کے وقت ہی آپ کو قربان کرنے کی نیت کر لی تھی۔ وہ عرب کی اس مروّجہ رسم سے کسی طرح رُو گردانی نہ کر سکتے تھے۔ جب وہ دس برس کے ہو گئے تو انھوں نے اس رسم کو ادا کرنے کا تہیہ کیا۔ اُن کے اس ارادہ کو دیکھ کر ہر شخص آبدیدہ ہو گیا۔ کوئی یہ نہ چاہتا تھا کہ آپ قربان کیے جائیں۔ لیکن اس نہ ٹوٹنے والی رسم کے سامنے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس رسم کے خلاف زبان سے ایک کلمہ نکالے۔ دلوں کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ لیکن زبانیں خاموش تھیں۔ یہاں تک کہ آپ نہلا دُھلا، پہنا اڑھا اور سجا بنا کر میدان میں لائے گئے تو ایک جمِ غفیر میدان کو گھیرے ہوئے تھا۔ ہر شخص اس ظالمانہ رسم سے کبیدہ خاطر تھا۔ مگر رواج کی طاقت نے اُن کی زبانوں پر مہر کر دی تھی۔ قدرت اُن کی اس خام خیالی پر مسکرا رہی تھی۔ کون جانتا تھا کہ جس قادرِ مطلق نے ازل سے اب تک اس نور کی محافظت فرمائی تھی وہ آج بھی اُس کا حافظ و ناصر ہے۔ ابھی باپ کی تلوار بیٹے کے سر پر چمکنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک ضعیفہ ہجوم کو چیر کر سامنے آئی۔ گرجدار آواز میں عبدالمطلب کو روکا اور حضرت عبداللہ کو کنارِ شفقت میں لے کر متاسفانہ لہجہ میں پوچھا۔ "کیا تمھاری عقل پر پتھر پڑے ہیں کہ ایسے پیارے اور ہر دلعزیز بچے کو قربان کرنا چاہتے ہو جس کا ثانی تمھاری قوم میں موجود نہیں ہے؟" حضرت عبدالمطلب نے جواب دیا۔ "ہم اپنی خواہش سے ایسا کرنا نہیں چاہتے۔

Marfat.com

بلکہ اللہ تعالٰی کے حکم سے مجبور ہیں۔ وہ ہم سے اس کی قربانی طلب کرتا ہے۔ تو ہم اس قربانی کے لیے مجبور ہیں" ضعیفہ نے کہا۔" افسوس ہے تمہاری عقل پر۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کے عوض جانوروں کی قربانی بھی قبول فرماتا ہے۔ تم کیوں کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کو جانوروں کی قربانی سے خوش کرو۔ اور اس بچّے کو بچا لو۔" ہجوم میں سے بعض آوازیں رسم کی موافقت اور قربانی کی تائید میں بلند ہوئیں، لیکن چونکہ خود اللہ تعالیٰ اُن کو بچانا چاہتا تھا، اس لیے اکثریت کی یہ تمنا تھی کہ کوئی راستہ ایسا نکل آئے کہ حضرت عبداللہ کی جان بچے۔ حضرت عبدالمطلب نے ضعیفہ سے سوال کیا " پھر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیں؟" ضعیفہ نے جواب دیا۔" تم قرعہ اندازی کرو اور عبداللہ کے مقابلے میں اونٹوں کی تعداد مقرر کرتے جاؤ۔ جس تعداد پر قرعہ موافق آجائے سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ان کے عوض اتنے اونٹوں کی قربانی چاہتا ہے۔" اب کیا تھا، قرعہ اندازی شروع ہوئی۔ ایک اونٹ نہ آیا تو دس رکھے گئے۔ دس نہ آئے تو پچاس رکھے۔ آخرکار سو اونٹوں پر قرعہ موافق آیا۔ اور ہر شخص نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا۔ اور سو اونٹ قربان کر کے حضرت عبداللہ کو بچا لیا گیا۔

حضرت عبداللہ کا شباب

آپ بچپن ہی میں کیا کم حسین اور جاذب تھے، جوانی میں قدم رکھا تو اور چار چاند لگ گئے۔ اکثر معزز اور شریف خاندانوں کی پاک دامن لڑکیاں رشتۂ ازدواج کی تمنا کرتیں۔ ایک کاہنہ عورت نے آپ کو اپنانے میں پوری طاقت صرف کی، لیکن یہاں بھی اللہ تعالٰی نے اُن کو معصوم رکھا۔ آخر خاندانِ قریش ہی کی ایک بختاور بی بی حضرت آمنہؓ کی تقدیر جاگی۔ اور یہ دو جہان کی دولت جو دجہ کن فکاں تھی ان کے ہاتھ آئی۔ جن سے سردار دو جہاں اور مختارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم پیدا ہوئے۔ دُنیا میں اُس حقیقی عبدیّت اور بندگی کاملہ کا ظہور ہوا جس کے لیے انسانیت تشنہ اور

Marfat.com

بے قرار تھی۔

آپؐ کے عہدِ طفلی کی معصوم عبدیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کا سایہ تو دیکھا ہی نہ تھا۔ شیر خوارگی کا زمانہ قبیلہ بنی سعد میں گزرا۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اس بچے کے انداز اور طور طریقے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ طہارت اور پاکیزگی کا یہ عالم کہ کبھی آپؐ کا بستر ناپاک نہ ہوا۔ ایثار اس درجہ کہ صرف ایک طرف کا دودھ آپؐ نوش فرماتے اور دوسری طرف کو اپنے رضاعی بھائی کے لیے چھوڑ دیتے۔ صبر و قناعت یہ کہ کبھی آپؐ نے شیر خوار بچوں کی طرح گریہ وزاری یا طلب و خواہش سے کسی کو پریشان نہ کیا۔ تسلیم و رضا یہ کہ سوائے ہر بات کو مان لینے کے کبھی انکار سے کام نہ لیا۔ محبت و اخوت یہ کہ ہمیشہ اپنے رضاعی بھائیوں اور ساتھیوں کے ساتھ دلداری اور موانست کا برتاؤ کیا۔ غرض یہ اور اس طرح کی بہت سی عبادات تھیں جو ایام شیر خوارگی ہی میں، جو لاشعوری کا زمانہ ہوتا ہے آپ نے انجام دیں۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو ماں کی گود میں آئے مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ آغوش مادری کی لذت اور سکون بھی باقی نہ رہا اور آپ دُرِّ یتیم ہو کر رہ گئے۔ اس وقت بھی آپؐ نے صبر و تسلیم کے ذریعہ عبدیت کا اظہار فرمایا۔

عہدِ شباب اور پرہیزگاری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، اور جس بے نور فضا میں ہوش سنبھالا تھا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسی رنگ میں خود حضورؐ بھی رنگ جاتے، اور اپنی قوم میں جو رسم و رواج دیکھتے وہی اختیار کرتے۔ لیکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کامل بندہ بنا کر اپنی بندگی کے لیے چن لیا تھا۔ اُس نے جس طرح عوالم باطنی میں اُنؐ کی محافظت فرمائی تھی اسی طرح عالمِ ظاہر میں اُنؐ کے ظاہر و باطن کی نگہداشت کی۔ ایام

Marfat.com

عنفوانِ شباب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لہو ولعب کے مشاغل اور ہم عمروں کے ساتھ تضیعِ اوقات کی طرف قطعاً توجہ نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ایسی ہی کسی دلچسپی کے لیے شب گزاری کی دعوت دی اور اس درجہ اصرار کیا کہ آپؐ اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ لیکن خلافِ معمول حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح راستے میں قدم مبارک اُٹھا رہے تھے۔ جیسے آپؐ نیند میں چل رہے ہوں۔ اور خواب کا اس قدر غلبہ ہوا کہ آپؐ ایک گلی کے کنارے لیٹ کر سو گئے، اور صبح تک سوتے رہے۔ اس کے بعد کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا۔ پچیس برس کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قابلِ تقلید مثالی تجرد میں گزاری۔ قوم کا بچہ بچہ آپؐ کی عصمت، امانت، دیانت، عفت اور راست بازی کا گواہ تھا۔ مخالفین اور منکرین تک اس بات کے مقر تھے کہ قبلِ نبوت کا سارا زمانہ اس درجہ روشن، منور اور تاباں تھا کہ آپؐ کے دامن کردار دھبہ تو درکنار شائبۂ خیال بھی وارد نہ ہو سکا تھا۔ درانحالیکہ آپ کی طاقت ستر صدیقوں کی رجولیت کے مقابلہ میں بھی افضل و اعلیٰ تھی۔

ایک اعتراض کا جواب

(غالباً حضرت عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک ہندو آپ کے پاس آیا، اور اعتراض کیا کہ ہمارے کنہیا جی ستر گوپیوں کے ساتھ ستر روپ میں بیک وقت شب باش ہوتے تھے اور تمہارے رسولؐ نے ایک ایک بیوی کے لیے ایک ایک شب مقرر کی تھی اب بتاؤ کہ کنہیا جی اُنؐ سے افضل ہوئے یا نہیں؟ اس کے اس گستاخانہ سوال پر ان کو طیش آ گیا۔ اس وقت وہ ایک پیپل یا ایسے ہی کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا۔ "کمبخت، یہ تو ہمارے رسولؐ کے انضباطِ نفس کا ایک معجزہ تھا کہ اپنی بے پناہ طاقتوں پر غالب رہے۔ ستر گوپیوں کے ساتھ بیک وقت شب باش ہونا انسانیت نہیں بلکہ حیوانیت ہے۔ بہت سے جانور ایسے ہیں جو

Marfat.com

اس سے بھی بلند معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ انسانیت تو یہ ہے کہ مقررہ اصول سے انحراف نہ کیا جائے۔ اور جو، تو یہ کہتا ہے کہ کنہیا جی ستر روپ دھار لیتے تھے، تو کسی اوتار کے لیے یہ کوئی دلیلِ کمال نہیں ہے، جبکہ آج رسول ؐ کے غلامانِ غلام بیک وقت اَن گنت روپ دھار سکتے ہیں۔ دیکھنا چاہتا ہے ــ؟ یہ کہتے ہی اُن پر ایک جذبۂ الٰہی طاری ہوا۔ فرمایا "اوپر دیکھ"! اُس نے نظر اُٹھائی، دیکھا کہ درخت کے ہر پتے پر حضرت عبد الرزاق بالنسوئی اسی طرح تشریف فرما ہیں جیسے اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ ہندو مسلمان ہو گیا۔ مخالفین اسلام کا یہ اعتراض سوائے تعصب اور نادانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ ان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ طاقت سے مغلوب ہو کر طاقت کو خرچ یا ضایع کر دینا کمال نہیں ہے، بلکہ طاقت پر غالب آ کر اس کو اپنے قابو میں رکھنا کمال ہے۔ اپنی امت کو یہ سبق دینے کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھا دیا ــ ورنہ) حجۃ الوداع کے موقع پر جب کہ آپؐ کی عمر شریف ۶۲ برس کی تھی احرام باندھنے سے قبل دس مرتبہ غسل فرمایا۔ اس وقت آپؐ کی دس ازواج مطہرات تھیں۔ ایسی حالت میں امت کے لیے آپ کا ایک ضابطۂ قانون اور اصولِ معاش عملاً مرتب فرما دینا کیا معجزۂ رسالت نہیں ہے۔

رسولؐ کا مقامِ عبدیت

اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہر نبی کو نبوت پر فائز ہونے کے بعد ایک لقب عطا کیا گیا ہے۔ آدم صفی اللہؑ، نوح نجی اللہؑ، ابراہیم خلیل اللہؑ، موسیٰ کلیم اللہؑ، عیسیٰ رُوح اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔ لیکن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بہت سے القابوں کے ساتھ ایک خاص لقب "عبد اللہ" بھی عطا کیا گیا جو آپ کی نبوت و رسالت و ولایت کے ساتھ ربطِ الٰہیت و عبدیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ مقامِ عبدیت ہے جہاں پہنچ کر بندہ اپنی ادنیٰ و اعلیٰ ہر چیز کو

Marfat.com

اپنے معبود پر نثار و قربان کر دیتا ہے اور اپنے لیے کوئی ایک چیز بھی باقی نہیں رکھتا ـــــ وہ "اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" کہہ کر اپنی تمام ملکیت و اختیارات سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ جب بندہ اس عبدیت پر مستقیم ہوتا ہے تو جس طرح اُس نے دربارِ الٰہی میں اپنی بندگی پیش کی، اللہ تعالیٰ اپنی شانِ شکوریت سے بندے کو اپنی وہ خاص صفات عطا فرماتا ہے جو صرف ذاتِ الوہیت کے لیے مخصوص ہے۔ اس طرح بندے کے تمام قویٰ و افعال خدا کے ہو جاتے ہیں اور خدائی قدرتیں بندے کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور امتیازِ این و آں باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس عطائے الوہیت اور انعام و اکرام معبودیت کے باوجود آپ کی عبدیت تو اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ یہی وہ نقطۂ عبدیت ہے جس پر جمال و کمالِ الٰہی وارد ہوتا ہے۔

نزول بعد العروج

انبیاء علیہم السلام کے عروجی مراتب اُن کے نزول سے اور اُن کا نزول خلق اللہ کی فیض رسانی سے متیقن ہوتا ہے۔ یعنی جو خلق اللہ کے لیے سب درجہ فیض رساں ہے اسی درجہ کا نزول اُس کو حاصل ہے اور جس درجہ کا نزول اُس کو حاصل ہے اسی درجۂ عروج پر وہ فائز ہو چکا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ فیض رسانی خلق اللہ پر ہمارے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے اس لیے آپؐ سب سے زیادہ نزولی مرتبہ پر عوام سے قریب ہوئے ہیں۔ اور چونکہ آپؐ کو سب سے زیادہ نزولی مرتبہ حاصل ہوا ہے، اس لیے لازماً آپؐ سب سے زیادہ مرتبۂ عروج پر فائز ہوئے ہیں۔ یہی ولایتِ محمدی کا مقام ہے۔ اور مرتبۂ عروج کی یہ بلندی آپؐ کے کمالِ عبدیت کی دلیل ہے اور جس کا کمالِ نزول مرتبۂ خاتمیت پر تمام ہوتا ہے۔

مقامِ عبدیت کی بلندی

عبدیت کا وہ مقام جو اہلِ تصوف کا مطمحِ نظر ہے تمام مقاماتِ خلقی سے زیادہ بلند ہے۔ اس لیے بلند ہے،

Marfat.com

کہ بندہ یہاں عالم امکان میں رہنے کے باوجود ذاتِ معبود کا قرب حاصل کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نقطہ عبدیت دائرۂ معبودیت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کا انتہائی عروجی مقام قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ہے۔ جب ایک قوس دوسرے قوس کے مقابل ہوتی ہے تو دائرہ پورا ہو جاتا ہے۔ یعنی جب نقطۂ عبدیت کے دونوں سرے انتہائے سجود پر پہنچتے ہیں تو قوس معبودیت سے متصل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ)۔ سجدہ کرنے کے معنی خشوع و خضوع کے ساتھ گرتے گرتے (جھکتے جھکتے) اُس مقام پر پہنچ جانا جس کے بعد کوئی اور مقام نہیں ہے۔ جب یہاں عبدیت تمام ہوتی ہے تو معبودیت اُس کو اپنی مقبولیت کے ذریعہ اوپر اُٹھاتی ہے، اور قوس عبدیت کامل ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ قوسِ عبدِ کامل "قرب نوافل یا قرب فرائض کے انجذاب سے مقام قوسِ معبودیت میں عروج کرتا ہے تو قوسِ معبودیت کا طواف کرتے ہوئے پھر نزول اختیار کر کے قوسِ عبدیت کے سرے سے مل جاتا ہے۔ یہی مقام "قاب قوسین" ہے۔ بندہ جب اپنے قوسِ عبدیت میں عروج کرتا ہے تو اس میں صفاتِ بشریت و بندگی موجود ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ قوسِ معبودیت کے طواف سے گزرتا ہے تو بشریت و عبدیت پر صفاتِ خالقیت و معبودیت غالب ہوتی ہیں۔ "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ الخ، لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ الخ، سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ، لَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ سِوَی اللّٰہِ اور اَنَا الْحَق" وغیرہ کلمات اسی مقام کے آثار ہیں۔ اور جب وہ واپس اپنے دائرۂ عبدیت میں داخل ہوتا ہے تو پھر وہی صفاتِ عبدیت غالب ہوتی ہیں، جو قبل عروج تھیں۔ اور وہ عوام سے نزدیک تر زندگی کا حامل ہوتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ کئی ہزار انبیائے کرام کو اسی تعلیم پر مقرر و مامور فرمایا

Marfat.com

کہ پہلے خود اس دائرۂ عروجی و نزولی کو طے کریں اور پھر دوسرے انسانوں کو اسی دائرے کی سیر کرا کے اللہ تعالیٰ کی خلاقیت، معبودیت، قدامت، صمدیت اور احاطت و معیت سے متعارف کریں جو اس کی تخلیق کا عین منشا ہے۔ ہمارے پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی استعدادِ خاتمیت کے ذریعہ جملہ انبیاء علیہم السلام سے ولایت کا بلند و ارفع و اعلیٰ عروج اور سب سے زیادہ نبوت کا خلقی نزول حاصل فرما کر بہ طریقِ اکمل و احسن اس دائرہ کا مشاہدہ فرمایا۔ اور اپنے اس رشد و ہدایت کو جاری فرمانے اور قائم رکھنے کے لیے خلفاء، ائمہ اور اولیاء اللہ کو ہمیشہ کے لیے اس خدمت پر مامور فرما دیا۔ جو آج تک سیر و سلوک کی تعلیم فرما رہے ہیں۔ اور قیامت تک اسی طرح سلسلہ جاری رکھیں گے۔

تمہارا کام اور ذمہ داری

اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنے اصل مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لیے نبوت کے اسی راستے پر آجاؤ اور اس صراطِ مستقیم کی غیر مشتبہ تعلیمات کے ذریعہ سلوک اختیار کر کے مقامِ ولایت حاصل کرو۔ جب تم کمالِ ولایت پر پہنچ گے تو اللہ تعالیٰ تم کو دوسروں کی تعلیمات و ہدایات کے لیے مکمل بنا کر مامور فرمائے گا۔ اس وقت تمہاری بھی یہی ذمہ داری ہوگی کہ جس شخص کو دیکھو کہ یہ کمال کی قابلیت رکھتا ہے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسی راستے کی رہنمائی اور اُس کی رکاوٹوں میں دستگیری کرو۔ لوگوں کو نیکی اور تقویٰ کی طرف دعوت دو۔ امر معروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ بجالاؤ۔ یہ ذمہ داری بھی تمہاری وسعت کے اعتبار سے ہے جیسا کہ فرمایا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ کسی کو اُس کی وُسع سے زیادہ اللہ نے مکلف نہیں کیا۔ جس مرتبہ کا تمہارا کمال ہو ویسے ہی تمہاری وسعت ہو گی۔ اور جتنی وُسعت ہو گی اتنی ہی تمہارے اوپر ذمہ داری عائد کی جائے گی۔

Marfat.com

وُسع کے معنی و تعریف

"وُسع" اس تربیت یافتہ طاقتِ عمل کو کہتے ہیں جس سے کوئی کام بلا احساسِ تکلیف اور بلا جبر و اکراہ انجام دیا جائے۔ اس کی کوئی حدِ معین نہیں ہے۔ تربیت و مشق کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ وُسعت حاصل کی جا سکتی ہے۔ کسی مقام پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بس، یہاں تک انسان کی وسعت ہے، اس سے آگے اس کو کوئی وسعت نہیں۔ خواہ وہ استعجاب میں خرقِ عادات و کرامات سے بھی آگے گزر جائے۔ مثلاً ایک شخص ۲۰ سیر وزن اُٹھا سکتا ہے لیکن ایک من نہیں اُٹھا سکتا تو ہم کہیں گے کہ اس شخص کو صرف ۲۰ سیر کی وسعت ہے۔ اب اگر وہ اپنی اس قوتِ برداشت کو مشق و تربیت کے ذریعہ اصولِ مقررہ کے ماتحت آگے بڑھاتا ہے تو اُس کی وُسع بھی آگے ترقی کرتی ہے۔ اور چند روز میں وہ ایک من اُٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اب ہم کہیں گے کہ اس کی وسعت ایک من کی ہے۔ اسی طرح جہاں تک مشق و تربیت میں وہ کامیاب ہوتا جائے گا اُس کی وسعت بڑھتی جائے گی۔ اور وہ اتنا وزن اُٹھانے کے قابل ہو جائے کہ کوئی دوسرا انسان نہ اُٹھا سکے اور لوگ متعجب ہو جائیں کہ یہ تو خلافِ فطرت ہے۔

وُسع انسان کا لباس ہے

اللہ تبارک و تعالےٰ نے ہماری وسع کے مطابق ہی احکام جاری فرمائے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم جو لباس اپنے جسم پر پہن لیتے ہیں وہ ہمارے لیے قابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں بھاری نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح جو کام خدا نے ہم پر فرض عائد کیا ہے اگر ہم اُسے اختیار کرلیں تو وہ ہماری وُسع میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ہماری وُسع کو اللہ تعالےٰ نے بڑی وُسعت عطا فرمائی ہے۔ پس کسی بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل کام کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انسانی وُسعت سے باہر ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں انسان یا فلاں قوم ابھی اس کام کے قابل نہیں ہوئی ہے۔

Marfat.com

تعب و اجر

ہمارے زمانے میں اکثر بہانہ تراش اور حیلہ جُو افراد جب عبادات، ریاضات اور محنت و مشقت سے جی چُراتے ہیں تو کہتے ہیں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اور اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ جس کام کو ہم آسانی سے نہ کر سکیں اللہ تعالےٰ نے ہم کو اُس کا حکم نہیں دیا ہے۔ یہ معنی، حدیث اَجْرُكَ عَلٰی قَدْرِ تَعَبِكَ۔ (تمھارا اجر تمھاری تکلیف کے اندازے کے مطابق ملتا ہے۔) کے منافی ہیں۔ اس لیے اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالےٰ نے جس درجہ جہد و کوشش کا امر فرمایا ہے انسان کو اُس کی وسعت و استطاعت بھی عطا فرمائی ہے۔ یعنی جتنی زیادہ تکلیف اُٹھائے گا اتنی ہی اُس کی وُسعت میں زیادتی ہوگی۔ اس لیے یہ سمجھ کر کہ ہم اتنی ہی عبادت کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے، کم سے کم عبادت پر مطمئن ہو جانا غلطی ہے۔ پس جو عبادت و بندگی شریعت اور طریقت کی رُو سے تم پر عائد ہوتی ہے وہ تمھاری وُسع کے مطابق ہے اور تم اُس کو آسانی سے انجام دے سکتے ہو۔ اپنی تکلیف کو نہ دیکھو۔ سُستی اور غفلت سے کام نہ لو۔ ہمت و مردانگی سے قدم آگے بڑھاتے چلے جاؤ۔ اللہ تعالےٰ ہر مشکل کو آسان اور بڑی بڑی عبادات کا راستہ تم پر کھولتا جائے گا۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

Marfat.com

دو ۲
ساغر ۸

جاں بازی و سرفروشی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَظِیْمِ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی صَاحِبِ خُلُقِ الْعَظِیْمِ

نظامِ گردشِ مینا و ساغر بدل دو دل ہو جو ساقی کا اشارا (ڈاکٹر فیضی)

قربِ خدا اسلام جب انسان کو خدا کی بندگی کی طرف بلاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز دل سے خارج ہو جائے۔ جب تک خارجی اشیا دل سے دُور نہ ہوں گی اُس وقت تک حضوری کی کیفیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ (یعنی حقیقتِ ذات) تک پہنچنا تو ممکن نہیں۔ لیکن اگر اپنی کامل توجہ کو راہِ باطن (قلب و روح) کی طرف آگے بڑھایا جائے تو اس نارسائی میں بھی ایک کیفیت قربِ خداوندی کی حاصل ہو جاتی ہے ــ اور بے مینا و ساغر سرور دستی حاصل کر سکتے ہیں۔

حصولِ قربِ خدا اپنی ذات کی توجہ میں اپنے علمِ یقین کو اِس مقام پر پہنچا دینا کہ اللہ تعالیٰ میری ذات کی نسبت سے بھی زیادہ قریب ہے قربِ خداوندی حاصل کرنے کا آسان راستہ ہے۔ بندہ جس مرتبہ پر اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب یقین کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس سے زیادہ قریب ہوتا ہے ــ اَنَا اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

Marfat.com

میں حَبْلِ الْوَرِیْد کے معنی رگِ جان کے ہیں اور یہ رگِ جان ہمارے یقین پر متیقن ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ؎

اے برادر تو ہمی اندیشۂ   مابقی تو استخوان و ریشۂ

انسان اپنے کو جو کچھ یقین کرتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو جتنا قریب یقین کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور " اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ " سے بھی اسی معنی کا اظہار ہوتا ہے۔ پس حصُولِ قرب کا آسان طریقہ اپنے یقین کو ترقی دینا ہے۔

نشانِ قربِ خدا

یہ جاننے کے لیے کہ ایک بندہ کس درجہ اپنے خدا سے قریب ہے اُس کے اخلاقی اقدار پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جب دیکھا جائے کہ ایک انسان بُرائیوں اور مخلوق آزاریوں سے اپنے دست و زبان اور قلم و قدم کو روک لینے میں کامیاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے، ایمان کے بعد، مخلوق کو آرام پہنچاتا، اور دلوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ صحیح علامت ہے اس بات کی کہ اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے۔ کیونکہ جب بُرائیوں اور مخلوق آزاریوں کے مواقع سامنے آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ قریب ہونے کی وجہ سے اُن بُرائیوں اور انسان کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ پس بندہ خدا سے نظر ہٹا کر دوسری کسی چیز کو نہیں دیکھتا اور قرب کی لذّت کو چھوڑ کر کسی بُرائی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ جب وہ خدا کا قرب محسوس کر رہا ہے تو اُس سے کسی بھی بُرائی کا سرزد ہونا امرِ محال ہے کیا کوئی اپنے محبوب کے سامنے کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے جو اُسے ناگوار ہو؟ بلکہ اُس کی تمام کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کون سا کام ایسا کرے کہ اُس کا محبوب ایک مرتبہ مسکرا دے۔ یہی حال خدا کے مقرب بندوں کا ہے کہ وہ ہر وقت اُس کی رضا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

خدمتِ خلق بڑی عبادت ہے

خدمتِ خلق اس لیے اعظم عبادتِ الٰہی ہے کہ اپنے بندوں کے آرام اور صحیح فائدے سے اللہ تعالےٰ خوش ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہی عبادت ہے۔ اور اعظم اس لیے ہے کہ ایمان کے ساتھ خدمتِ خلق ہی کے ذریعہ انسان اخلاقِ الٰہی سے متخلق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک انسان بھوک سے بیتاب ہے۔ وہ ظاہراً یا باطناً اپنے رزّاق سے دعا کرتا ہے کہ مجھے کھانا کھلادے۔ اب جو شخص آگے بڑھ کر اُسے کھانا کھلاتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کا کام سرانجام دیتا ہے اور صفتِ رزّاقیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ اسی کا نام صفتِ الٰہی سے متصف ہونا ہے۔ نماز، روزہ اور حج بھی عبادات ہیں۔ لیکن چونکہ وہ خود اپنے لیے ہیں اور ان کے ساتھ اپنی غرض اور فائدہ شامل ہے اس لیے عظیم عبادت نہیں۔ اور خدمتِ خلق میں چونکہ انسان تکلیف اٹھاکر یا خرچ و نقصان برداشت کرکے دوسروں کو آرام و فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس لیے یہ اعظم عبادت ہے۔

خدمت عبادت پر افضل ہے

خدمتِ خلق چونکہ عظیم عبادت ہے اس لیے اس کو عام عبادات، نماز، روزہ اور حج پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کے برخلاف عام عبادات کو خدمتِ خلق کے لیے تاخیر میں ڈالا، یا قربان کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اُس کفش دوز کا قصہ معروف و مشہور ہے جو حج کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن اپنا سرمایہ ایک ضرورت مند بیوہ کو دے کر واپس گھر چلا آیا۔ اور حج کو نہ گیا۔ لیکن اس عظیم عبادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال، صرف یہی نہیں کہ بغیر حج کیے اُسے حج کی سعادت حاصل ہوئی، بلکہ اللہ تعالےٰ اُس کی اس عبادت سے اس درجہ خوش ہوا کہ اُس نے اُس کے وسیلے سے تمام حاجیوں کا حج قبول فرمالیا۔

Marfat.com

بہترین عبادت

اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ امن جب مدینے میں تشریف فرما ہوتے تو رات رات بھر نوافل و تہجد میں اس طرح قیام فرماتے کہ پائے مبارک متورّم ہو جاتے۔ لیکن جہاد میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ انتہائی مصروفیت کی وجہ سے کوئی نماز قضا بھی ہو گئی، جو بعد میں ادا کی گئی۔ اگر اس وقت نماز کی وجہ سے جہاد میں ادنیٰ تاخیر بھی ہوتی تو جہاد کا نقشہ بدل جاتا۔ اس لیے نماز کی یہ تاخیر ہی افضل عبادت تھی۔ اسی طرح جب کبھی آپؐ امامت فرماتے اور پیچھے بچوں کے رونے کی آواز آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرأت مختصر فرماتے۔ اور نماز جلد ختم کر دیتے تھے۔ اور اس کا اظہار بھی فرماتے کہ ان بچوں کے رونے سے مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ ان اشارات سے اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ خدمتِ خلق اور دوسروں کی راحت طلبی بہترین عبادت ہے۔ وہ عبادات جس سے نوعِ بشر کی خدمت چھوٹ جائے عبادت نہیں۔ خدمتِ خلق کے موقع پر پہلے خدمت انجام دی جائے گی جب خدمات سے فراغت ہو گی تو دوسری عبادتیں بجا لائی جائیں گی۔ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ (پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو اور اپنے رب کی طرف دل لگاؤ) یعنی جب خلق کی تعلیم سے فراغت پاؤ تو خلوت کی عبادت میں لگ جاؤ۔

رُہبانیت کی وجہِ امتناع

ترکِ لوازم کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جانا رُہبانیت ہے۔ رُہبانیت اسلام میں قطعاً ممنوع ہے۔ اس لیے کہ اس میں خدمتِ خلق چھوٹ جاتی ہے۔ چوبیس گھنٹے خدا کی بندگی کرنا اور مخلوقِ خدا کو چھوڑ دینا اصولِ انسانیت اور شرافتِ اخلاق نہیں ہے۔ اعلیٰ کردار اور اصولِ انسانیت تو یہ ہے کہ مخلوق کو فائدہ اور آرام پہنچانے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کو قربان کرے۔ اور اپنے مفاد کو قربان کرنا صرف بہ اعتبارِ ظاہر ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقتاً دوسروں کے لیے جس درجہ

Marfat.com

مفادات قربان کیے جائیں گے اس سے کہیں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔

عبادات کے مواقع پہچاننا

موقتی عبادات میں تو وقت کا پہچاننا ضروری ہے ہی۔ اوامر و احکام اور خدمتِ خلق میں بھی وقت کی پہچان اشد ضروری ہے۔ جس نے وقت کو نہیں پہچانا صحیح عبادات اور زیادہ فائدہ حاصل کرنے سے محروم رہ جائے گا۔ مثلاً اگر ایک وقت میں دو عبادات مجتمع ہو جائیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک کا ترک یا تاخیر دوسرے پر کس درجہ اثر انداز ہوگا۔ اگر ذاتی عبادات کے بجالانے میں خدمتِ خلق کو اس درجہ تاخیر ہو جانے کا احتمال ہو کہ جب تک وہ ذاتی عبادات بجالائے اُس وقت تک مخلوق تکلیف میں مبتلا رہے تو ذاتی عبادات کو تاخیر میں ڈالنا افضل ہوگا۔ مثلاً ایک شخص درد تکلیف یا زہر میں مبتلا ہے اور ہم اُس کی تکلیف کو دُور کر سکتے ہیں تو پہلے اُسے دور کرنے کی کوشش کریں گے خواہ نماز، روزہ اور حج میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں عبادات کو پہلے اختیار کرنا اور خدمات کو تاخیر میں ڈال دینا ہرگز مستحسن نہ ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ عبادات و خدمات کی اہمیت اور وقتی خصوصیت کے اعتبار سے تقدم و تاخر کرنا ہی زیادہ افضل و بہتر ہوگا۔ جیسے آپ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ جماعت کھڑی ہو چکی ہے اور آپ کو دو رکعت سنّتِ مؤکّدہ ادا کرنا ہے۔ اگر آپ کو یقین کامل ہے کہ دو رکعت سنت ادا کرنے کے بعد جماعت مل جائے گی، تو بیشک پہلے دو رکعت سنت ادا کریں۔ اور اگر یقین نہیں ہے، بلکہ جماعت چھوٹ جانے کا احتمال غالب ہے تو اب سنت نہیں پڑھیں گے، بلکہ جماعت میں شریک ہو جائیں گے۔ یہی موقع شناسی ہے۔ یا جمعہ کی نماز میں آپ مسجد پہنچے۔ خطیب ممبر پر خطبہ پڑھ رہا ہے۔ آپ اُس وقت کیا کریں گے؟ بالضرور خطبہ سنیں گے کیونکہ جمعہ کا خطبہ واجب (فرض) ہے اور چار رکعت نماز قبل خطبہ سنت۔ خطبہ شروع ہو گیا تو سنت کا اصل وقت تو پہلے

Marfat.com

ہی جاتا رہا۔ اب اگر سنت پڑھیں گے تو واجب کا ثواب ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور سنت کو واجب پر ترجیح دینے کی وجہ سے نقصان ہوگا۔ اور سنت کو غلط طریقہ پر انجام دینے کی وجہ سے اُس کا ثواب بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ خیر میں زیادہ خیر اور شر میں کمتر شر کو قبول کرنا عقلِ شرعی ہے۔ جب تک یہ عقل حاصل نہ ہو انسان صحیح فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

خیرِ برتر اور شرِ کمتر مثلاً ہمارے سامنے بیک وقت دو سکّے پیش کیے جائیں ایک تانبے کا اور دوسرا سونے کا۔ اور ہم ایک وقت میں ایک ہی سکہ اُٹھا سکتے ہیں، تو ہم کون سا اُٹھائیں گے۔ ظاہر ہے سونے کا سکّہ اُٹھائیں گے۔ اور یہی عقلِ سلیم کا تقاضا ہے۔ یہی خیر برتر ہے۔ اور مثلاً اگر ہم دو قسم کی برائیوں سے دوچار ہیں، ایک بڑی ہے اور ایک چھوٹی۔ ان دونوں میں ایک کو قبول کرنا ناگزیر ہے تو ہم لامحالہ چھوٹی برائی کو قبول کریں گے۔ اور بڑی بُرائی ترک کر دیں گے۔ جیسے تجارت میں ایک موقع ہمارے سامنے آتا ہے کہ اگر ہم پانچ سو روپیہ رشوت دے کر پانچ ہزار روپے کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ لیکن رشوت کا نتیجہ عذابِ جہنّم ہے تو ہماری عقل ہم کو کیا مشورہ دے گی؟ کیا ہم رشوت دے کر پانچ ہزار روپیہ بچا لیں گے؟ اور عذابِ جہنم کی پروا نہ کریں گے۔ یا پانچ ہزار روپیہ کا نقصان برداشت کریں گے اور جہنم سے خلاصی پائیں گے؟ اس صورت میں صحیح عقل کبھی ہم کو رشوت کا مشورہ نہ دے گی۔ اور اگر پانچ ہزار کی محبت عقل پر غالب آئی اور ہم نے تھوڑے نقصان کی بجائے بڑا نقصان قبول کیا تو قیامت میں بڑے خسارے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بہرحال عقلِ شرعی یہی ہے کہ ہم دو خیر میں خیر برتر کو اور دو شر میں شرِ کمتر کو اختیار کریں۔ اور بڑے فائدے اور کم نقصان کی طرف رجوع کریں۔

اجرانہ بندگی اور عاشقانہ بندگی اگر ہم اس نیّت سے عبادت کرتے ہیں کہ اس کا اجر

Marfat.com

ثواب جنت کی صورت میں ہم کو حاصل ہو تو ہماری عبادت کا مدار جنت کی محبت پر ہو گا۔ اور یہ خیر کمتر ہے اُس عبادت کے مقابلے میں جو خدا کی محبت میں بجا لائی جائے۔ اِس صورت میں اللہ تعالیٰ کا قرب وصال ہمیں حاصل ہو گا۔ اور یہ خیر برتر ہے۔ پس ہمیں جنت کی محبت ترک کر کے اللہ تعالےٰ کی محبت میں عبادت کرنی چاہیے۔ ایسی عبادت میں بندہ یہ نہیں دیکھتا کہ اُسے کیا اجر و ثواب مل رہا ہے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی عبادت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے یا نہیں۔ اور اس جذبۂ محبتِ الٰہی میں اپنی عبادات کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے کم سے کم انعامات کو بہت زیادہ سمجھتا اور شکریہ بجا لاتا ہے۔ وہ اپنی عبادت کو مشتہر نہیں کرتا، بلکہ چھپا لیتا ہے۔ کیونکہ وہ اُسے ہیچ اور عیب دار سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے انعامات و اکرامات کو تحدیث نعمائے الٰہی (یعنی مالک کی نعمتوں کو بیان کرنے کے) طریقہ پر ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ نعمتوں کا ذکر جذبۂ تشکر پیدا کرتا ہے اور شکر سے نعمتوں میں زیادتی ہوتی ہے۔

محبتِ خدا اور خدمتِ خلق

راہبوں، جوگیوں اور بعض صوفیوں میں ترک دنیا اور بن باس کا جذبہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ اپنے معبود کی محبت میں اس شدید جذبہ سے کام لیتے ہیں کہ باقی جملہ مخلوق کو جو ماسوی اللہ ہیں خدا کا غیر سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ محبت اللہ تعالےٰ کے دربار میں مقبول نہیں ہے۔ اس لیے کہ مخلوق ماسوا ہونے کے باوجود خدا کی غیر نہیں بلکہ عیال ہے جیسا کہ فرمایا اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ۔ اور عیال کے ساتھ صاحبِ عَیال کو جو شفقت و عنایت ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یعنی عیال کو ترک کر کے صاحبِ عیال کو خوش نہیں کیا جا سکتا برخلاف اس کے صرف عیال کو خوش کر کے صاحبِ عیال کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے

Marfat.com

جو لوگ مخلوق کو ترک کر کے خالق کی عبادت میں مصروف ہوں اُن کی عبادت مقبول نہ ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت سے باز رکھا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخلوق کی خدمت اور اُن کی نفع رسانی ہی وہ بڑی عبادت ہے جو ذاتی عبادات کو بھی بلند مرتبے پر پہنچا دیتی ہے۔ اگر نماز، روزہ اور حج خدمتِ خلق کے ساتھ ہے تو اس کی قبولیت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن اگر کوری عبادت ہی عبادت ہے اور اُس کے ساتھ خدمت شامل نہیں ہے تو قبول ہونے کی صورت میں بھی اجر تک تو پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے انعام و اکرام کی اُمید بغیر خدمتِ خلق کے ثابت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ میری محبت (کا دعویٰ) کرتے ہو (اور ترکِ دنیا کر کے میری عبادت میں مصروف ہونے کو قابلِ فخر عبادت سمجھتے ہو) تو تم (یہ راستہ چھوڑ کر) میری اتباع کرو۔ (دیکھو میں نے انسانوں کو فتنہ و فساد اور ظلم و جہل کے راستے سے نکال کر امن و سلامتی کی زندگی تک پہنچانے میں پوری پوری جدّ و جہد کی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کامیاب فرمایا۔ میں نے انسانوں کے سامنے 'خدمت کا' وہ راستہ کھول دیا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت ثابت کی جا سکتی ہے) تم میری اتباع کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت (و رحمت و شفقت) فرمائے گا۔ اور تمھارے گناہ معاف فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو بڑی بخشش اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

عشقِ معبود میں جاں بازی اور سرفروشی

قرآن کریم میں ہم کو صحیح عبادت و محبت کا سیدھا راستہ ان الفاظ میں بتایا گیا ہے

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔ یعنی کہہ دو ہماری نماز، حج، زندگی اور موت اللہ ربّ العزۃ کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ نماز یعنی

Marfat.com

قولی اور بدنی عبادت۔ حج، یعنی خدا کی طرف سفر کرنا تو خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے لیے ہے ہی، ہماری زندگی اور موت بھی اللہ تعالےٰ کے لیے ہے۔ زندگی میں تمام لوازماتِ زندگی شامل ہیں۔ یعنی ہماری ایک ایک حرکت و سکون، سماعت، بصارت، ذوق، شم، لمس، تخیل، توہّم، تذکر، تصوّر، تغذیہ، تنمیہ، تہذیبِ معاشرت، اخلاق و کردار، غرض زندگی میں واقع ہونے والے تمام امورات شامل ہیں جو صرف اللہ تعالےٰ کے لیے ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز اپنی ذات یا کسی بھی ماسوا کے لیے نہیں ہے۔ اور یہی نہیں کہ زندگی اور اُس کے لوازمات ہی اللہ تعالےٰ کے لیے ہیں بلکہ ہماری موت، یعنی زندگی اور لوازماتِ زندگی کا اختتام بھی اللہ تعالےٰ کے لیے ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اللہ تعالےٰ کی محبت میں اس کے حکم کے مطابق زندگی گزاریں۔ اور اُس کے حکم پر ثابت قدم رہنے میں اس درجہ اٹل اور ناقابلِ تسخیر ہوں کہ اگر موت بھی ہمارے سامنے کھڑی ہو جائے تو ہمارے پائے ثبات کو لغزش نہ دے سکے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی اور اُس کے لوازمات موت کے خوف اور جاں کنی کی تکلیف سے اپنا رخ اللہ تعالےٰ کی طرف سے پھیر کر (اُس کے حکم کے خلاف) کسی اور کی طرف کر لیں۔ اظہارِ عشق و عبدیت کے لیے یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر جملہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام نے ثابت قدم رہ کر ہمیں دکھا دیا ہے۔

سرِ حسینؑ تقاضائے عشق یہی ہے کہ عاشق اپنی جملہ کائنات کو اپنے معشوق پر قربان کر دے۔ حتیٰ کہ اُس کی انفرادی خودی اور انانیت تک باقی نہ رہ جائے۔ اسی کا نام سرفروشی اور جاں بازی ہے۔ اور اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ تم سربکف ہو کر میدان میں آ جاؤ۔ یعنی اپنی جان کو بھی اپنے لیے نہ سمجھو۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری جان تم سے مانگے تو اس ادائے جاں طلبی پر قربان ہو جاؤ۔ اور وہ سرشاریت پیدا کرو جس کا نمونہ حسینؑ

Marfat.com

علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں پیش کیا۔ (اللہ اللہ! دربارِ یزیدی میں حسینؑ کا سر مبارک رکھا ہے۔ مبارک ہونٹ اب بھی ہل رہے ہیں۔ سورہ کہف تلاوت کی جا رہی ہے۔ ایک عیسائی سفیر جو دربار میں موجود ہے اس کٹے ہوئے سر میں حیاتِ باقی کو مشاہدہ کرتا ہے اور مسلمان ہو جاتا ہے۔ یزید زندہ ہے مگر مردوں سے بدتر کہ نور کی کوئی ایک کرن بھی زندوں تک نہیں پہنچا سکتا۔ حسینؑ شہید ہیں مگر ہزار زندوں سے اولیٰ و افضل کہ مردہ دل کافر کو ایک اشارے میں اسلامی زندگی عطا فرماتے ہیں۔ یہ ہے صحیح عبدیت اور عشق الٰہی میں جاں بازی اور سرفروشی کا نتیجہ)۔

بے سرنامہ بالکل ایسی ہی مثال اس امتِ مرحومہ کے اولیاء میں بھی پائی جاتی ہے، جیسے حضرت شیخ عطار رحمۃ اللہ علیہ جن کے لیے حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

ہفت دشتِ عشق را عطار گشت　　　ما ہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

(عشق کی سات وادیوں کو عطارؒ نے طے کیا۔ ہم ابھی تک ایک ہی گلی کے موڑ پر چکر لگا رہے ہیں۔) حضرت شیخ عطار رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کیفیت تھی کہ جب مغل چنگیز خاں چین سے نکل کر خراسان میں آیا اور قابض ہوا تو کسی سپاہی (مغل) نے حضرت شیخ عطارؒ کو ڈاڑھی سے پکڑ کر کھینچا اور کہا۔ "میں تمھیں غلام بنا کر بیچوں گا"۔ چونکہ آپ کو باطنی اطلاع پہنچ چکی تھی کہ اس عالم سے کوچ کا وقت آچکا ہے اور دوسرے عالم میں بلایا جا رہا ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ "بیشک، تم مجھے غلام بنا کر بیچ ڈالو۔ میں تو خود ہی اپنے خریدار کا طالب ہوں"۔ اس مغل نے آواز لگائی۔ "کوئی ہے جو اس غلام کو خریدے؟" اتفاق سے کوئی شناسا ادھر سے گزرا۔ اور حضرت شیخ کو پہچان کر دو تھیلیاں اشرفیوں کی نکالیں اور مغل سے کہا۔ "میں ان

Marfat.com

اشرفیوں کے عوض ان کو لینا چاہتا ہوں۔" حضرت شیخ نے مغل کے کان میں کہا: "میری قیمت اس سے زیادہ ہے، تم اس پر راضی نہ ہونا۔" مغل نے خیال کیا کہ یہ تو کوئی قیمتی غلام ہے، مجھے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ ابھی دو تھیلی اشرفی مل رہی ہے تو آگے ضرور زیادہ ملے گی۔ وہ آگے بڑھا اور دوسری جگہ آواز لگائی۔ "میں اس غلام کو بیچنا چاہتا ہوں، جو لینا چاہتا ہے لے۔" ایک بڑھیا اپنی گائے کے لیے بھوسا لیے جا رہی تھی۔ اُس نے مغل کی آواز سنی، حضرت شیخ کو دیکھا اور یوسف علیہ السلام کی خریدار بڑھیا کی طرح آگے آئی اور مغل سے کہا۔" دیکھو، میرے پاس یہ بھوسا ہے۔ اس سے تمہارے گھوڑے کا پیٹ بھر جائے گا۔ تم یہ بھوسا لے لو اور غلام مجھے دے دو۔" حضرت شیخ عطارؒ نے مغل کے کان میں کہا: "دے دو، دے دو جلدی کرو، نہیں تم نقصان اُٹھاؤ گے۔ میری قیمت اس سے بہت کم ہے[1]۔" مغل کو غصہ آگیا، بولا۔" کیا تو میرے ساتھ مسخرگی کرتا ہے۔ دو تھیلی اشرفی ضایع کر دی اور اب بھوسا لینے کے لیے کہتا ہے جلدی کرو۔" بس تلوار نکال کر ایک ہی ہاتھ میں آپ کی گردن اُڑا دی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران

---

[1] یہاں بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ نے مغل سے غلط بیانی کی یا اُس کو دھوکا دیا جس کے نتیجہ میں اس کی دو تھیلی اشرفی ضایع ہو گئی۔ تو یہ بات نہیں ہے آپ نے بالکل سچ فرمایا کہ دو تھیلی اشرفی آپ کے سر کی قیمت بہت کم ہے جس میں عشق الٰہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ قارون کا خزانہ بھی اس کا پاسنگ نہیں، اس لیے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا خزانہ فانی اور چھوٹ جانے والا ہے۔ اور عشق الٰہی کی دولت باقی و جاوید ہے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا عطیۂ خاص ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ میری قیمت اس سے زیادہ ہے۔ اور بھوسے کو جو آپ نے فرمایا کہ یہ بڑی قیمت ہے تو آپ کی نظر بھوسے پر نہیں، بلکہ اس جذبہ پر تھی جس کے ماتحت بڑھیا بے تاب ہو کر اس خریداری پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اور اُسے یہ بھی ہوش نہ رہا تھا کہ اس کی گائے آج بھوکوں مر جائے گی۔ یہ جذبہ بھی اللہ تعالےٰ کا عطیہ بڑی دولت اور ایک قیمتی خزانہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

رہ گیا کہ حضرت شیخ اپنے سر کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھائے آگے بڑھ رہے ہیں اور عاشقانہ اشعار پڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ بحالتِ استعجاب اُن کے اشعار سنتا اور نقل کرتا ہوا آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا عجیب منظر تھا، ایک مقتول اپنے سر کو ہاتھوں پر اُٹھائے چل رہا ہے۔ سر سے خون جاری ہے جس سے راستہ رنگین ہو رہا ہے اور لوگوں کا ہجوم ایک جلوس کی شکل میں ہمراہ ہے۔ خون کے ساتھ فی البدیہہ اشعار نکل رہے ہیں اور مغل اُن کو لکھ رہا ہے۔ آخر نیشاپور میں اس مقام تک پہنچے جہاں اب حضرت شیخ کا مزارِ مبارک ہے۔ سر کو زمین پر رکھا اور آپ کا جسم اُس کے برابر لیٹ کر ہمیشہ کیلیے خاموش ہو گیا۔ (اشعار کے اسی مجموعے کا نام "بے سر نامہ" ہے جو اس واقعہ کی یادگار ہے۔)۔ آخر جب مغل نے حضرتِ شیخ کی یہ کرامت دیکھی تو کفر سے تائب ہو کر ایمان لایا۔ اور کلمہ پڑھا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"۔ تجہیز و تکفین کے بعد اپنی آخری سانس تک وہ مغل حضرتِ شیخ کے مزار کا مجاور رہا۔ اور بعد وفات وہیں دفن کیا گیا۔ اسی کا نام جاں بازی اور سر فروشی ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق اور تبلیغِ اسلام کے لیے اپنی جان تک کی پروا نہ کی جائے۔ اگر جان دینے سے اسلام کی صداقت ظاہر ہوتی ہے اور کسی کافر کو ایمان کا ثبوت مل سکتا ہے تو فوراً اپنی جان قربان کر دینی چاہیے۔ کیونکہ ہماری زندگی اور ہماری موت جب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کے کام آنی چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا ابتلا

دیکھیے نا، حضرت زلیخا علیہا السلام کو مسلمان کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو کس کس ابتلا سے دوچار ہونا پڑا۔ باپ سے چھوٹے۔ بھائیوں کا ظلم برداشت کیا، کنوئیں کی مصیبت جھیلی، بازارِ مصر میں بیچے گئے۔ زلیخا علیہا السلام کے مکر و فریب کا شکار ہوئے۔ قید کی سختیاں اُٹھائیں۔ آخر وہ وقت آیا کہ حضرتِ زلیخا اپنے بتوں سے یوسف علیہ السلام کو مانگتے

Marfat.com

مانگتے تھک گئیں اور اُن سے مایوس ہو کر خدائے واحد القہار پر ایمان لائیں۔ آخر یوسف علیہ السلام کے عشق میں مقامِ محبوبیت تک پہنچیں۔ اگر حضرتِ یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی مقام پہ کوتاہی ظاہر ہوتی تو حضرتِ زلیخا اپنے بتوں کی کرامت سمجھتیں، ان کا اعتقاد اپنے بتوں پر اور مضبوط ہو جاتا اور وہ ایمان کی دولت تک نہ پہنچ سکتیں۔ یہی معنی ہیں "مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کے۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک ہم کو ایسی ہی زندگی اور موت حاصل کرنے کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۹

اتمامِ نعمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْعَمَ وَاَتَمَّ عَلٰی حَبِیْبِہٖ کُلَّ نَعْمَآئِہٖ وَکَلِمَاتِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ مَظْهَرُ کُلِّ شَانِہٖ وَاٰیَاتِہٖ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ سَنَدُ کُلِّ شَوَائِبِہٖ وَالَآئِہٖ ۔

حقیقتِ اسلام اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں پر جو انعامات واکرامات فرمائے ہیں اُن کو جاننا پہچاننا اور اُن کے مطابق شکریہ ادا کرنا حقیقتِ اسلام ہے۔

جہالت اللہ تعالےٰ کے ان انعامات واکرامات کو جو اُس نے رحمانیت کے ذریعہ عام مخلوق پر اور رحیمیت کے ذریعہ بالخصوص نیک مؤمنوں پر فرمائے، نہ جاننا اور اُن کے جاننے کی کوشش بھی نہ کرنا جہالت ہے۔

کفرانِ نعمت اللہ تعالےٰ کے انعام واکرام کو جہالت یا دشمنی کی وجہ سے چھپا کر کسی اور کی طرف منسوب کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اور ایسا کرنے والا کافر۔ کیونکہ کفر کے معنی سچائی اور حقیقت کو چھپا لینے کے ہیں۔ جیسے ہیں رزق و روزی دینے والا اللہ تعالےٰ ہے اور ہم کہیں کہ روزی تو حیلہ کرکے ہم خود کماتے ہیں، یا ملازمت و تجارت سے ہم کو روزی ملتی ہے۔ اگر ہم حیلہ نہ کریں اور

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزی دے تو ہم جانیں کہ وہ روزی دیتا ہے۔ یہی انعام کا چھپانا اور کفرانِ نعمت ہے۔ ان تعریفات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا اور سمجھنا اسلام ہے۔ اور حق کو باطل اور باطل کو حق کہنا اور سمجھنا کفر ہے۔

عرفان اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کو جان پہچان کر افعالِ الٰہی، اور افعالِ الٰہی کو جان پہچان کر اسمائے الٰہی، اور اسمائے الٰہی کو جان پہچان کر صفاتِ الٰہی تک پہنچنا ہی عین عرفان ہے۔

صوفیہ کا نصب العین جب حقائق ونعمات الٰہی اعمال واقوالِ کفریہ میں چھپ جاتے ہیں یا کوئی پردہ وحجاب ان کے ظہور کا مانع ہو جاتا ہے تو صوفیائے کرام ان پردوں کو اُٹھانے اور حقائق کو ظہور کی طرف لانے کی کوشش میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ اور اُس وقت تک اس جد وجہد میں مصروف رہتے ہیں جب تک ایک ایک حق ونعمت پورے طور پر منکشف نہ ہو جائے۔ مثلاً دولتِ دنیا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ لیکن اس نعمت کی حقیقتوں اور اس پر پڑے ہوئے پردوں کا جاننا پہچاننا صوفیہ کا کام اور صحیح نصب العین ہے۔

دَولت کی تعریف دولت اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو انسان کی احتیاجات کو رفع کرتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ظاہر اور باطن۔ اور ہر پہلو کے دو مرتبے ہیں۔ مقبولؔ یا محمود اور مردوؔد یا منحوس۔

دولتِ ظاہر محمود وہ روپیہ پیسہ چاندی سونا، ملک، مال وغیرہ جو جائز اور احسن طریقہ سے حاصل کیا گیا ہو، اور جائز اور احسن طریقہ پر (یعنی خدا کے حکم کے مطابق) خرچ کیا جائے۔ یہ وہ دولت ہے جس کے حصول یا خرچ میں بائیں جانب کا بدی لکھنے والا فرشتہ کچھ بھی نہ لکھ سکے۔ یہی دولتِ ظاہر محمود ہے۔

دولتِ ظاہر منحوس یہ وہ دولت ہے جس کے حصول یا خرچ میں ناجائز طریقے یا راستے اختیار

Marfat.com

کیے گئے ہوں۔ اور اس کے متعلق زیادہ تر اندراجات بائیں جانب کے فردِ عمل میں کیے جائیں۔

دَولتِ باطن محمود اگرچہ بظاہر دولت و مال موجود نہ ہو، لیکن اس کے نتائج (رفعِ احتیاج اور استغناء) انسان کو حاصل ہوں۔ اور اس کے متعلق تمام اندراجات داہنی جانب ہوں بائیں جانب نہ ہوں۔

دَولتِ باطن منحوس بغیر مال و دولت کے رفعِ احتیاج و استغناء تو ہو لیکن شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے انہدام کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ غیر مسلم فقرا یا شریعت سے بھٹکے ہوئے مسلمان فقیر، جن کو دولتِ باطن اگرچہ حاصل ہو مگر محمود و مقبول نہیں۔

اسی لیے اغلب صوفیائے کاملین و عارفین ظاہری دولت جمع کرنے یا دنیاوی ذخیرے حاصل کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتے، بلکہ ظاہری فقر و احتیاج میں باطنی محمود استغناء کی دولت سے مالامال ہونے کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت جانتے اور اُس کا شکر بجالاتے ہیں۔ یہ سب بزرگان ہمیشہ ایسی دولت سے پرہیز کرتے ہیں جو ظاہر میں دل فریب اور باطن میں دل آزار ہو۔ اور ایسی تمام چیزوں میں جو بظاہر دل فریب اور بباطن دل آزار ہوں، دولتِ دنیا سب سے اول ہے۔ یہ دولت اگر ضرورت سے زیادہ ہاتھ آجائے تو پریشانی اور تفرقہ کا باعث ہوتی ہے۔ یہ دولت اپنے نتیجہ میں حرص اور بخل پیدا کرتی ہے، جس کا بُرا اثر اخلاقیات پر مرتّب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صوفیائے کرام دولتِ دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور لوگوں کو اُس کی محبت سے بچنے کی تعلیم و تاکید فرماتے ہیں۔ ہاں، اگر ضرورت کے مطابق اتنی دولت ہو کہ اپنی احتیاج اور سائل کے سوال کو پورا کیا جاسکے تو اُسے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام و اکرام سمجھتے اور اُس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ احتیاجات فطری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محتاج بنایا ہے۔ اگر ایک انسان اپنی عقل و تدبیر سے کام لے کر اتنی دولت حاصل کرتا ہے کہ ضروریات پوری ہو جائیں تو وہ یقیناً

Marfat.com

خوش بخت و خوش وقت ہوتا ہے بشرطیکہ حرص اور بخل نے اُس کو نہ چھو لیا ہو۔

کمالِ نعمت کمالِ نعمت کے معنی افراطِ دولت کے نہیں ہیں۔ اسلام نے ہر افراط اور تفریط سے ہم کو بچایا ہے۔ بلکہ کمالِ نعمت کے یہ معنی ہیں کہ اعتدال کے ساتھ اتنی نعمت و دولت حاصل ہو کہ نہ احتیاج باقی رہے نہ انفرادی دولت وافر ہو جائے۔ اگر احتیاج رفع ہونے کے بعد دولت باقی بچی تو اس کی حفاظت اور صحیح مصرف پیدا کرنے کی مزید احتیاج لاحق ہو جائے گی۔ اور انسان اس میں گھرتا چلا جائے گا۔ بزرگوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "افراطِ زر سے شیطان کا خوف اور تفریطِ زر سے ایمان کا خوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن دونوں سے بچائے اور سوائے اپنے کسی دوسرے کا محتاج نہ رکھے۔ البتہ اجتماعی و ملّی دولت بڑھانا تقویتِ قوم و ملّت کے لیے لازمی ہے۔

دولتِ دنیا ایک زہر ہے دولت کی مثال بالکل سنکھیا کی ہے۔ سنکھیا اگر اصلاح و تدبیر کے بعد اتنی کم مقدار میں استعمال کی جائے کہ مزاجِ انسانی پر غالب نہ آسکے تو ایک ایسا تریاق ہے کہ مرتے ہوئے انسان کو نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔ اور اگر آنکھ بند کر کے اس مقدار میں استعمال کی جائے کہ مزاجِ انسانی پر غالب آجائے تو اچھے خاصے تندرست اور طاقت ور پہلوان کو بھی چند ساعتوں میں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ بالکل یہی حال انفرادی دولتِ دنیا کا ہے۔ اگر اسے اصلاح و تدبیر کے بعد یعنی طریقہ پر حاصل کر کے حقوق و زکوٰۃ وغیرہ نکال کر بقدرِ احتیاج کام میں لایا جائے تو تریاقِ اعظم ہے کہ دل کو علائقِ دنیا سے فارغ کر کے انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر و فکر کے قابل بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر اندھا دھند حاصل کی جائے اور زیادہ طلبی اور ذخیرہ اندوزی سے کام لیا جائے تو ایسا مہلک اور رجان لیوا زہر ہے کہ جسمانی زندگی تو ممکن ہے کہ ایک وقتِ خاص تک کے لیے بچ جائے لیکن روحانی اور

Marfat.com

اُخروی زندگی کا بچنا البد ہو جاتا ہے۔ عقل کا کام خود ہلاکت سے بچنا اور دوسروں کو ہلاکت سے بچانا ہے۔

دولت کا منتر

ہماری نظر جب دنیا کے متمول لوگوں پر پڑتی ہے تو ہم اُس کے ظاہری حسن وجمال اور شان وشوکت کو دیکھ کر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ اس کا منتر سیکھیں (یعنی اس کا پورا علم حاصل کریں) اس کے حصول کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ اگر حاصل نہیں ہوتی تو رنج وکوفت اُٹھاتے ہیں۔ اور حاصل ہو جاتی ہے تو منتر نہ جاننے کی وجہ سے اُس کا زہر دُور نہیں کر سکتے جو دھیرے دھیرے اُس کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی دنیا اور دین دونوں یا کم ازکم دین بالضرور تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر اُس نے دولت کا منتر سیکھ لیا ہوتا تو خواہ کتنی ہی دولت اُسے حاصل ہوتی اور خواہ کیسے ہی سونا چاندی کے سانپوں سے کھیلتا اُسے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

دولت کا اثر اور اس کا علاج

اس کی ہلاکتوں کا اثر پانچ قسموں پر ہوتا ہے۔ ایک اثر ہماری جسمانیت پر ہوتا ہے۔ یعنی ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہونے کی وجہ سے انسان آرام طلب، اور زیادہ سے زیادہ مرغن اور لذیذ غذائیں استعمال کرنے کی وجہ سے بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کا منتر یا علاج یہ ہے کہ ورزش اور مجاہدہ کو اپنے لیے لازم جانے اور فرض روزوں کے ساتھ کبھی کبھی نفل روزے رکھا کرے۔ دوسرا اثر ہمارے دماغ پر ہوتا ہے دولت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اُس میں انہماک بڑھتا جاتا ہے۔ جس قدر انہماک بڑھتا ہے سرشاری پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ دولت کا نشہ غالب آجاتا ہے جسے کوئی ترشی آسانی سے نہیں اتار سکتی، الا ماشاء اللہ۔ اس کا علاج کسی پیر کامل سے ربط ونسبت پیدا کرنا اور خود کو اُس کے ہاتھوں میں دے دینا ہے۔ تیسرا اثر نفس پر ہوتا ہے اور انسان کے اخلاق میں حرص وحسد بخل کینہ، عداوت اور شہوت وغضب وغیرہ تباہ کن بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا علاج توبہ

Marfat.com

سلوک و مجاہدہ اور عمل خیر ہے۔ چوتھا اثر اس کا دل پر ہوتا ہے۔ دل میں بے اطمینانی، عدم اعتماد رنج اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ اس کا علاج ذکر و عبادت اور ایثار ہے۔ پانچواں اثر روح پر ہوتا ہے۔ انسان نیک کاموں اور عبادات و ریاضات میں لذت نہیں پاتا۔ روح مضمحل اور منقبض ہوتی ہے۔ اگر یہ اثرات زائل نہ ہوسکیں اور مرتے وقت بھی باقی رہ جائیں تو عذاب گور اور ضغطۂ قبر کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے پناہ میں رکھے۔ اس کا علاج کثرت سے خیر خیرات کرنا، خدمتِ خلق میں مشغول رہنا اور حاجت مندوں کی حاجات کو پورا کرنا ہے۔

دولتِ مستحسن

مقصد یہ ہے کہ اگر تمھیں اللہ تعالےٰ بقدر حاجت و ضرورت دولت دیتا ہے، خواہ وہ تنخواہ کے ذریعہ ہو یا کاشتکاری اور تجارت کے ذریعہ، یا ضرورت سے زیادہ رزق حلال دیتا ہے جس سے تم کو استغنا اور فارغ البالی حاصل ہوتی ہے تو یہ تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کی اتمام نعمت ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ تمھیں ایمان کی سلامتی اور رجوع الی اللہ حاصل ہو۔ اور تم امورِ خیر اور اجتماعی معاونت و فلاح قوم میں حسب استطاعت خرچ کرنے سے دل تنگ نہ ہو جاؤ۔ ایسی دولت نہایت مستحسن اور آخرت میں بھی کام آنے والی ہے۔ کیونکہ ایسی دولت سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی اور جنت خریدی جاسکتی ہے۔

دولت کا عذاب

لیکن اگر ضرورت سے زیادہ دولت ہے اور اُس کے قبیح اثرات انسان پر غالب ہیں اور وہ فرعون بے سامان یا شداد و قارون و ہامان بن کر رہ گیا ہے، وہ خدا کے سامنے جھکنے اور اُس کی فرمانبرداری بجا لانے کی بجائے شیطان کی طرف جھکتا اور قوم میں تخریب و تفریق پھیلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ دولت کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالےٰ اُس کے اوپر کبھی رشوت لینے والوں کو مسلّط کرتا ہے۔ اور کبھی دھوکے بازوں، چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں ڈال دیتا ہے۔ کبھی خود

Marfat.com

اُس کے دل میں لالچ اِس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ استسقاء کے مریض کی طرح دولت جمع کرتا جاتا ہے لیکن اُس کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی لالچ انسان میں ناجائز نفع اندوزی، سیہ بازاری، فریب کاری۔ بلکہ چوری، رشوت، غبن اور حق تلفی وغیرہ کے ارتکاب کی طرف اکساتی ہے — اور انسان اِن کاموں کے کرنے پر اپنے کو مجبور سمجھتا ہے۔ حقیقۃً وہ مجبور نہیں ہے بلکہ اُس کے نفس اور شیطان نے مجبوری کا خیالی جال پھیلا کر اُسے مقید کر لیا ہے۔ اور عقل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ اس کا نتیجہ کبھی جیل کی تکلیف، کبھی ہم چشموں میں بدنامی اور بے عزتی اور کبھی انسانیت میں بے اعتباری کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ جتنا وہ بُرا ہوتا ہے اُس سے زیادہ، لوگ اُسے بُرا سمجھتے ہیں۔ اور جتنا لوگ اُسے بُرا سمجھتے ہیں وہ اُس سے زیادہ بدتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

خواہشات میں بے صبری

دولت کا ایک بڑا عذاب اپنی خواہشات میں بے صبری کا اظہار ہے۔ جب پیسہ پاس ہوتا ہے تو انسان اپنی خواہشات پر صبر کرنا گوارا نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے جس قدر جلد ممکن ہو اُس کی آرزو پوری ہو جائے — صبر کی صفت اس سے چھن جاتی ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے بے صبری کی حالت میں بندہ اپنے مولا سے بہت دُور اور مہجور ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر بھوکا ہے تو صبر نہیں کر سکتا کہ اللہ رب العزۃ اُس کی روزی کو اُس تک پہنچا دے۔ بلکہ بے صبری کے ساتھ اپنی دولت کے ذریعہ فوراً اپنی بھوک مٹانے پر اُتر آتا ہے۔ اور یہی بے صبری ہے جو اُسے رمضان شریف میں بھی افطار تک انتظار سے معذور بنا دیتی ہے۔ اگر دولت نہ ہو تو چار و ناچار اُسے صبر کرنا پڑے مگر اُس نے تو اپنی دولت کو اپنا رزاق اور حاجت روا بنا لیا ہے۔ اور خدا کی نافرمانی پر اُتر آیا ہے یا اس کیلئے

Marfat.com

باعث عذاب ہے۔ یا مثلاً بیماری کی حالت میں اپنے درد دُکھ اور تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔ وہ ڈاکٹروں کی ناجائز فیس اور قیمتی دواؤں میں اس لیے اپنی دولت بے دریغ خرچ کرتا ہے کہ جلد سے جلد اُسے آرام ہو جائے۔ چونکہ صبر کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اس لیے اللہ کی رحمت دُور ہو جاتی ہے۔ معالجات میں زیادہ دولت صرف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُس کو ڈاکٹر کے علاج پر جس درجہ اعتماد و اعتقاد ہے اُس کا عشر عشیر بھی اللہ کی رحمت اور شفا بخشی پر نہیں ہوتا۔ علاج ضروری ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم دواؤں سے اور حجرات و تعویذات سے اپنی بیماریوں کا علاج کریں۔ اور اُس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ دوا اور دیگر تدابیر اپنے اثر میں اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت ہوتی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہو تو کوئی دوا اور تدبیر فائدہ نہیں کرسکتی۔ اگر یہ اعتقاد راسخ ہو جائے تو انسان معمولی علاج کر کے انتہائی صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی شفا پر بھروسہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ صبر کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی معیت ہو گی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو تو کون سا فائدہ دُور رہ سکتا ہے۔ لیکن دولت کی طاقت رہتے ہوئے خدا پر بھروسہ کر کے صبر کے ساتھ انتظار کرنا بہت مشکل ہے اس لیے وہ عذاب میں گھرتا چلا جاتا ہے۔

فقر میں شکایت کبھی کبھی انسان اپنے ابتلا یا افلاس میں صبر تو ضرور کرتا ہے، اور اپنے فقر پہ قانع رہتے ہوئے زندگی گزارتا ہے۔ اور اپنی نیّت و ارادہ کو غلط کردار پر ڈگمگانے سے بچائے جاتا ہے۔ لیکن لاعلمی یا حسن طلب کے طریقہ پر اپنی تکالیف اور ضروریات کی شکایت لوگوں سے کرتا رہتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہے جو اُسے لوگوں کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ خالق کی شکایت مخلوق سے کرتا ہے۔ اور یہ شکایت بے سُود ہوتی ہے، اس لیے کہ مخلوق خود خالق کی محتاج ہے۔ خالق نہ چاہے تو مخلوق

Marfat.com

اُس کی کیا مدد کر سکتی ہے؟ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے فقر کو افلاس وابتلا سے آزماتا ہے۔ اور اُسے پختہ بنانا چاہتا ہے، یا ہمت کی بلندی عطا فرمانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی لفظِ شکایت بندے کے منہ سے نکل جائے تو گویا امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔ اور روحانی ترقی رُک جاتی ہے۔ یا کبھی اللہ تعالیٰ دولت کی زیادتی کے ساتھ بندے کا امتحان لیتا ہے۔ کہ بندہ دولت پا کر بھی میرا بندہ رہتا ہے یا دولت کا بندہ ہو جاتا ہے۔ اگر "بندہ" دولت کو اللہ کے حکم کے مطابق اُس کی رضا جوئی میں صرف کرتا ہے۔ اور دولت کے ذریعہ خلقِ خدا کو آرام و راحت اور فائدہ پہنچاتا ہے تو وہ بندگی کے امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اور ترقی کرتے ہوئے مقامِ رضا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر خدا کی دی ہوئی دولت کو اپنی خواہشاتِ نفس پر خرچ کرتا ہے شان و شوکت اور تعیش پسندی میں دولت لٹاتا ہے، سرکشی اور بے جا اسراف میں مبتلا ہو گیا، یا خزانہ کا سانپ بنا ہوا ہے تو وہ اللہ کے امتحان میں فیل ہے۔ وہ دولت اُس کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

فقر میں خود داری فقر میں خودداری ایک اعلیٰ صفت ہے۔ جب ایک بندہ اپنے فقر میں قانع ہوتا ہے اور فقر ہی کو عزیز سمجھتا ہے۔ ابتلا اور افلاس میں بے ایمان نہیں ہو جاتا۔ دھوکے، فریب، چوری، دغابازی سے کام نہیں لیتا۔ کسی کے سامنے حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ اپنے فقر و مستمندی کا اظہار نہیں کرتا تو وہ اپنی خودداری کے ذریعہ صبر میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی معیّت اُس کو حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ رزق بے حساب اُسے حاصل ہونے لگتا ہے ساری دنیا کی دولت اُس کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ زمین آسمان میں ہے اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اُس کا ہو گیا تو ساری دُنیا اُس کی ہو گئی۔ لوگ اپنی دولتیں لے کر

Marfat.com

اُس کے سامنے حاضر ہوتے اور قبولیت کی تمنا کرتے ہیں۔ جسے چاہے قبول کرے جسے چاہے قبول نہ کرے۔ قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اپنا حق سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ اور ردّ کرتا ہے تو شرِ فتنہ سمجھ کر ردّ کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں سے اپنی دولت قبول کر کے اُن پر احسان کرتا ہے۔ اور اُن کو اللہ تعالیٰ سے دنیا میں دس اور آخرت میں ستر دولت دلاتا ہے۔ اور جب تک اس مرتبہ پر فائز نہ ہو طریقت میں نذر و نیاز یا عطیات قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی لیے دینے والا اپنی دولت کے قبول ہونے پر اظہارِ ممنونیت کرتا اور احسان مانتا ہے کہ میں نے خدا کی دی ہوئی امانت بہ طریق تشکّر حقدار کو پہنچا دی اور اُس نے قبول کر کے مجھے سبکدوش کر دیا۔

ہماری دولت میں ہمارا حصّہ

اے صاحبانِ بصیرت! اللہ تعالیٰ ضرورت سے زیادہ جو دولت عطا فرماتا ہے۔ اُس میں ہمارا صرف تیسرا حصّہ ہے۔ ایک حصّہ نادار افراد اور قوم کا۔ دوسرا حصّہ اعزّا و اقربا کا اور تیسرا حصّہ ہمارا۔ اگر یہ حصّے صحیح طور پر تقسیم کر دیے جائیں تو گویا ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دولت کا حقِ شکر ادا کر دیا۔ اور مزید دولت کے مستحق ہو گئے۔ ایسی دولت زوال پذیر نہیں، ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ ان باتوں پر ایمان رکھنے والے حضرات کسی سائل کے سوال کا انتظار نہیں کرتے کہ مانگنے والا کسی طرح مانگے تو اس کو دیں، بلکہ وہ اپنی دولت کے مستحق کو خود تلاش کرتے ہیں۔ کیونکہ صحیح مستحق کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ یہ کام دینے والے کا ہے کہ وہ اُن لوگوں کو ڈھونڈے جن کا حصّہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے ہاتھ میں اس لیے دیا ہے کہ وہ اُنھیں پہنچا دے۔ اگر پہنچا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کام پورا کرتا ہے اور اُس کا حکم بجا لاتا ہے۔ ورنہ اپنے سر بوجھ لادتا چلا جاتا ہے اور یہی بوجھ مرنے کے بعد عذاب کی صورت میں اُس پر مسلّط کیا جائے گا۔ پس جب کسی حقدار کو اس کا حق پہنچائے تو یہ نہ سمجھے کہ اُس نے اُس پر احسان کیا ہے۔ بلکہ یہ جانے کہ لینے والے نے

Marfat.com

اس پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ نہ لیتا تو اُس کے سر سے بوجھ نہ اُترتا۔

اللہ تعالیٰ کو اچھا مال دو

جب تم کسی محتاج فقیر یا حقدار کو کچھ دیتے ہو تو یہ نہ سمجھو کہ تم اُن کو دیتے ہو، بلکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنا نذرانہ پیش کرتے ہو۔ اگر تم اچھا مال اپنے لیے رکھو اور گھٹیا یا خراب مال اللہ تعالیٰ کو دو تو یہ بڑی بے ادبی ہے۔ بلکہ اپنے پاس جو اچھے سے اچھا مال ہو وہ خدا کو دو تاکہ تمھیں اس کے عوض میں دس گنا اچھے سے اچھا مال عطا کیا جائے۔ اگر تم خراب مال دو گے تو اُس سے دس گنا زیادہ خراب مال ملے گا۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہتے ہو تو بہترین اور محبوب ترین مال میں سے خرچ کرو۔ اگر تم ایسا مال خرچ کرو جو تمھیں پسند نہیں ہے یا تمھارے اہل وعیال کے لیے بے مصرف اور بے کار ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو کیونکر پسند آئے گا؟ اور اُس پر تمھیں کیونکر انعام دیا جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم کسی کو خراب مال دیتے ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہو۔ اور یہ بات خدا تک پہنچتی ہے۔ غور کرو، اس کا اثر کیا ہوگا۔ اور کیونکر تم اللہ کی نظر میں لائق تحسین سمجھے جاؤ گے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کو اپنے سے مقدم رکھتے تھے۔ اور اغلب جو خود نوش فرماتے وہی خادموں کو بھی دیتے تھے۔ اگر کچھ کھجوریں آجاتیں تو اصحاب صُفہ رضؓ کو بھی وہی دیتے جو اپنے لیے رکھتے۔ یہی طریقہ ہے جس سے انسان اپنے صفات رذیلہ کی اصلاح اور اپنے نفس کا تزکیہ کرسکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے لیے بڑھا سکتا ہے۔ اگر تم بخل سے کام لے کر دینے سے ہاتھ روک لو گے تو اللہ تعالیٰ بھی دینے میں کمی فرمائے گا۔ اور تم جتنا شکرانۂ نعمت بجالاؤ گے اللہ تعالیٰ نعمت زیادہ کرتا جائے گا۔

تحدیث نعمائے الٰہی

اللہ تعالیٰ جو نعمت و دولت تم کو عطا فرماتا ہے، تم اس کے مالک نہیں ہو جاتے ہو، بلکہ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہی رہتا ہے۔

Marfat.com

وہ نعمت تم کو عاریۃً اور عارضی طور پر عطا کی جاتی ہے، تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاؤ۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اپنی ملکیت سمجھنے لگو گے، تو تمھارے اندر فخر و غرور پیدا ہو گا اور تم دوسروں کے مقابلے میں اپنے کو افضل و برتر سمجھو گے۔ اور تمھارا نفس شیطنت کی طرف رجوع ہو جائے گا۔ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت سمجھ کر اس بات کا شکر ادا کرو، کہ اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت تم کو عطا فرمائی۔ وہ تمھارے بجائے دوسرے کو دے سکتا تھا اور تم محروم رہ جاتے۔ پس تم، لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے اس انعام و اکرام کو بیان کرو۔ اور یہ اظہار و بیان دوسروں پر فوقیت جتانے کے لیے نہیں، بلکہ بطریقِ تشکر و امتنان ہو۔ جیسا کہ فرمایا فَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (اپنے پروردگار کی نعمتوں کو ظاہر (بیان) کرو)۔ بیان کرنے کے طریقے سے ثابت ہو جائے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کیا سمجھتے اور کس نظر سے دیکھتے ہو یقیناً ہم نعمتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حق شکر بجالانے سے قاصر و عاجز ہیں۔ لیکن اپنے اس عجز کو جاننے سے تو قاصر نہیں ہیں کہ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کے اتنے انعامات و اکرامات ہیں کہ ہم ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں شکر ادا کرنے کا طریقہ بتا دیا ہے ہم اسی طرح شکر ادا کریں۔

طریقِ تشکر

اللہ تعالیٰ کا شکر تین طریقوں پر ہے۔ شکرِ قولی، شکرِ فعلی اور شکرِ مالی۔ شکرِ قولی یہ ہے کہ ہم زبان سے الحمد للہ کہتے رہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرتے رہیں کہ اُس نے ہمیں یہ یہ عام نعمتیں اور یہ یہ خاص نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ شکرِ فعلی یہ ہے کہ ہم اپنے اعضاء و جوارح و اسباب و آلات کو نعمتوں کے ساتھ اس طرح استعمال کریں جیسے خدا کی رضا ہو اور اُس کے برخلاف نہ کریں۔ اور شکرِ مالی یہ ہے کہ اپنی دولت کو اسی طریقے اور اُسی راستے پر خرچ کریں جس کا خدا و رسول کی طرف سے ہمیں حکم دیا

Marfat.com

گیا ہے۔ اپنی خواہشِ نفس کے راستے پر ہرگز خرچ نہ کریں۔[1]

نعمتوں پر اظہارِ مسرت اللہ تعالیٰ سے جو نعمتیں انسان کو ملتی ہیں انسان اُس پر خوش ہوتا اور اظہارِ مسرت کرتا ہے۔ یہ مسرت دو طریقے پر ہے۔ ایک یہ کہ جب کوئی نعمت یا دولت ہاتھ میں آتی ہے تو نعمت کے حصول پر خوشی کا اظہار کرتا ہے، اور اُس نعمت کو محبوب سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نعمت اُسے اپنے پاس روک کر رکھنے کے لیے نہیں دی گئی ہے بلکہ اُسے فوراً خدا کے حکم کے مطابق استعمال کرنا اور مصرف میں لانا ہے اس لیے اس کی یہ خوشی دیرپا نہ ہوگی۔ جس طرح اس کے حصول پر خوشی ہوئی ہے اسی طرح اُس کے فقدان و زوال پر رنج ہوگا۔ اس لیے یہ مستحسن نہیں ہے۔ دوسرا طریقِ مسرت یہ ہے کہ جب بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ملی تو وہ اس نعمت پر خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کے اس اکرام و افضال پر خوش ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے انعام کے قابل سمجھا۔ اور اللہ تعالےٰ کے اس اکرام پر عبدیت و محبت کے جذبات سے لبریز ہو کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اُس نعمت کو بطریقِ احسن خرچ کر دیتا ہے یا کام میں لاتا ہے تاکہ اُس پر بار بار انعام و اکرام فرمایا جائے۔ یہ طریقِ اظہارِ مسرت نہایت اولیٰ و افضل ہے۔ مثلاً تم کسی کو پھول پیش کرتے ہو اور

---

[1] ایک مرتبہ ہمارے اعلیٰ حضرت بیان فرما رہے تھے کہ "حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے شکر کی یہ تعریف کی ہے کہ جو نعمت عطا کی جائے اُسے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہی صرف کیا جائے"۔ اس پر اعلیٰ حضرت کے ایک خادم نے عرض کیا "حضور حقیقت تو یہی ہے جیسا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ لیکن انداز بیان اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔" ارشاد فرمایا "کہو!" اُس نے عرض کیا "حضور "شکر" یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالےٰ عطا فرمائے اُس کو بغیر کسی ادنیٰ خیانت کے ویسے کے ویسے ہی دربارِ خداوندی میں پیش کر دیا جائے۔" اعلیٰ حضرت نے اس اندازِ بیان کو پسند فرمایا اور تعریف کی (مؤلف)

Marfat.com

وہ تم سے خوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں خوش ہوتا کہ پھول کوئی قیمتی یا باقی رہنے والی چیز ہے۔ بلکہ وہ اس جذبۂ محبت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ پھول پیش کیا گیا ہے۔

ادنیٰ یا اعلیٰ انعام

جب تم نعمت کی قیمت پر نہیں بلکہ اللہ کی عطا پر خوش ہوتے ہو تو لازم ہے کہ ادنیٰ انعام میں بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کا مشاہدہ کرو۔ اگر تم مرغن لذیذ اور قیمتی غذائیں کھا کر خوش ہوتے ہو اور رکھی سوکھی روٹی کھانا تمہیں پسند نہیں ہے تو ثابت ہوگا کہ تمہاری نظر انعام واکرام پر نہیں بلکہ نعمت کی چکنائی پر ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوا۔ اگر قرب نصیب ہوتا تو تم سوکھی روٹی میں بھی اُسی عطا کو دیکھتے جو مرغن غذاؤں میں دیکھتے ہو۔ بلکہ اہل اللہ تو لذیذ غذاؤں سے خوش نہیں ہوتے کیونکہ یہ نفس کی مطلوب ہوتی ہیں۔ برخلاف رکھی سوکھی اور سادہ غذاؤں کے کہ ان سے نورانیت و شفا حاصل ہوتی ہے اور نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سادہ غذاؤں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی عطا کا مشاہدہ کرتے ہیں اور شکر بجا لاتے ہیں۔

خلق سے بے نیازی

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز کر دے لیکن اگر اللہ تعالیٰ تمہیں مل جائے تو تم تمام عالموں سے بے نیاز ہو جاتے ہو۔ تمہیں کسی کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ خدا کا فقیر وہی ہے جو سارے عالم سے بے نیاز ہو جائے۔ اگر تم نے ریش و گیسو بڑھا لیے ہیں رات دن دلق و تسبیح اور عصا و خرقہ بازی میں مصروف رہتے ہو، لیکن خدا کا وہ قرب حاصل نہیں جو تمہیں دنیا سے بے نیاز کر دے تو سمجھ لو کہ ابھی تمہاری مثال ڈھول میں پول کے سوا اور کچھ نہیں ــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مراتب تصوف و عرفان سے روشناس فرمائے، اپنا قرب نصیب کرے اور مخلوق سے بے نیاز فرما کر اپنے دروازۂ غنا کا فقیر بنا لے۔

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۰

تقلید اور تحقیق

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْکَرِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّہٖ رَءُوْفُ الرَّحِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ الْمُھْتَدِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مستقیم

نورِ عقل اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر شخص کو قوتِ عقل و تمیز و ادراک و تفہیم عطا فرمائی، جو اس ظلمت کدۂ مادیت میں اس کے لیے شمع ہدایت اور چراغ راہ ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ نے انسان کو یہ روشنی نہ دی ہوتی تو انسان اس تاریکی میں اپنا راستہ تلاش نہ کر سکتا ــ اللہ تعالیٰ نے یہ نورِ عقل ہر انسان کو فطرۃً یکساں عطا فرمایا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ نہیں۔ کیونکہ وہ عادل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُس کے عدل پر حرف آجاتا۔ لیکن ساختمان و ترکیب خلقی یا ماحول کے ماتحت اُس کے آثار و ظہور مختلف ہو جاتے ہیں۔

فانوسِ عقل اس نورِ عقل کو زمانے کی طوفانی ہواؤں سے بچانے کے لیۓ اللہ تعالےٰ نے یقین و ایمان کا فانوس بنایا۔ اور اس فانوس کی جلا اور صفا کے لیے اعمالِ خیر و عبادات مقرر فرمائے، تاکہ عالم کثرت کے گرد و غبار اور ماسوی اللہ کی کدورتیں اُسے دُھندلا نہ کر دیں۔ کیونکہ جب تک فانوس مجلا اور مصفا نہ ہو شمعِ روشن کا نور باہر نہیں نکل سکتا۔ اور اپنے

Marfat.com

حرکات وسکنات اور اعمال پر انسان کو اختیار دیا، تاکہ وہ جس طرح چاہے اپنے حالات وکیفیات کو تبدیل کر سکے۔ اور اُس کے اختیار سے اپنا تصرف اُٹھا لیا، تاکہ انسان اپنے اچھے بُرے کا خود ذمّہ دار ہو اور خدا پر الزام عائد نہ کر سکے کہ جب اُسے اختیار نہیں دیا گیا، اور وہ اپنے اعمال پر مجبور تھا تو اس سے حساب کتاب کیوں لیا جائے؟

عقلِ سلیم و عقلِ لئیم جو نورِ عقل سلامتی کے ساتھ روشن ہو، سلامتی کے ساتھ فانوس سے ظاہر ہو رہا ہو اور سلامتی کے راستے کو نمایاں کرے اُسے عقلِ سلیم کہتے ہیں۔ اس عقل کو منور ومشعشع کرنا مربّیوں کا اور اسے سلامتی پر قائم رکھنا خود انسان کا کام ہے۔ اگر وہ اپنی عقل کی حفاظت، اور فانوسِ ایمان کو مجلّا اور مصفّا رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تو، یا اس کی عقل بے نور ہو جاتی ہے یا اپنے نور کو فانوس سے باہر نہیں پھینک سکتی۔ ایسی صورت میں سلامتی کا راستہ اُسے نظر نہیں آتا۔ وہ ہلاکت کے راستے پر اندھیرے میں چلنا شروع کرتا ہے۔ اور اسی راستے کو سلامتی کا راستہ سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی عقل کو عقلِ لئیم کہتے ہیں۔

عقلِ معصوم چونکہ یہ نورِ عقل ہر انسان کو فطرۃً یکساں عطا کیا گیا ہے اس لیے ہر بچہ اپنی عقلِ انسانی میں اپنے بڑوں کے برابر ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بڑے کامل الاعضا اور تجربہ کار ہونے کی وجہ سے اپنی عقل سے بہتر کام لے سکتے اور عمدگی کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور وہ ناقص الاعضا اور ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے عمدگی کے ساتھ اپنی عقل کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل معصوم اور حالتِ فطرت پر قائم رہتی ہے۔

عقلِ معصوم پر ماحول کا اثر ابتداءً بچے کی عقل پر ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اُس کی عقل اُسی ماحول کے سانچے میں ڈھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ ابتدائی اثر بچے کی عقل پر اتنا گہرا

Marfat.com

ہوتا ہے کہ ساری زندگی اسی شکل و صورت اور نہج و حالت سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اگر ماحول سلامت اور پاک صاف ہے تو عقلِ معصوم کو سلامتی حاصل ہوتی ہے۔ اور اُس کی زندگی کا راستہ سلامتی کی طرف کھُل جاتا ہے۔ اور اگر ماحول مکدّر، گندا اور ناپاک ہے تو اس کا فانوسِ عقل دُھندلا اور دُودآگیں ہو جاتا ہے۔ جس سے نورِ عقل کی کرنیں باہر نہیں نکل سکتیں۔

ماحول کی سلامتی کے ذمّہ دار

چونکہ یہ عالم عدم سے وجود میں آیا ہے اور عدم شرِ محض ہے اس لیے اس عالم کا میلان شر کی طرف زیادہ ہے۔ اور اس کی فضا اور ماحول کو اگر اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو سلامتی سے ہٹ کر شر و ہلاکت کی طرف تیزی سے بھاگنے لگتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالٰے نے انبیاءؑ، اولیاء، صلحاء اور مفکرین یا حکماء، اُدباء، شعراء اور صاحبانِ ذوقِ سلیم کو ماحول کی سلامتی کا ذمّہ دار بنایا۔ یہ لوگ ہمیشہ اجتماعی اور قومی ماحول کو عقلِ سلیم کے لیے ساز گار بنانے کے ذمّہ دار ہیں۔ ان میں جو افراد اپنی ذمّہ داری کا احساس کرتے ہیں، وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ اور تربیت یافتہ اور قدر شناس افراد ان بزرگوں کو انسانیت اور قوم کا محسن سمجھ کر ان کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات مزیّن ہو جاتے ہیں۔

تحقیق و تقلید

بچوں کی معصوم عقل میں دو کیفیتیں نمایاں پائی جاتی ہیں۔ ایک کیفیت یہ ہے کہ بچہ جو نئی چیز دیکھتا ہے اُس کے متعلق اُس کے دل میں سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں — یہ کیا ہے؟ — یہ کیسے ہے؟ — یہ کیوں ہے؟ وغیرہ۔ اور اپنے بڑوں سے پوچھ پوچھ کر جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کیفیت کو تحقیق کہتے ہیں۔ اگر اُن کو جواب صحیح ملتا ہے تو وہ اُن کا علم ہو جاتا ہے اور اگر غلط جواب ملتا ہے تو وہ ان کا جہل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جواب نہ ملے تو وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے بڑوں کو جو کچھ کرتا ہوا دیکھتا ہے خود بھی ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اندازہ کرتا ہے کہ جس طرح یہ بڑے کر رہے ہیں آیا میں بھی کر سکتا ہوں یا نہیں ۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عقلِ تحقیق کے دو پہلو

بعض بچوں کو ایسا ماحول میسر آتا ہے جس میں وہ اپنی عقلِ تحقیق کو باہر سے پوچھ کر تسکین دیتے ہیں اور اپنے بڑوں سے سوالات کر کے معلوم کرتے ہیں کہ نظر آنے والی چیز کیا، کیوں اور کیسے ہے۔ ایسے بچے تحقیقِ ظاہر کے راستے پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اُن کی عقلِ تحقیق ظاہر سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اور بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو مددگار ماحول نصیب نہیں ہوتا۔ اُن کے قریب کوئی ایسا شفیق و مربی سرپرست نہیں ہوتا جس سے وہ سوال کر کے ظاہر سے اپنے جذبۂ تحقیق کو تسکین پہنچائیں۔ ایسی حالت میں وہ خود اپنے باطن سے سوال کرتے ہیں اور خود بخود تحقیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ چیز کیا، کیوں اور کیسے ہے؟ اور جب تک اُن کے جذبۂ تحقیق کو تسکین نہیں ہوتی غور و فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ابتداءً اُنھیں دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ باطن کا راستہ کھل جانے کے بعد باطنی تحقیق اُن پر آسان ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بتانے والا ہو یا نہ ہو وہ اپنے باطن سے سوال کر کے اپنی تحقیق کو تسکین دینے لگتے ہیں۔ ایسے بچے اپنی تحقیق کو باطن سے متعلق کرنے میں کامیاب ہو کر اُن بچوں سے بلند مرتبہ ہو جاتے ہیں جو اپنی تحقیق میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ اور یہی آگے چل کر علمی یا روحانی پیشوا، یا سائنسی وصنعتی اختراعات کے مالک ہو جاتے ہیں۔

عقلِ تقلید کے دو پہلو

اسی طرح عقلِ تقلید کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس میں بچے کی عقلِ تقلید صرف ظاہر سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنے باطن میں غور کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ماحول میں جو کام نظر آ رہا ہے وہ اچھا ہے یا بُرا۔ بس جو دیکھتا ہے

Marfat.com

خود بھی وہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے ہم تقلیدِ مبہم کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا وہ بچہ ہے جس کی عقل تقلید باطن سے بھی مدد لے سکتی ہے۔ جب اُس کو ماحول میں کوئی کام نظر آتا ہے تو اپنے باطن سے سوال کرتا ہے کہ کام اچھا ہے یا نہیں! اور جیسا باطن سے اُس کو جواب ملتا ہے اُسی طرح تقلید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نام تقلیدِ مغتنم رکھا جا سکتا ہے۔

عقل اور زندگی

چونکہ انسانی زندگی عقل کے سایے میں آگے بڑھتی ہے، عقول کے اختلافات کی بنا پر زندگیاں بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ غور کیجیے۔! ہم بعض ایسے بچوں کو دیکھتے ہیں جو شگفتہ اور متموّل ماحول میں پرورش پاتے ہیں، ماں باپ کی شفقتیں انھیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کی عقل تقلید صرف ظاہر سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول میں جو کام اپنی پسند کا دیکھتے ہیں بغیر اس کے کہ اپنے باطن میں اس کے عیب و صواب پر غور کریں تقلیداً کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کی اس تقلید میں ماں باپ کی محبّت و عنایت اور تموّل کی طاقت کار فرما ہوتی ہے اس لیے وہ آسانی سے غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اور بعض بچے وہ ہوتے ہیں جن کو اگرچہ سازگار اور خوش حال خاندان نہیں ملتا، ماں باپ کے سایے اور مربیوں کی شفقتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی عقل تحقیق و تقلید باطن سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول میں جو کام دیکھتے ہیں اُن پر خود غور کرتے ہیں کہ آیا یہ کام اُن کے لیے مفید ہے یا مضر! اور جیسا اُن کی عقل رہنمائی کرتی ہے اُسی طرح کرتے ہیں۔ ایسی زندگیاں اکثر و بیشتر ترقی کرتی اور اپنا راستہ خود تلاش کر لیتی ہیں۔

شائستگی

چنانچہ ہمارے معاشرے میں اِن دونوں زندگیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ بعض ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو اپنے آبا و اجداد کے نہایت عالی خانداں اور تموّل کے گہوارے میں پرورش یافتہ تھے مگر آج ذلت و پستی کی زندگی میں مبتلا ہیں۔ اور بعض ایسے

Marfat.com

لوگ بھی نظر آتے ہیں کہ ان کے والدین معاشرے میں کوئی بلند مقام حاصل نہ کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی تحقیقِ باطنی سے کام لیا، اور آج وہ ایک معیاری زندگی کے حامل ہیں۔ اسی کا نام شائستگی ہے۔ ایسے لوگ معاشرے کے لیے مبارک اور قابلِ تقلید ہیں۔

استخوان فروشی

جیسے پرنس ارفع الدولہ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ ایران میں یہ ایک شاہی خاندان کا یتیم بچہ تھا جس نے نقر و فلاکت میں آنکھ کھولی۔ مجبوری اور بے چارگی میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن تعلیم سے فارغ ہو کر ترقی کرتے ہوئے سفارت و وزارت کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ایسے لوگوں کو اپنی زندگی میں حاسدوں سے بالضرور سابقہ پڑتا ہے۔ ارفع الدولہ کے حاسدین بھی اُسے شرمندہ کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ عظیم جرمنی کا وزیرِ مختار تھا اُس کے حاسدوں نے ایک جلسہ کیا اور تمام ایرانی و جرمنی اُمراء و شرفاء کو موقع دیا کہ ہر ایک اپنے باپ دادا کی وجاہت اور آبائی شان و شوکت کا تذکرہ کر کے اپنی برتری ثابت کرے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے تعریفی قصائد پیش کیے، بڑھ چڑھ کر اپنی اپنی نسبی شرافت و نجابت کی مدح سرائی کی۔ اور اپنے نزدیک یہ یقین کر بیٹھے کہ ان شرفاء اور خاندانی لوگوں میں ارفع الدولہ اپنی برتری ثابت نہ کر سکے گا۔ لیکن جب اُس کا وقت آیا تو اُس نے نہایت وقار کے ساتھ کہا ـــ "معزز حاضرین! ـــ اگرچہ دو تین پشت سے اوپر میرا نسبی سلسلہ قاچاریہ شاہی خاندان سے مل جاتا ہے۔ مگر میں اُن کا نام لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میں استخوان فروش نہیں ہوں کہ اپنے اسلاف کی ہڈیاں پیش کر کے آپ لوگوں سے داد و تحسین حاصل کروں۔ میرا خاندان مجھ سے شروع ہوتا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ میری آنے والی نسل مجھ پر فخر کرے گی اور اسی طرح عزت و احترام کے ساتھ میرا نام لے گی جس طرح آپ اپنے سربرآوردہ اسلاف کا نام لیتے اور فخر کرتے ہیں۔

Marfat.com

عالی ظرفی اور بلند ہمتی

اس مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو لوگ خود' کچھ نہ ہو کر اپنے آبا ، واجداد کی برتری کا ترانہ گاتے اور اپنے نسب کے مقابلے میں دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں وہ ہرگز عالی ظرف اور بلند ہمت نہیں ہیں ۔ وہ اپنے خاندان کو بدنام کرتے اور دوسروں کے سامنے ذلیل ہوتے ہیں ۔ باپ دادا کی شرافت ، نجابت اور علویت اگرچہ فضلِ ربی تھی ، مگر ہمارے کسی کام کی نہیں ۔ نہ ہم اس کی وجہ سے دنیا میں عزت پاسکتے اور نہ قیامت میں بخشے جا سکتے ہیں ۔ نوح علیہ السلام کی نبوت اُن کے بیٹے کے کام نہ آسکی ، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے حق میں نوح علیہ السلام کی دعا بھی قبول نہ فرمائی اور لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ (وہ تمھارا اہل نہیں ہے) فرما کر اُن کی اہلیت ہی سے اُس کو خارج کر دیا ۔ اس طرح جو شخص صفات و کردار میں اپنے باپ دادا کے مرتبے پر نہیں ہے اُسے اپنے کو اس خاندان میں شمار کرنے سے شرمندہ ہونا چاہیے ۔ اگر انھوں نے عالی ظرفی اور بلند ہمتی سے کام لے کر باپ دادا کے نیک اور اعلیٰ صفات حاصل کیے ہوتے تو خود اُن کو وہی ذاتی شرافت و علویت حاصل ہوتی جو اُن کے اسلاف کو حاصل ہوئی تھی ۔ بلکہ اُن کی صفات سے اُن کے خاندان کی برتری میں چار چاند لگ جاتے ۔ دوسروں کی کمائی ہوئی دولت پر فخر کرنا اوچھا پن ہے ۔ شیر کبھی دوسرے کا شکار کیا ہوا نہیں کھاتا ۔ وہ بلند ہمت ہے خود شکار کرتا ہے اور دوسروں کا حصہ چھوڑ دیتا ہے ۔

اسلام کی نظر میں شرافت

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی یہی تعلیم فرمائی ۔ "اے فاطمہؓ ! یہ نہ دیکھو کہ تم رسولؐ کی بیٹی ہو ، بلکہ عمل کرو ، عمل کرو" ۔ انسان کے اعمال و کردار ہی اس کی شرافت کی دلیل ہیں ۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ تم میں سے شریف ، بزرگ اور قابلِ عزت و احترام وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور

Marfat.com

متقی ہے۔ یہاں بھی شرافت و بزرگی کو ذاتی عمل و کردار پر موقوف کیا ہے۔ غرض اسلام ہر فرد مسلم کو ذاتی قابلیات کا حامل اور بلند کردار کا مالک بنانا چاہتا ہے۔ اگر اسلاف پرستی سے کام لیا جائے تو اسلام کے اس نظریہ کا منافی ہوگا۔

خود اعتمادی و آزادروی

مثال کے طور پر سید جمال الدین افغانی ایک مشہور و معروف شخصیت گزری ہے۔ یہ حقیقۃً ایرانی النسل تھے۔ اُس وقت عالم اسلام میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور اختلاف و افتراق کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس انتشار و اختلاف کو وحدت ملی میں تبدیل کرنے کیلیے انھوں نے اپنے آپ کو تمام ممالک اسلامی سے منسوب و مربوط کرنے کا رویہ اختیار کیا کہ ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے 'ایرانیوں'۔۔ افغانی نام رکھنے کی وجہ سے افغانیوں' اور عرب و ترکی میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے عربوں' ترکیوں۔ افریقہ اور ہندوستان میں آنے جانے کی وجہ سے وہاں مسلمانوں کی نظر میں ایک بین الاسلامی شخصیت کے مالک ہوئے۔ انھوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں میں اسلامی اتحاد کی داغ بیل ڈالنے اور اور مشروطی (پارلیمانی) حکومت قائم کرنے کے لیے انتہائی جدّ و جہد کی اُن کی یہ کوششیں بڑی حد تک بارآور ہوئیں۔ اور آج جو کچھ آپس کی یگانگت نظر آتی ہے یہ سید جمال الدین افغانی کی پُرخلوص تحریک کا نتیجہ ہے۔ ایک دن، لندن میں، ایک انگریز اُن کے پاس آیا اور اُن کو کچھ دینا چاہا۔ انھوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا "ہم کبھی غیر سے کوئی چیز مفت نہیں لیتے"۔ وہ مایوس ہو کر وہاں کے سفیر ایران سے ملا اور کہا۔ "یہ سید جمال الدین افغانی آپ لوگوں کا ہے اور اس وقت ضرورت مند ہے۔ یا تو آپ اُس کو کچھ دیں کہ اُس کی ضرورت پوری ہو، یا میں کچھ رقم پیش کروں، آپ اُنھیں پہنچا دیں"۔ سفیر ایران نے کہا۔ "ہمیں اس بات کی اطلاع نہیں تھی؛ آپ خاطر جمع رکھیں۔ اب ہم خود اُن کے پاس جا کر اُن کی خدمت کریں گے"۔ غرض وہ کئی سو پونڈ کی رقم لے کر سید جمال الدین افغانی کی خدمت میں آئے۔ اور رقم پیش کرنی چاہی۔ انھوں نے

Marfat.com

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا "میں اس کا اتنا محتاج نہیں ہوں جتنا آپ ہیں۔ آپ اس رقم کو اپنے مصرف میں لائیں۔ شیر دوسروں کے شکار پر زندہ نہیں رہتا، وہ جہاں جاتا ہے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے خود شکار کرتا ہے۔ دوسروں کی کمائی پر نظر نہیں اُٹھاتا۔" آخر سفیرِ ایران بھی مایوس واپس چلا آیا۔ یہی وہ سید جمال الدین افغانی ہیں جنھوں نے چار دانگ عالمِ اسلام میں شہرت پائی اور بزرگی و احترام کے ساتھ نام پیدا کیا۔ اور ہر شخص ایسے نیک کاموں کی تقلید کر کے عزت و مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

کوری تقلید

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر کسی پیش رَو کے خاص کام کو اپنی تحقیق سے صحیح، بہتر اور قابلِ عمل سمجھ کر اختیار کیا جائے تو وہ ہرگز کوری تقلید نہیں ہے بلکہ تقلیدِ تحقیقی ہے۔ کوری تقلید تو وہ ہے جس کے بھلے بُرے نفع نقصان اور ہلاکت و فلاح کی تحقیق کیے بغیر آنکھ بند کر کے اس طرح اختیار کر لیا جائے کہ فلاں شخص، گروہ یا قوم ایسا کرتی ہے اس لیے ہم بھی ایسا ہی کریں۔ اس قسم کی تقلید کورانہ تقلید کہلاتی ہے۔ اور محمود نہیں ہے۔ جیسا کہ کفارِ مکہ سے پوچھا جاتا کہ آخر تم ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے کہ ہمارے باپ دادا ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ اس فعل کو اُنھوں نے خود نہیں جانا کہ کیسا ہے؟ اُن کے باپ دادا تو جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔ ان کو خود تحقیق کرنی چاہیے تھی کہ آیا یہ بُت صاحبِ اختیار اور تخلیق و پرورش پر قادر ہیں یا نہیں۔ اب اگر وہ آنکھ بند کر کے جہالت کی پیروی کرتے ہیں تو وہ اُن سے زیادہ جاہل ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تقلید سے تنگ آ کر ارشاد فرمایا ہے ؎

خلق را تقلیدِ شان بر باد داد　　　　اے دو صد لعنت برین تقلید باد

قرآنِ کریم نے بھی ہم کو، جگہ جگہ لَعَلَّکُمْ تعقلونَ۔ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ کہہ کر اشارا فرمایا ہے کہ ہم اپنے

Marfat.com

تفکر و تعقل کے ذریعہ بھی تحقیق کرنے کی کوشش کریں اور جب حق و باطل سمجھ میں آجائے تو قبول و اختیار کریں۔ اگر ہم میں تفکر و تعقل کی صلاحیت نہیں ہے تو فرمایا فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر (یعنی جاننے والوں سے) پوچھ لو۔) اس طرح جب ہم خود سے یا لوگوں سے پوچھ پوچھ کر تحقیق کر لیں گے اور اس کے بعد عمل کریں گے تو ہمارا عمل محض تقلیدی نہیں، بلکہ تحقیقی ہوگا۔

الہامی تحقیق

ہمارے اوپر کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ تحقیق کے دو طریقے ہیں ایک ظاہر سے پوچھ کر، دوسرا اپنے باطن میں غور و فکر کر کے۔ ظاہر کا طریقہ اکتسابی کہلاتا ہے اور باطن کا لدنی۔ (جو بطریقِ الہام ہوتا ہے) ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا ہے۔ لیکن الہام کا راستہ بند نہیں۔ ویسے تو الہام عام انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی ثابت ہے، بلکہ شہد کی مکھی کو وحی بھی ہوتی ہے۔ اور ہر شخص کو تقویٰ اور فجور کا الہام پہنچتا ہے۔ لیکن الہام عام اختیاری نہیں ہے فطرۃً اور بے اختیار ہوتا ہے۔ اس میں ملہم اپنے ارادے سے اپنے وقت میں الہام حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ بلا ارادہ کسی وقت خود بخود الہام ہو جاتا ہے۔ اس الہام پر ملہم کو عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ مگر جس پر وحی کا نزول ہو وہ اُس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا۔

الہامِ خاص

لیکن الہام خاص (یعنی کشف) کے مخصوص طریقے ہیں۔ جس میں اپنے اختیار اور اپنے وقت میں، اپنے باطن سے اپنے سوالات کے نامعلوم جوابات بطریق الہام حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور صاحبدلانِ باطن جو دربارِ خداوندی کی حضوری سے مشرف ہیں اسی طریقہ پر ہر بات کو اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر اس طرح معلوم کر لیتے ہیں جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو شجرِ طور سے اپنے سوالات کے جوابات ملتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس امت کے

Marfat.com

اولیاء اللہ کو یہ شرف حاصل ہے۔

تحقیقِ علمی علم حاصل کرنا بھی دراصل ایک تحقیق ہے۔ ایک بچہ حروف کی شکلیں نہیں جانتا پہچانتا تو پوچھ کر معلوم کرتا ہے۔ معنی نہیں جانتا تو سوال کرکے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مطلب نہیں سمجھتا تو سمجھ دار لوگوں سے دریافت کرکے سمجھنا چاہتا ہے۔ مقصد سے آگاہ نہیں ہوتا تو واقف کاروں سے، یا اپنی گزشتہ معلومات کی اساس سے، آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یہی طریقہ تحقیقِ علمی ہے، جس کا ہمیں ان الفاظ میں حکم دیا گیا ہے۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ۔ علم حاصل کرو خواہ تم کو چین تک سفر کرنا پڑے۔ یعنی اگر تم کو دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک سفر کرکے علم حاصل ہونے کی امید ہو تو تم بالضرور سفر کرو اور علم حاصل کرو۔

تقلیدِ علمی اگر پُرانی تحقیقات کو فقط جان کر اُس کی تقلید شروع کردیں اور اُن کے حقائق پر خود واقفیت حاصل نہ کریں تو یہ صرف (کورانہ) تقلید ہوگی جس میں بہک جانے اور راستہ غلط کردینے کا بھی احتمال ہوگا۔ اس تقلید میں اگر صحیح راستے پر ہے تو ثواب پائے گا اور غلط راستے پر ہوگا تو عذاب میں مبتلا ہوگا۔

تقلیدِ تحقیقی اور اگر پُرانی تحقیقات کو معلوم کرنے کے بعد ان کے حقائق کو خود تحقیق کرنے کی کوشش کرے گا تو اس میں بھی دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو اُس کی تحقیق صحیح ہوگی یا غلط ہوگی۔ لیکن ان پر عمل کرنے کے بعد دونوں صورتوں میں اُس کو ثواب ملے گا۔ اگر تحقیق صحیح ہے تو دوگونہ ثواب (ایک تحقیق کا اور دوسرا صحیح تقلید کا) اور اگر تحقیق غلط ہوگی تو تحقیق کا ثواب تو بالضرور مل جائے گا خواہ تقلید کا ثواب نہ ملے۔

حقائقِ کونیہ اس عالمِ کائنات میں جو چیز بھی محبوب، مقبول، مرغوب اور مطلوب یا کسی خواص کی مالک ہوتی ہے وہ محض اپنی جسامت و شخصیت کی وجہ سے نہیں

Marfat.com

بلکہ اپنی حقیقت کی وجہ سے مطلوب ہوتی ہے۔ یعنی یا تو اس میں کوئی حقیقتِ محسوسہ (سماعت، بصارت، ذوق، شامہ، لامسہ کو متاثر کرنے والی) ہوتی ہے۔ یا حقیقتِ روحانیہ (یعنی اپنی نورانیت سے روح کو متاثر کرنے والی حقیقت)۔ اگر کسی چیز میں ان دونوں حقیقتوں میں سے کوئی ایک حقیقت بھی نہ پائی جائے تو وہ اپنے وجود میں بے کار اور بے نور ہوگی اور کسی کی محبوب، مرغوب اور مطلوب یا کار آمد نہ ہوگی۔ مثلاً پھولوں میں رنگ و بو (بصارت و شامہ کو متاثر کرنے والی حقیقتِ محسوسہ ہے اور ان کی تفریح حقیقتِ روحانیہ۔ شہد، دودھ اور پھلوں میں ان کا ذائقہ حقیقتِ محسوسہ ہے۔ اور اُن کی کیفیتِ شفا، طاقت اور تفریح حقیقتِ روحانیہ اسی طرح نرم، لطیف اور پاکیزہ آوازوں کا ترنم (سماعت کو متاثر کرنے والی) حقیقتِ محسوسہ ہے اور ان کی وُجدانی کیفیت حقیقتِ روحانیہ۔ اور نسیم و صبا کی نرمی و لطافت (قوتِ لمس کو متاثر کرنے والی) حقیقتِ محسوسہ ہے اور ان کی حیات رسانی، سکون نوازی اور ترویح حقیقتِ روحانیہ۔ اسی طرح ہر چیز میں کم و بیش حقیقتِ محسوسہ اور حقیقتِ روحانیہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان کے حقائق محسوسہ کو از روے علم جاننا تحقیق علمی ہے۔ اور ان کے اثرات و واردات کو اپنے باطن تک پہنچا کر مشاہدہ کرنا تحقیق شہودی۔ ان دونوں حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ آیات الٰہی ہیں۔

تحقیق شہودی کے ذریعہ حصول معرفت

حقائقِ کونیہ کی یہ تحقیقِ شہودی ہمارے لیے معرفت خداوندی کا راستہ کھول دیتی ہے۔ جس طرح ہم نے ان کی تحقیق کی اور اُن کے اثرات کو اپنے اوپر وارد کیا، اسی طرح ہم افعالِ الٰہی میں اسماء و صفات کی تحقیق کرتے ہیں، اور ان کے اثرات کو اپنے اوپر تحقیقِ شہودی کے ذریعہ طاری کر کے جانتے پہچانتے ہیں۔ اسی کا نام معرفتِ الٰہی ہے۔

Marfat.com

اس طرح معرفتِ اسماء و صفات تک ہمیں برابر راستہ ملتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے آگے کُنہِ ذات کی معرفت میں ہمارے جملہ قوائے عقلیہ و روحانیہ عاجز ہو جاتے ہیں۔ اور جب اس کے شہود کے لیے کوئی سبیل نہیں ملتی تو اپنا عجز محسوس کرتے ہیں۔ اور یہی احساسِ عجز وہ حقیقتِ معرفت ہے جس کے متعلق فرمایا گیا۔ اَلْمَعْرِفَۃُ عِجْزٌ مِنَ الْاِدْرَاکِ۔ کُنہِ ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانا ہی حقیقتِ معرفت ہے۔ جب سالک اس معرفت کے تحیّرِ عمیق میں مستغرق ہو جاتا ہے تو اُس کی اس حالت کو "کفرِ حقیقی" یا "حیرتِ مستحسن" یا "نورِ سیاہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حالت عرفان کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ ظلمتِ کفرِ مجازی، اور تحیّرِ مذموم سے، جو غفلت اور جہالت کا نتیجہ ہے، جداگانہ ہوتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو اس مرتبۂ معرفت تک رسائی عطا فرمائے۔

وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۱

مراقبہ اور بیداری شعور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

مراقبہ اصطلاحِ طریقت میں اپنے حواس کی نگہبانی کر کے اپنی توجہ کو اپنے باطن میں لے جانا مراقبہ کہا جاتا ہے۔ مراقبہ میں پہلا قدم خارجی محسوسات کا دروازہ بند کرنا ہے کیونکہ خارجی محسوسات ہماری توجہ کو اپنی طرف اس طرح جذب کر لیتے ہیں کہ وہ باطن کی طرف رجوع نہیں ہو سکتی۔

ظہور کا سیلان اللہ تعالیٰ نے کائنات کو عدم سے وجود، غیب سے شہود اور باطن سے ظاہر کی طرف اس طرح جاری فرمایا ہے جس طرح زمین سے پانی کا چشمہ تیز بہاؤ کے ساتھ اوپر کی طرف اُبلتا ہے۔ اب اگر کوئی چیز اُس چشمہ کے دہانے پر ڈالی جائے تو وہ اس چشمہ میں نیچے جانے کی بجائے پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ اوپر کی طرف اُبل آئے گی۔ اور جب تک اُس بہاؤ کی طاقت سے زیادہ وزن اُس چیز میں نہ ہوگا وہ نیچے نہ جا سکے گی۔ یہی حال ہماری توجہ کا ہے کہ اگر ہم اسے اپنے باطن کی طرف لے جانا چاہیں تو باطن سے ظاہر کی طرف اُبل کر آنے والا تیز بہاؤ توجہ کو ظاہر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اور ہم اپنی

Marfat.com

توجہ میں اتنا وزن نہیں پاتے ہیں کہ وہ باطن میں ڈوبتی چلی جائے۔

پیر کی توجہ اس مشکل کام کو آسان کرنے کے لیے ہم کو ضروری ہے کہ ہم پیر کی توجہ سے اپنی توجہ کو باندھ دیں۔ پیر کی توجہ اتنا وزن حاصل کر چکی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے باطن میں ڈوب سکتی ہے۔ اگر ہم اپنی توجہ کو پیر کی توجہ سے مضبوط باندھ دیں گے تو اُس کے ساتھ ہماری توجہ بھی باطن میں ڈوبتی چلی جائے گی۔ اور یہ کام آسان ہو جائے گا۔

ارتباطِ شیخ اپنی توجہ کو پیر کی توجہ کے ساتھ باندھ دینا ربطِ شیخ کہلاتا ہے (ارتباط کے معنی باندھنا ہیں) مرید کی توجہ' حواسِ عشرہ میں سے ایک ایک حس کے ذریعہ پیر کے حواس کے ساتھ ربط پیدا کرتی ہے۔ یعنی سماعت کے ذریعہ سماعت سے ——— اور بصارت کے ذریعہ بصارت سے، اسی طرح شامّہ' ذائقہ' لامسہ' حسِ مشترک' متخیلہ' متوہمہ' متذکرہ اور حافظہ کے ذریعہ پیر کے اِن ہی احساسات سے بندھ جاتی ہے۔ تو اس کے احساسات میں پیر کے احساسات کارفرما ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ پیر کے احساسات اُس کے احساسات سے قوی اور غالب ہوتے ہیں' اس لیے مُرید کے احساسات مقہور و مغلوب ہونا شروع ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ مرید کے احساسات پیر کے احساسات میں اس طرح مستحیل ہو جاتے ہیں جس طرح شکر دُودھ میں تحلیل ہو کر مفقود ہو جاتی ہے، یا جس طرح ظلمت کا تصوّر نور کے تصوّر میں گھل کر غائب ہو جاتا ہے۔ اور جب اس استحالہ میں کمال حاصل ہو جاتا ہے تو "فنا فی الشیخ" کے پہلے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر شیخ کے کمالات و عجائبات کو مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے ظاہر کو ظاہر شیخ اور اپنے باطن کو باطنِ شیخ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت اُس کی صورت اُس کے کردار اور اُس کے افعال' اُس کی نظر سے ساقط ہو جاتے ہیں' اور پہلی مرتبہ اُسے فنائیّت کی لذت حاصل ہوتی ہے۔

Marfat.com

تصورِ شیخ جب مرید کے احساسات پیر کی ذات میں اس مقامِ فنائیت تک پہنچتے ہیں تو اُسے پیر کے ذریعہ بقا عطا کی جاتی ہے۔ اور وہ پیر کے باطن کی طرف اس طرح متوجہ ہوتا ہے جس طرح اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اور چونکہ وہ پیر کے احساسات میں بقا حاصل کر چکا ہے اس لیے وہ پیر کے باطن کو اپنا باطن سمجھ کر سیر کرتا ہے۔ اس سیر میں وہ ایسے انوار کا مشاہدہ کرتا ہے جو اُس کے موجودہ احساسات پر غالب آجاتے ہیں۔ اور وہ مشاہدۂ انوار میں اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتا ہے کہ تصورِ شیخ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہی انوار اُسے ذاتِ رسالتؐ تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ جمالِ رسالتؐ کا اس طرح مشاہدہ کرنے لگتا ہے جیسے رات کی تاریکی میں "عالمِ ماہتاب" اور یہاں وہ ایک عجیب فرحت، خوشی، سرور اور والہانہ شیدائیت محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیات اُسے رسالتؐ کا شعور عطا کرتے ہیں اور جب وہ اِن میں فنا حاصل کرتا ہے تو "فنافی الرسول" کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس مرتبے میں بقا حاصل ہونے کے بعد "فنافی اللہ" کا مرتبہ ہے جو بلند ترین حالتِ مراقبہ ہے۔ یہاں تمام صور و اشکال ساقط ہو جاتے ہیں۔ تمام شہود و حضور ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک حالتِ غیاب طاری ہوتی ہے۔ یہ مرتبہ "فنافی اللہ" ہے۔ اسی کو وصل سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں ؎

او در من و من در وے چوں بُو بہ گلاب اندر

مسیحی سالکوں کا اعتقاد یہی وہ مرتبۂ فنا ہے جس کو مسیحی سالکین "حالتِ اتحاد" یا "مراقبۂ اتحاد" یا "اتحادِ محبت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ اس حالتِ اتحاد میں سالک کی روح نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے مگر خدا اس رُوح میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ ہوش آنے کے بعد اُسے کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ خدا اُس کے اندر تھا، اور خدا اُس کی ہستی میں موجود تھا۔ یہ حالت خواہ آئندہ کبھی حاصل ہو یا نہ ہو اُن کا

Marfat.com

یقین متزلزل نہیں ہوتا کہ اس کی روح کو خدا سے اتحاد نصیب ہوا تھا۔ نیز عیسائی رہبا ر کہتے ہیں۔ "اگر کوئی یہ کہے کہ جس حالت میں نہ احساس تھا نہ عقل و شعور کی گنجایش تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی روح خدا سے متحد تھی؟" تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ "اس حالت کے گزر جانے کے بعد سالک حالاتِ واردہ کے اثرات کو اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے انسان جاگنے کے بعد اپنے خواب کو۔ اس لیے اس کا یقین راسخ ہو جاتا ہے کہ اُسے معیتِ الٰہی سے سرفراز کیا گیا تھا۔"

فنائے مطلق لیکن صوفیائے اسلام کے نزدیک یہ مقام آخر نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد ایک اور مقام "فنائے مطلق" کا آتا ہے۔ اور اسے "فنا فی الذات" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اب تک سالک نے جو کچھ فنا و بقا حاصل کی تھی وہ اسماء و صفات میں تھی۔ اب اُسے ذات میں فنا و بقا حاصل ہوتی ہے جہاں سالک کو بیداریِ شعورِ کونی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس بقا و بیداری کو دوام ابدی اور قیامِ جاوید حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ مکاشفہ سے ارفع و اعلیٰ ہے، کیونکہ مکاشفہ کو دوام نہیں ہوتا۔ اس شعور کونی کو سمجھنے کے لیے شعور کی جملہ اقسام پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

شعور اپنی عقل و فہم کے ذریعہ اشیاء کی حقیقت کو سمجھنا اور اچھائی برائی، بلندی و پستی، خیر و شر، عذاب و ثواب وغیرہ کے اعتبار سے اس کا معیار مقرر کرنا شعور کہلاتا ہے۔ شعور کی بنیاد عقل و فہم پر ہے، خواہ یہ علم و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہوئی ہوں یا غور و فکر کے ذریعہ۔

شعورِ حیوانی اسی لیے حیوانات کو شعور سے معریٰ سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ بعض حیوان میں بعض شعور کا اظہار انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض حیوان ایسے شعوری کارنامے بجالاتے ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔ لیکن محققین نے اس کو صرف اس لیے حدِ شعور میں داخل نہیں کیا کہ "شعور" عقل و فہم کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ جہاں عقل و

Marfat.com

فہم نہ ہو وہاں شعور کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ حیوانوں میں عقل و فہم بھی ہوتی ہے۔ اور ایسی ہی ہوتی ہے جیسی انسان میں لیکن وہ صرف کلام و بیان سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس لیے حیوانیت میں مبتلا ہیں۔ محققین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حیوانات میں عقل و فہم کا وجود تسلیم کریں تو حیوانِ ناطق اور حیوانِ مطلق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ کیونکہ نطق و کلام کا منبع و مخرج عقل و فہم ہے۔ اگر حیوانات عقل و فہم ہوتی تو وہ نطرتِ حیوانِ مطلق سے نکل کر نطرتِ حیوانِ ناطق میں داخل ہو جاتے اور اُن کی قوتِ مدرکہ ناقصہ کمال کو پہنچ کر نطق اختیار کر لیتی ۔ حیوانات کے یہ اہم کارنامے شعوری نہیں، بلکہ حسّی ہیں۔ انسان جو کام اپنے شعور سے کرتا ہے حیوان اُسے اپنی حسّ قوی سے انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے حیوانات کو شعور کے بجائے احساسِ قویّہ عطا فرمائے ہیں۔ مثلاً انسان کی بصارت اتنی قوی نہیں جتنی چیل، شکرے اور باز کی ہوتی ہے۔ اس کی سماعت اتنی قوی نہیں جتنی شیر، بلی اور درندوں کی ہوتی ہے۔ شامّہ اتنا قوی نہیں جتنا کُتّے اور چیونٹیوں کا۔ لامسہ اتنا قوی جتنا ہاتھی اور بندر کا۔ اس لیے یہ حیوانات اپنے احساساتِ قویّہ کے ذریعہ قبل اس کے کہ عقل کی رہنمائی نصیب ہو ایسے ایسے کام کر گزرتے ہیں جو انسان باشعور ہونے کے بعد بھی نہیں کر سکتا (مولانا رومؒ نے اس کی مثال میں ایک ریچھ کا قصہ لکھا ہے جو اپنے مالک کو سونے کے وقت پنکھا جھلا کرتا تھا۔ ایک دن وہ پنکھا جھل رہا تھا اور ایک مکھی بار بار مالک کے منھ پر آکر بیٹھ جاتی تھی۔ کئی مرتبہ اُڑانے کے بعد جب پھر آکر بیٹھی تو ریچھ نے غصّہ ہو کر ایسا پنجہ مارا کہ چہرے کا گوشت تک نوچ لیا۔ ریچھ نے اپنے احساسِ قویّہ سے کام لیا۔ لیکن شعور نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مالک کو نقصان پہنچایا) چنانچہ محققین کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ شعور کے لیے عقل و فہم ضروری ہے۔ اسی لیے وہ ناسمجھ بچوں کو صاحبِ شعور نہیں کہتے۔ اور جب علم و تجربہ کے ماتحت عقل کو بلوغ حاصل ہوتا ہے تو اُس پر شعور کا اطلاق کرتے ہیں۔

Marfat.com

تحت الشعور شعور کے ماتحت لاشعور میں ایک عکسِ شعور پایا جاتا ہے جو عادۃً بغیر تفکر کے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس حالت میں انسان کام کرتے وقت نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہے۔ بلکہ عادۃً اس کام کو سرانجام دیتا ہے۔ اور جب اس کام سے فارغ ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُس نے لاشعور میں یا تحت الشعور اس کام کو انجام دیا ہے۔ مثلاً ایک شخص بے توجہی سے نماز کی نیت کرتا ہے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر خارجِ نماز کے فکر و تصور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں وہ قرات کرتا ہے، رکوع و سجود بجا لاتا ہے لیکن خارج نماز کا تصور اس پر یکساں محیط رہتا ہے وہ عادۃً نماز ختم کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ کیونکر نماز پڑھی۔ یہی تحت الشعور یا لاشعور ہے۔ یہ لاشعور دراصل شعور کا خزانہ ہے۔ جو امورات شعور میں وقتاً فوقتاً گزرتے رہتے ہیں وہ اس میں پہنچ کر ذخیرہ ہوتے رہتے ہیں۔

شعورِ خودی یہ ایک ایسا شعورِ علمی ہے جو انسان کو اُس نے مرتبے کے موافق خود شناس بناتا ہے۔ یعنی انسان جیسا ہوتا ہے ویسا ہی خود کو سمجھتا اور پہچانتا ہے۔ اگر مرتبۂ حیوانیت پر ہے تو خود کو حیوان سمجھتا ہے، انسانیت پر ہے تو انسان، مَلکیّت پر ہے تو فرشتہ سمجھتا ہے اور جیسا سمجھتا ہے ویسے ہی صفات کا اُس سے ظہور ہوتا ہے۔ ان مرتبوں پر انسان کی انانیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس کی انانیت انفرادی اور فانی ہے اس لیے یہ خودی اور اس کا شعور بھی فانی ہوتا ہے۔ (اس سے اقبالؔ کی خودی مراد نہیں، جو شعورِ سرّی کا مقام ہے)۔ جب وہ اس شعورِ خودی سے آگے ترقی کرتا ہے تو شعورِ انسانی حاصل ہوتا ہے۔

شعورِ انسانی یہ وہ شعور نوعی ہے جو انسان کی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت میں داخل کر دیتا ہے۔ اس وقت انسان فردِ واحد نہیں بلکہ خود کو ایک عالمِ انسان سمجھتا ہے، اور جانتا ہے کہ کائنات میں جس قدر انسان ہیں کافر، مومن، مشرک، ایرانی،

Marfat.com

تورانی، افغانی، ہندی وغیرہ سب اُس کے اعضا و جوارح، یا وہ خود اس کل کا ایک جزو ہے اس شعور میں انسان کو ایک بلند ہمت اور وسعت نظر حاصل ہوتی ہے اور بقائے نوعِ انسانی اور اُس کی امن و سلامتی کے لیے اپنی زندگی صرف کر دیتا ہے۔ جب اس شعور سے بھی آگے ترقی کرتا ہے تو اُسے شعورِ کونی حاصل ہوتا ہے۔

شعورِ کونی

یہ شعور عالمِ انسانیت سے وسیع ہو کر عالم کائنات کی وسعت عقلی تک پھیل جاتا ہے، اور اپنی ہستی کو کائنات کے ذرّے ذرّے پر چھایا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اُس کی روحانی تنویر حدود نوعی سے گزر کر آفاقِ کائنات کو روشن و متجلّی کر دیتی ہے۔ اُس پر حقائقِ روحانیہ منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ اس آئینۂ شعور میں کائنات کے ہر ذرے کو پیشِ نظر دیکھتا ہے۔ اُسے اپنے نفس و جسم پر پورا قابو ہوتا ہے۔ اُس کی قوتِ ارادی جملہ مقتضائے فطرت پر غالب آتی ہے اور تمام احتیاجاتِ دینی و دنیاوی اُس کی نیاز مندانہ بے نیازی پر قربان ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس کو وہ اخلاقی رفعت عطا کی جاتی ہے جو روحِ اعظم کے ذریعہ قدرت کاملہ کے سرچشمے سے سیراب اور خیرِ مطلق کے مرکز سے مربوط و سرشار ہوتی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ ایسی ثابت و قائم شخصیت پر نہ خارجی اثرات مسلط ہو سکتے ہیں، نہ کوئی روحانی عامل اُسے اپنا معمول بنا سکتا ہے۔ کیونکہ معمول کو مغلوب و متاثر کرنے کے لیے عامل کا اُس سے زیادہ قوی العمل ہونا لازمی ہے۔ اور چونکہ ہر عامل کا شعور خودی صاحبِ شعورِ کونی کے روحانی ضابطۂ قدرت سے بدرجہا کمتر ہوتا ہے، اس لیے ہر عامل خود اس کا معمول بن جاتا ہے۔)

شعورِ کونی میں مقامِ رسالتؐ

صاحبِ شعورِ کونی جملہ موجودات نظم و نسق میں ایک تنظیم اور توحید اثباتی پاتا ہے۔ وہ ہر شے میں ایک ہی نور کا جلوہ دیکھتا ہے اور اُس کی واحدیت کا اقرار کر کے مقامِ رسالت سے آشنا

Marfat.com

ہو جاتا ہے۔ اسی مقام پر اُسے معرفتِ رسولؐ حاصل ہوتی ہے۔ یہ انتہائی ادب کا مقام ہے یہیں قلم کو ادب کی تاکید کی جاتی ہے۔ تَاَدَّبْ یَا قَلَمْ! یہاں کامل ہوش و حواس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہاں کی ادنیٰ شرعی لغزش ذاتِ احدیت و صمدیت کو گوارا نہیں۔ اس مقام کا ادب و عجز ہی انسان کو مزید وسعتِ نظر عطا کرتا ہے اور یہ شعورِ کونی شعورِ سرّی میں تبدیل ہوتا ہے۔

شعورِ کونی کا دائرہ

شعورِ کونی کا دائرہ دیگر مذکورہ شعورات پر محیط ہوتا ہے۔ اور کوئی شعور سوائے شعورِ سرّی کے اس کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

اور جب صاحبِ شعورِ کونی روحِ اعظم کے بحرِ بے کراں سے مل کر وسعتِ انبساطی حاصل کرتا ہے تو عالمِ تکوین کو اس کے انتہائی آفاق کے ساتھ اپنی ذات میں اس طرح دیکھتا ہے جس طرح سمندر اپنی کائناتِ بحری کو مشاہدہ کرتے ہوئے اپنی پہناوری کا احساس کرتا ہے۔ اور وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مافوق ایک فضا (ہبائے محیط) اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جس سے اُس کو ربطِ کامل ہے۔

بحری مخلوقات

بحری مخلوقات دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو سمندر کی تہ میں زندگی بسر کرتی ہیں اور اپنے زعم میں یہ خیالِ باطل قائم کر لیتی ہیں کہ سمندر کے سوا اور کوئی دوسری فضا نہیں ہے، جو کچھ ہے سمندر ہے۔ اس لیے وہ سمندر کو لامحدود سمجھتی اور اُس فضا سے جو سمندر کو محیط ہے بے علم و بے فیض رہ جاتی ہیں۔ یہ مثال اُن صاحبانِ شعورِ کونی کی ہے جو روحِ اعظم تک نہیں پہنچتے بلکہ کائنات میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری بحری مخلوق وہ ہے جو سطحِ بحر سے عمق اور عمق سے سطح تک نزول و عروج کر کے اس وسیع تر فضا کو بھی ادراک کرتی اور اُس سے ربط پیدا کرتی ہیں، جو اس سمندر پر ہر طرف سے محیط ہے۔ وہ اس پہلی مخلوق سے اپنے علم و ادراک کی بنا پر افضل ہیں۔ اور یہ مثال اُن صاحبانِ شعورِ کونی کی ہے جو کائنات کے شعور کے روحِ اعظم تک (جس کو نورِ اول، عقلِ کل اور نفسِ کائنات بھی کہتے ہیں۔ اور جس کے مختلف اعتبارات کی بنا پر تقریباً ۵۲ اسمائے گرامی ہیں)

Marfat.com

رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اور جب وہ اپنے ادراک و شعور میں مرتبۂ کمال پر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ روحِ اعظم یا عقلِ کل جو جملہ کائناتِ ارضی و سماوی بلکہ عالمِ ملکوت کو بھی محیط ہے خود لا محدود و لامتناہی نہیں ہے، بلکہ ایک اور ذات اُس کو اپنی آغوشِ احاطت میں لیے ہوئے ہے جو تمام کمالات کے مصدر اور اطلاقیت کی مخزن ہے۔ اس لیے وہ اُس کے سامنے اپنے عجز ادراک کا اظہار کرتی ہے اور سر جھکا کر اُس کی ربوبیت کا اعتراف کرتی ہے۔

شعورِ سرّی مراقبے کے اس انکشاف یا حالت و مقام کو شعور کی حد میں داخل رکھنا یا لاشعور کی تہ میں ڈھکیل دینا ہمارا کام نہیں۔ ہم تو لاشعور کو بھی شعور ہی کی منفی تعریف میں داخل کرکے اس کا نام شعور ہی رکھتے ہیں۔ اس مقام پر شعور کونی کا حامل انسان کائنات کے ایک ایک ذرّہ میں زندہ، قادر اور بااراده ہستی کو محیط اور حکومت فرما دیکھتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ یہ کائنات، جامد اور بے جان مادّے کی خود نمائی نہیں اور نہ اتفاقات کی کارفرمائی ہے۔ بلکہ بلکہ کسی قادرِ مطلق کی قدرت اور محبوبِ ازلی کی محبّت اور اُس کے استیاقِ رحمت نے کائنات کے ذرّے ذرّے اور مخلوقات کی نوع نوع میں سلاسل کی منفرد کڑیوں کی طرح باہم اتصال و ارتباط پیدا کر کے نظمِ عالم کو استوار کیا ہے۔ اور اسی محبتِ مسلسل نے تکوینی فلاح و بہبود کے لیے عالمِ غیب و شہادت کو ایک دوسرے کا معاون اور ہم آہنگ بنا دیا ہے۔ پس عالمِ تکوین کی حقیقت یہی ربطِ مسلسل ہے اور ارتباط و تسلسل ہی ہر ابتدا کو بہتر اور کامل تر انجام تک پہنچانے کا ضامن ہوتا ہے۔

رمزِ اطلاق جب انسان شعورِ سرّی میں قدم رکھتا ہے تو عقل کو خیرباد کہہ کر دائرۂ شعورِ کونی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے ہم شعورِ سرّی کو حدِّ شعور میں داخل کرنے کے لیے منفی تعریف سے کام لیتے ہیں۔ اگر یہاں بھی عقل سے کام لیا جائے تو شعورِ کونی کا وسیع و عریض بیابان شعورِ سرّی کے راستے سے اُسے ہٹا کر گمراہ کر دیتا ہے۔ یہاں تمام شعورات فانی ہو کر مابعد الممکنات

Marfat.com

ایک سِرّ وجوب اور رمزِ اطلاق میں اس طرح مقہور و مغلوب ہو جاتے ہیں کہ آثارِ کثرت فنا فی الوحدت اور جملہ تعینات لاتعینی کی طرف رجوع کر جاتے ہیں۔ اسی مقام پر فعلِ تخلیق کا ظہور ہوا تھا۔ یہی مقام کثرت کا مصدر، ظہورات کا مرجع اور بے ہمگی کا مخزن ہے۔ یہ غیر متغیر ہے۔ اب بھی اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھا۔ صاحبِ شعورِ سرّی جب اس عالم میں داخل ہوتا ہے جہاں "کن فیکونی" امر کی حکومت ہے، جہاں حیات اپنے علم و قدرت و ارادۂ مطلقہ و مشیئتِ کاملہ کے ساتھ کار فرما ہے، تو وہاں خواہش حیات جو مظہرِ احتیاج ہے باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ حیاتِ فانی، یا زندہ رہنے کی خواہش دامنِ حیاتِ ابدی میں پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہے۔ اور کوششوں، جستجوؤں اور آرزوؤں کا تموج ساحلِ مراد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انقطاعِ آرزو کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ یاس و ناامیدی، تشکک و تردد، قنوطیت اور لایعنیت کا زیر و بم، مسرتوں کی سیماب وشی، عقل کی تہی دامانی اور ممکنات کی فریب نظری بحرِ وحدت میں غرق ہو جاتی ہے۔ اور سالک تسلیم و رضا کی آغوش میں آکر، اطمینانِ ابدی اور سکونِ سرمدی کا تاجدار بن کر، سرِّ ظہور و بطون کا محرم ہو جاتا ہے۔

نتائجِ حاصلہ ہمارے اس بیان سے اقسامِ شعور کے ماتحت مختلف ادیان و ملل کا مرتبۂ عروج و نزول واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو تحت الشعور میں مبتلا ہیں زنجیر میں بندھے ہوئے غلام کی طرح ہیں جو اپنے حرکاتِ ارادی کا بھی ذمہ دار نہیں۔ اور وہ لوگ جو شعورِ خودی میں گرفتار ہیں اعلیٰ درجۂ انسانیت پر فائز نہیں بلکہ مرتبۂ حیوانیت سے نکل کر مینڈک کی طرح اپنی چاہِ خودی میں گرفتار ہیں اور آسمانِ انسانیت کو کشادہ نظری سے نہیں دیکھ سکتے۔ صاحبانِ شعورِ انسانی مرتبۂ انسانیت پر تو فائز ہیں یعنی اپنی صفاتِ مافوق الحیوانیت کو مشاہدہ تو کرتے ہیں، مگر اعلیٰ مقامِ عبدیت جو انسانیت کا

Marfat.com

منتہا ہے نہیں پہنچتے ۔ اب رہے صاحبانِ شعورِ کونی ۔ تو اگر وہ بحرِ کائنات میں مقید و محدود ہیں تو وہ گوتم بُدھ اور موحدانِ غیر مسلم کی طرح اسی روحِ اعظم کو جس کی تہ میں وہ گم ہیں خدا تصور کرتے اور اسی کی پرستش بجا لاتے ہیں ۔ اور اگر وہ بحرِ کائنات سے باہر صرف نورِ رسالتؐ تک پہنچے ہیں اور اسی میں محدود ہو کر اُسی کو رب الارباب سمجھتے اور اُسے باپ، بیٹا، رُوح القدس سے تعبیر کرتے ہیں وہ عیسوی، موسوی یا دیگر ادیان ہیں جو معرفتِ خداوندی سے محروم راستے میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں ۔ ہاں، شعورِ کونی کا وہ "سب سے بلند مرتبہ" جو عالمِ تکوین میں رہتے ہوئے ذاتِ مطلق کا قرب حاصل کرتا ہے کامیاب و بامراد اور فائز المرام ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس مرتبہ شعورِ کونی کا حامل انسان، نورِ اول کی حد تخلیقی و مُلکی کے مرکزی عمق میں غوطہ لگاتا پھر حدِ لطافتِ محیط یعنی سطحِ ملکوتی وامری تک عروج کر کے ہبائے بسیط الوہیت کو مشاہدہ کرتا ہے ۔ ایسے صاحبانِ شعورِ کونی حقیقت سے حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی شہودی نگاہ اٹھاتے ہیں اور شعورِ سرّی میں عروج و سیر کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔ وہ بیک نظر خلق کے پردے میں رہ کر خالق کو دیکھتے، اور اُن کی نگاہِ شہود بحرِ روحِ اعظم سے اُبھر کر ہبائے لامتناہی الوہیت میں غوطہ لگاتی ہے ۔ اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ بحرِ روحِ اعظم کی حیات، علم، قدرت، ارادہ، سماعت بصارت اور کلام سب اسی ہبائے عالمِ اطلاقِ ازلی و سرمدیِ الوہیت سے نزول کر کے بحرِ روحانیت نورِ اول کو تموج میں لاتے اور مظاہر امری و خلقی کی وجود بخشی فرماتے ہیں ۔

کامل اور مکمّل شعورِ کونی سے گزر کر شعورِ سرّی میں پہنچنے والے اولیاء اللہ مردانِ کامل تو ہوتے ہیں، مگر ابھی ان کو ایک اور مقام تک پہنچنا باقی رہتا ہے ۔ جس کو بعض عروج اور بعض نزول کہتے ہیں ۔ کیونکہ، اگرچہ وہ کامل ہیں مگر مکمّل نہیں ۔ اس مقام کا خاصہ یہ ہے کہ وہ صاحبِ مقام کی زبان کو گونگی کر دیتا ہے ۔ مَنْ عَرَفَ اللّٰہُ فَقَدْ کَلَّ لِسَانُہٗ ۔

Marfat.com

(جس نے خدا کو پہچانا اُس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے) اُن کی زبان اس لیے گونگی ہو جاتی ہے کہ اُن کی زبان سے متکلم حقیقی کلام نہیں کرتا۔ اور جب وہ "ربِّ نطق" زبانِ عبد سے کلام کرنے لگتا ہے تو دوسروں کے لیے بھی تکمیل ہو جاتا ہے، یعنی اپنے متبعین کو شعور کونی کے ذریعہ سیر کرا کے عرفانِ حق تک پہنچا دینے پر مامور کیا جاتا ہے۔ اور وہ سیر نزولی کر کے عام انسانی زندگی میں اس طرح قائم ہو جاتا ہے کہ بظاہر کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور وہ "بشرِ متکلم" کا جال بچھا کر دلوں کا شکار کرتا اور خدا کے دربار میں پیش کرتا رہتا ہے۔

ذرایع عقلی اکثر فلاسفہ اس مقام کی بعض نشانیوں اور آثارِ عقلی کا اکتسابی انکشاف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنے لنگ استدلال اور دھندلے نظریات کی کمان سے موہوم نشانہ پر تیر اندازی کی مشق میں وقت ضایع کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ۔" عمر بہ آخر رسید و نشانے از مقصود نہ دید"۔ کے صحیح مصداق بن جاتے ہیں ــــ یہ فلاسفہ اور سائنسداں حقائقِ اشیاء سے نزدیک تر ہونے اور ہر ذرّے میں وجود واحد کی تلاش کرنے کیلیے ایٹم توڑ ذرایع سے ترقی کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہنوز مقصود اُسی طرح دُور ہے جس طرح بعض مذاہب و ادیان کے اصفیاء اس شعورِ سرّی کی تلاش میں ریاضات و مجاہدات کرتے ہیں اور اپنی انتہائی بلندیِ شعورِ تکوینی پر پہنچ کر یہی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؏

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اور یہی ذرایع عقلی کی انتہائی معراج ہے۔

ذرایع حسّی اور یہی حال حسّی ذرایع کا ہے کہ آثارِ قدرت کے بعض مناظر، وادیِ کوہسار کے قدرتی نظارے، یا بلند و بالا چوٹیوں کی برفانی فضائیں عارضی طور سے شعورِ انسانی کو عالمِ فراموشی میں جذب کر کے قیدِ تفکرات سے رہائی بخشتی ہیں۔ یا ایک انبساط پسند

Marfat.com

یا فلسفی موسیقی کے ذریعہ راگ و ترنّم کے لطیف زیر و بم میں مستغرق ہو کر اپنی انفرادیت سے باہر آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالمِ وحدت میں سرشار ہے اور ساری کائنات اُس کے ساتھ رقص و تواجد میں مشغول ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ بزرگانِ سلف کی ارواحِ طیبہ کو بھی اپنی مجلس میں، یا خود اُن کی مجلس میں، حاضر و موجود محسوس کریں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ان کی انفرادیت وقتی طور پر سماع کے ذریعہ مرتفع ہو جاتی ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے وہ تنگنائے شعورِ انسانی سے نکل کر شعورِ تکوینی یا پہنائے عالمِ روحانی میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور غلطی سے اس مقام کو احدیتِ الوہیت تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کا شعورِ کونی فی الوقت بیدار ہو جاتا ہے جسے وہ شعورِ سرّی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہی غلط فہمی ان کو شریعت و طریقت کے خلاف بعض الفاظ یا معاملات کا مرتکب بناتی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی مردِ مکمّل سے مدد لیں تو وہ اُن کو اُن کے صحیح مقام سے مطّلع کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ خود کو شعورِ سرّی کے انتہائی مقام پر فائز سمجھتے ہیں حالانکہ اُن کا اصل مقام شعورِ خودی سے بلند نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ کسی کے سامنے جُھکنا گوارا نہیں کرتا۔ نیز ابھی وہ اپنے نفس کے کمالِ تزکیہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے حدیثِ نفس اور مقامِ توہّم میں اُلجھے رہتے ہیں اس لیے اُن کو شعورِ سرّی کی طرف عروج کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔

یقینِ مشہود وہ استدلالی فلاسفہ جو کہتے ہیں کہ "فلسفہ" کو خدا اور رُوح کی حقیقت کا علم حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دینی چاہیے۔ کیونکہ یہ امور ان کے حدودِ علم سے ماوراء ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا علم و عقل و ادراک عالمِ تکوین سے ماوراء نہیں پہنچتا۔ عقل و ادراک محسوسات سے باہر کی چیزوں پر کار فرما نہیں۔ حواسِ عشرہ کی تنگ حدود روح کی وسعتِ امکانی یا ذاتِ مطلق کے اطلاقِ بے پایانی کو کیونکر سمیٹ

Marfat.com

سکتی ہے۔ ہاں، ایک صوفی عارف جو اپنے احساسات کی حدود سے گزر کر شعورِ کونی سے شعورِ سرّی تک پہنچا ہو، اس حقیقت الحقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اسے وہ یقینِ مشہود حاصل ہوتا ہے جسے کوئی طاقت کوئی دلیل شبہات میں نہیں بدل سکتی۔ اُس کو جیل میں بند کر سکتے ہیں، دیوانہ کہہ کر پاگل خانے بھیج سکتے ہیں، یا صلیب پر چڑھا سکتے ہیں، مگر اُس کے وارداتِ روحانی کو مسدود اور مشاہداتِ سرّی کو نہیں روک سکتے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۲

استعداد و مراتب کمال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حرکت و رفتار کائنات، اور کائنات کے اندر جو شے ہے وہ متحرک ہے اور کوئی چیز جامد اور غیر متحرک نہیں۔ (یہ قرآن نے تقریباً چودہ سو برس پیشتر فرما دیا تھا) اور آج کی ترقی یافتہ سائنس جمادات کے ایک ایک ذرّے میں طاقت اور حرکت کا مشاہدہ کر کے اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ جمادات و نباتات میں فطری، یعنی غیر ارادی حرکت و رفتار ہوتی ہے اور حیوانات میں ارادہ و اختیار کے ساتھ۔ اس حرکت کے علاوہ ہر شے اپنی فطرت کے مطابق اپنے خاص مقصد کی طرف متحرک اور اپنی مخصوص ارتقائی منزل کی طرف رواں دواں بھی ہے۔ جیسے جمادات نباتات کی طرف، نباتات حیوانات کی طرف اور حیوانات انسان کی طرف حرکتِ عروجی اور رفتارِ جذبی کے پابند ہیں۔ لیکن انسان میں چونکہ ارادہ، عقل و تدبیر کارفرما ہیں اس لیے اس کی حرکت و رفتار میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

حرکتِ موافق جمادات و نباتات میں صرف وہی حرکت پائی جاتی ہے جو فطرۃً اُس کے لیے مخصوص ہے۔ اس کو حرکتِ موافق کہیں گے۔ یعنی وہ تقاضائے فطرت کے

Marfat.com

عین موافق حرکت کر رہے ہیں، اور اسی سمت ان کی رفتار ہے جس سمت اُنھیں چلا دیا گیا ہے۔ ان میں حرکتِ مخالف نہیں۔ یعنی وہ کبھی فطرت کے خلاف قدم نہیں اُٹھاتے۔ اور انسان بھی اس حرکتِ موافق سے بہرہ یاب ہے۔ پس وہ انسان جو اپنی فطرت پر قائم ہیں اور اپنے ارادہ و اختیار سے اس کے خلاف نہیں کرتے وہ توفیقِ الٰہی کے حامل ہیں۔

حرکتِ مخالف بعض وہ انسان جو فطرت سے لاعلم ہیں، یا آنکھ بند کر کے اپنی فطرت کے خلاف اپنی خواہشات کی پیروی میں نامناسب حرکات اختیار کرتے اور اپنا منھ حق کی طرف سے موڑ کر ناحق کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ اِسے حرکتِ مخالف کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ نورِ تسلیم کے خلاف سرکشی اور خودسری کی تاریکی میں واقع ہوتی ہے اس لیے کفر یا گناہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔

رفتارِ رحمت اگر انسان کی ہر حرکت مشیئت کے موافق ہے اور اُس کی رفتار میں اعتدال اور میانہ روی پائی جاتی ہے۔ یعنی اپنی حدِ فطرت سے نہ کم ہے نہ زیادہ تو اُسے رفتارِ رحمت کہتے ہیں۔ اس رفتار میں نہ گمراہی کا خطرہ ہے نہ ہلاکت کا خوف، بلکہ یہ ہر طرح امن و سلامتی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ خود مامون و محفوظ ہوتی ہے اور دوسرے کو بھی مامون و محفوظ رکھ سکتی ہے۔

رفتارِ زحمت لیکن اگر انسان کی حرکت موافق تو ہے لیکن معتدل نہیں ہے۔ یعنی وہ ضرورت سے زیادہ سُست یا کم ہے، یا حدِّ فطرت سے گزر کر زیادہ تیز ہو گئی ہے تو اُسے رفتارِ زحمت کہیں گے۔ اور اس پر شیطانی حرکت کا اطلاق کیا جائے گا۔ اور چونکہ شیطان امن و سلامتی کا دشمن اور مردُود ہے اس لیے ایسی رفتار جو حدِّ فطرت سے سُست یا تیز ہو امن و سلامتی سے بعید ہوگی۔

انسان کی حرکتِ باطنی انسان میں دو قسم کی حرکتیں اور دو قسم کی رفتار پائی جاتی ہیں۔ ایک حرکتِ باطنی یا طبعی۔ یہ حرکت گھڑی کی رفتار کی طرح ہمارے

Marfat.com

باطن میں ہر وقت موجود ہے اور یکساں ایک رفتار سے ہمارا سفرِ حیات طے کر رہی ہے۔ امورات فطرت اس میں تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔ اموراتِ خیر کی فطرت، اسے بقا و سلامتی پر قائم رکھتی ہے۔ اور اموراتِ شر کی فطرت، اسے ہلاکت و عذاب کے راستے پر لے جاتی ہے۔ بقا اور سلامتی کی علامت سکون و اطمینان میں رہنا اور سکون و اطمینان میں رکھنا ہے۔ اور ہلاکت و عذاب کی نشانی خود منتشر اور پریشان رہنا اور دوسروں کو منتشر اور پریشان کرنا ہے۔

انسان کی حرکتِ ظاہری

یہ وہ حرکتِ ارادی و عقلی ہے جو انسان کی باطنی استعداد کو ظاہری افعال میں مرتب کرتی ہے۔ یہ حرکت شعور کے ماتحت ظہور میں آتی ہے (جس کا بیان ماقبل سائز میں بالتفصیل پیش کیا گیا) انسان جس مرتبۂ شعور میں واقع ہوتا ہے ویسی ہی اُس کی حرکتِ ارادی ہوتی ہے۔ مثلاً شعورِ خودی کا حامل انسان خودی اور انفرادیت ہی میں حرکت کر سکے گا شعورِ انسانی کی حرکت اُس سے ظاہر نہ ہو گی وغیرہ۔ انسان کی یہ حرکتِ عقلی کبھی موافق ہوتی ہے کبھی مخالف۔ کبھی رحمت ہوتی ہے اور کبھی زحمت۔ اس لیے انسان اپنی حرکتِ ظاہری سے اپنا مرتبہ ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ جب اُس سے حرکت ظاہر ہوتی ہے تو وہ عقل و اختیار و شعور کی دلیل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی عقل و اختیار و شعور پر انفرادی یا سماجی عذاب و صواب اور جزا و سزا کا دارومدار ہے۔

استعدادِ انسانی

انسان کی حرکات میں اُس کے عقل و ارادہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اور عقل و ارادہ و اختیار استعدادِ حاصلہ سے قائم ہوتے ہیں۔ اگر استعداد نہ ہو تو ارادہ و اختیار بے مایہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو استعداداتِ ممکنہ کا جامع بنایا ہے۔ وہ تمام استعدادات جو مخلوقاتِ عالم کو الگ الگ عطا کی گئی ہیں وہ انسان کو بالکلیہ ملی ہیں۔ چونکہ انسان جامع استعدادات ہے اسی لیے مقامِ اشرفیت پر فائز ہے۔ اگر یہ جامع استعداد نہ ہوتا

Marfat.com

تو وہ مخلوق اُس سے اشرف ہوتی جو استعداد میں اس سے برتر ہوتی۔ اِسے پست تر مخلوق جماد، نبات وحیوان کی استعداد بھی ہے، اور جن و ملک وارواح کی بھی۔ جب یہ انسان اپنی استعدادِ حاصلہ سے واقف ہوتا ہے تو اپنی عقل واختیار کے ذریعہ اپنی حرکات سے اُسے ظاہر کرتا ہے۔ اب چونکہ حرکات مؤثر ہیں اور ہر اثر ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس لیے جیسی حرکات سرزد ہوتی ہیں، انسان پر ویسے ہی نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر حرکات مستحسن اور مفید ہیں تو انسان کمالات کی طرف بڑھتا ہے۔ اور اگر قبیح و مضر ہیں تو مذلات کے قعرِ عمیق میں گرتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے استعداد کو سمجھنا ضروری ہے۔ تاکہ اُنھیں بروئے کار لایا جا سکے۔

استعداد کا وُرود

بچہ ماں کے رحم میں جنم پاتا ہے۔ ابھی جبکہ وہ ایک مضغہ (یا علقہ) کی صورت میں بھی تبدیل نہیں ہوا ہے، بلکہ اپنی پہلی صورت (نطفہ) میں ہے۔ اس وقت بھی اُسے جملہ استعدادات حاصل ہوتی ہیں لیکن بالقوٰی۔ بالفعل اس سے کسی استعداد کا ظہور نہیں ہوتا۔ ہاں، صرف ایک استعداد اور ایک حرکت ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ ہے استعدادِ تسبیح اور حرکتِ ذکرِ فطری۔ جیسا قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ زمین آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی اپنی خلقت اور فطری حرکت سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہی ہے تو وہ نطفہ بھی اس میں شامل ہے اور تسبیح کر رہا ہے۔ اور نطفہ کی وہ حرکتِ فطری جو اُسے مضغہ کی صورت میں تبدیل کرنے کے لیے آگے بڑھاتی ہے ذکرِ "اللہ" کی حامل ہے۔ یعنی نطفہ میں جو حرکت ہو رہی ہے اُس سے اسم "اللہ" کا ذکرِ مسلسل فطرۃً جاری ہے۔ یہی اسم "اللہ" اس کا خالق، اُس کا پرورش کنندہ اور اُس کا محافظ ہے۔ یہی اسم "اللہ" اُس کا مصوّر ہے جو ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل کرتا ہوا کمالِ صورتِ بشری کی طرف لا رہا ہے۔ غرض اس وقت اس نطفہ سے صرف ایک استعداد اور ایک حرکت کا ظہور ہو رہا ہے۔ لیکن جیسے جیسے اُس کی شکل تبدیل ہوتی ہے

Marfat.com

ایک ایک نئی استعداد ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

استعدادِ مضغہ جب نطفہ علقہ نے مضغہ کی شکل اختیار کی تو اس میں استعداد تسبیح اور حرکتِ ذکر کے ساتھ استعدادِ نشوا و حرکتِ نمو ظاہر ہونے لگتی ہے (یعنی استعدادِ تسبیح اور حرکت ذکر میں مزید ترقی ہو جاتی ہے) جس کے نتیجے میں وہ مضغہ بڑھتا اور اعضا و جوارح اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساڑھے چار پانچ ماہ میں بچہ اپنی پوری شکل کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس میں خود سانس لینے یا منہ سے غذا کرنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ اس لیے ماں کا دَورانِ خون ازراہِ ناف بچے کے دَورانِ خون کی تفریح اور حیات بخشی کرتا ہے۔

استعدادِ جنین جب بچہ ماں کے رحم میں سات ماہ کا ہوتا ہے تو اس کی شکل مکمّل ہو جاتی ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ سانس لینے اور غذا کرنے کی استعداد کو ظاہر کرے۔ وہ ساتویں مہینے اخراج کے لیے حرکت کرنے لگتا ہے۔ لیکن رحم مادر اُسے اس لیے روک لیتا ہے کہ اُس کی قوت طبعی بھی ظہورِ استعداد کے لیے کامل ہو جائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچّہ قوی ہوتا ہے اور رحم مادر اُسے نہیں روک سکتا اس لیے وہ ساتویں مہینے تولد ہو جاتا ہے اور اکثر زندہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ استعدادِ حیات کے ساتھ قوائے طبعی بھی موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جب رحمِ مادر اپنی قوت سے اُسے ساتویں مہینے روک لیتا ہے تو بچے کی قوتِ طبعی مغلوب ہونے کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے۔ اور آٹھویں مہینے بچہ آرام وسکون کے ساتھ اُس قوتِ زائلہ کو واپس لوٹاتا ہے۔ اگر اتفاق سے رحمِ مادر آٹھویں مہینے بچے کو چھوڑ دے اور بچہ تولد ہو جائے تو اکثر فوت ہو جاتا ہے زندہ نہیں رہتا۔ کیونکہ ابھی اُس کی قوت زائلہ واپس حاصل نہیں ہوتی ہے

استعداد طفل نویں مہینے بچہ ماں کے رحم میں اپنی استعداد، قوائے طبعیہ اور حرکت کے اعتبار سے اس درجہ کامل ہو جاتا ہے کہ وہ باہر کی فضا میں اپنی

Marfat.com

استعدادِ حیات کو ظاہر کرسکتا ہے۔ اور یہی صحیح وقت اُس کے دنیا میں قدم رکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ پیدا ہوتے ہی رونا شروع کرتا ہے۔ بچہ کا رونا ظہورِ استعداد کی ایک حرکت ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ بچہ روتا نہیں ہے بلکہ ذکر و تسبیح کرتا ہے۔ رونے سے اندر کی ہوا خارج ہوتی ہے تو سانس اندر لینے کی استعداد ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے ہوشیار دائیاں جب تک بچّہ اچھی طرح رونے نہیں لگتا اُس کی نال (آنول) نہیں کاٹتیں۔ بلکہ اُس کو ہلا جُھلا کر رُلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر رونے سے نال کاٹ دی جائے تو اکثر بچّہ مرجاتا ہے۔

بچّوں میں ظہورِ استعداد پیدا ہونے کے بعد چوبیس گھنٹے تک بچّے کو غذا کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ ماں کے پیٹ سے شکم سیر ہو کر آتا ہے۔ اس وقت اُس کے حواس میں سب سے پہلے حسِّ لامسہ اور حسِّ سامعہ ظاہر ہوتی ہے بچّہ جیسے ہی روتا ہے خود اپنی آواز کو سنتا ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو دوسری آوازوں کو محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی آواز کو نہیں پہچانتا۔ لیکن ہر آواز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ توجہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُس کی فطرت میں آوازوں کو پہچاننے اور اُن کے معانی سمجھنے کی استعداد موجود ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اُس کی نظر چیزوں پر جمنے لگتی ہے۔ اور وہ دیکھ کر چیزوں کو پہچاننا چاہتا ہے۔ وہ روشنی اور روشنی میں رنگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پھر شامّہ کام کرنے لگتا ہے اور ایسا کام کرتا ہے کہ اپنی ماں کی خوشبو کو دوسری عورتوں سے علیٰحدہ تمیز کرلیتا ہے۔ غرض اُس کی جملہ استعداد اُس کے حواس کے ذریعہ ظاہر ہونے لگتی ہے۔

استعدادِ حصولِ تربیت بچے میں فطرۃً تربیت قبول کرنے کی بھی استعداد ہوتی ہے اس لیے ابتدا سے اسکی ماں یا دایہ جس طرح اس کی تربیت کرتی ہے وہ اُسی طرح اپنی عادت ڈالتا ہے۔ دایہ ہوشیار ہے تو اُسے وقت مقررہ پر دودھ

Marfat.com

پلاتی ہے ۔ وقت پر نہلاتی ہے ۔ وقت پر سلاتی اور وقت پر اُسے جگاتی ہے، اور ورزش کراتی ہے۔ جب یہ پابندی بچے کی عادت میں داخل ہو کر اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، تو عمر بھر بچہ عمدہ طریقے سے اپنی استعداد کو ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر دایہ ہوشیار نہیں ہے اور تربیت کا سلیقہ اُسے نہیں آتا تو وہ ابتدا سے بچے کے اوقات کو اس طرح مخلوط کر دیتی ہے کہ وقت کو پہچاننے کی استعداد نہیں اُبھرتی۔ وہ بے قاعدگی سے دُودھ پلایا جاتا ہے تو وہ ہر وقت دُودھ کے لیے روتا، اور گھر والوں کے ساتھ ہمسایوں کو بھی بے چین کرتا ہے۔ اگر اُسے ابتدا سے پاکی اور صفائی کا عادی نہ بنایا جائے تو بڑا ہو کر بھی پاکی اور صفائی کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے بچے کو پیدائش کے پہلے ہی لمحہ سے تربیت شروع کر دینی چاہیے تاکہ بچے کی کوئی استعداد دبنے نہ پائے۔

استعدادِ غذا ظاہر ہے کہ جب تک بچے کے دانت نہیں نکلتے بچّہ صرف دودھ پر اکتفا کرتا ہے۔ جب وہ دانت نکال لیتا ہے تو شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ دوسری غذائیں طلب کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مگر اُس کو ہر چیز کھانے سے روکا جائے اور رقیق غذا دی جائے (اور دو سال کے بعد ماں کا دُودھ چھڑا دینا چاہیے۔ ورنہ دماغ کی ذکاوت اور ذہن کی جودت پر اچھا اثر نہ پڑے گا) اور اُسے مناسب غذا دینی چاہیے۔ اور غذا میں وقت کی پابندی کا لحاظ بدستور رکھنا چاہیے تاکہ اشتہا اور ہضم کے اوقات ہمیشہ کے لیے مقرر ہو جائیں۔

تربیتِ باطن اگر ابتدا ہی سے ظاہری تربیت کے ساتھ باطنی تربیت کا بھی لحاظ و خیال رکھا جائے تو سنِ بلوغ کو پہنچتے پہنچتے اُس کے آداب مؤدب ہو جاتے ہیں اور اُس کی روحانی استعداد اُبھرنے لگتی ہے۔ اور وہ باطنی معاملات سے بھی

Marfat.com

آگاہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اگر باطنی تربیت نہ کی گئی اور باطنی استعداد دب کر رہ گئی، تو بلوغت کے بعد اُس کے اُبھرنے میں دیر لگتی ہے۔ اور اکثر ایسے بچے زندگی بھر باطنی استعداد کے ظہور سے کورے رہ جاتے ہیں۔

استعداد کا خاموش ظہور

جس طرح بچوں میں نشوونما آہستہ اور غیر محسوس طریقہ پر ہوتی ہے اسی طرح اس کی استعداد کا ظہور بھی نہایت آہستہ اور خاموش ہوتا ہے۔ بچہ خود نہیں جانتا کہ اس کی استعداد کس رفتار سے ترقی کر رہی ہے۔ ہاں بچوں کے مربیان ضرور روزانہ نت نئی استعداد کو اُبھرتے دیکھ سکتے اور اُسے نگاہ رکھ سکتے ہیں۔ جیسے آج وہ ٹوٹے پھوٹے جملے استعمال کرتا اور آگے چل کر وہ پورے اور صحیح جملے استعمال کرنے لگتا ہے۔ اس لیے بچے میں کسی استعداد کو اُبھارنے کے لیے روزانہ مسلسل ایک مشق اور ورزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس قدر مشق اور ورزش میں دوام ہوتا ہے اُس کی استعداد ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے جب تک مانعات سے بچ کر مشق و ورزش ہوتی رہے گی استعداد برابر بڑھتی جائے گی۔ بعض انسانوں میں قدرتاً استعداد قدسی بھی ہوتی ہے۔ اور وہ دست قدرت میں پرورش پاتے ہیں۔

انبیاء میں استعدادِ نبوت

سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے (جنھوں نے شیر خوارگی میں کہا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ یعنی مجھے اللہ نے کتاب دی اور نبی بنایا، کہا اور تیس سال کے بعد مبعوث ہوئے) اور کوئی نبی چالیس سال سے کم عمر میں نبوت کو نہیں پہنچا۔ حالانکہ روزِ ازل ہی سے ان کی تقدیر میں پیغمبری لکھی تھی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ استعدادِ نبوت تو اُن کو ازل ہی میں تفویض کی جا چکی تھی۔ مگر دنیا میں تشریف لانے کے بعد انھوں نے رفتہ رفتہ مراتب ولایت کی سیر کی اور دھیرے دھیرے استعدادِ نبوت کو

Marfat.com

اُبھارتے رہے۔ اور جب وہ بصورتِ کامل استعدادِ نبوت کو ظاہر کرنے کے قابل ہوگئے تو نبوت کی بشارت دی گئی۔ جیسے ہمارے حضور نبیِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اُس وقت بھی نبی تھے جب آدم علیہ السلام پانی میں خمیر کیے جا رہے تھے۔ کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی استعدادِ نبوت جملہ انبیائے کرام کی نبوت میں ظاہر ہوتی ہوئی جب بالذات ظاہر ہوئی تو چالیس سال کے بعد جبریل علیہ السلام نے آکر آپ کو نبوت کی خوشخبری دی، اور آیاتِ قرآنی پہنچاتے رہے۔ نزولِ وحی سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی استعدادِ نبوت بمرتبۂ کمال ظہور کے لیے آمادہ ہو چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وحیِ الٰہی کا بار کیونکر برداشت کر سکتے۔ جس طرح بچہ پیدا ہونے کے بعد فضائے ہوائی کے دباؤ کو برداشت کرنے اور سانس لینے کی استعداد کو فوراً ظاہر کرتا ہے، اور سانس لینے لگتا ہے۔ اسی طرح ایک نبیؑ نبوت کی بشارت ملنے اور اظہارِ نبوت پر مامور ہونے کے بعد فوراً تبلیغ کا کام شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس میں پس وپیش نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ اپنی استعدادِ نبوت اور اظہارِ بعثت کے لیے وقت اور موقع کی نزاکت کو محسوس کرتا ہے۔ اور چونکہ حکیم ہوتا ہے (یعنی نبوت سے پہلے ولایت و حکمت کا حامل ہو چکا ہوتا ہے) اس لیے حکمت و ملاطفت کے ساتھ تبلیغ احکام اور اجرائے قوانین کو سرانجام دیتا ہے۔

کمالاتِ نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمالِ نبوت یہ ہے کہ جس طرح آپؐ نے انسانوں کے معاشرے، اخلاقی اقدار اور ظاہر حالت کو سدھارنے اور ترقی دینے کے لیے احکامِ خدائی سے شرعی قوانین مرتب فرما کر مکمل کر دیا۔ اُسی طرح روحانیت اور باطنی عوالم کے لیے غیر مشکوک طریقے اور سیدھے راستے بتا کر صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما دی۔ اسی لیے آپؐ کے اُمتیوں کی دنیا منظم، ظاہر مرتب، روحانیت مکمل اور آخرت فلاح وبہبود کو پہنچی اور

آپؐ پر ایمان لانے والے، موت کے وقت کردارِ حیات پر رنج و افسوس کرنے یا نجات کے متعلق خوفزدہ ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اور یہی طریقِ ہدایت قیامت تک کے لیے انسانوں کو کافی ہے۔

انسانی ارتقار اگر انسان اِن قوانینِ شریعت اور سنتِ طریقت پر ایماندارانہ اور مخلصانہ کاربند ہو' (جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب اور مقرر فرمائے۔ اور علمائے حق و اصفیائے حقیقت جس کی رہنمائی پر مامور و مشغول ہیں') تو انسان کو ہر ہر سانس پر روحانی ترقی اور باطنی ارتقار کے علاوہ معاشی، سیاسی اور اخلاقی عروج نصیب ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنی عملی زندگی ہی میں اپنا مقصود یعنی خلافتِ ارضی و معرفتِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی کمالِ بندگی اور انسانیت کا عروجِ منتہا ہے۔

مراتبِ کمال اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو جس قدر استعدادات عطا فرمائی ہیں اُن کو بطریقِ احسن ظاہر کرنا انسانیت کا کمال ہے۔ اور انسانی کمالات کی دو قسمیں ہیں کماتِ ظاہر اور کمالاتِ باطن۔

کمالاتِ ظاہر یہ وہ کمالات ہیں جو اسبابِ ظاہری کے ساتھ فرد یا معاشرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کا نام "حقوق" ہے۔ ان کی تین قسمیں ہیں۔ حق نفس، حق العباد اور حق اللہ۔ (ان کا تفصیلی بیان " مینائے مصطفائی' دَورِ اول صفحہ ۳۸ پر دیا گیا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں) مختصر یہ کہ انسان اپنے ہر عمل سے اس بات کو ثابت کر دے کہ وہ قانونِ الٰہی سے واقف اور اُس پر کاربند ہے۔ اسی کا نام اسلامِ شرعی ہے' جو ظاہر سے تعلق رکھتا ہے۔

کمالاتِ باطن اصطلاحِ طریقت میں باطن کا دروازہ لطیفۂ قلب سے شروع ہوتا ہے

Marfat.com

جو قدمِ آدمؑ ہے۔ یہاں کمالاتِ اسمار کا ظہور ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (اور سکھادیا آدمؑ کو جملہ اسمار) پھر لطیفۂ روح ہے جو اجمالاً قدم نوحؑ کہلاتا ہے۔ یہاں کمالاتِ نجات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ عالمِ غل وغش سے خود نجات پاکر دوسروں کی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔ جیسا فرمایا وَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ۔ (اور ہم نے نجات دی اُس کو اور اُس کے اہل (ساتھیوں) کو سخت مصیبت (بڑی بے چینی) سے۔ اور تفصیلاً یہی لطیفہ قدمِ ابراہیمؑ یعنی مقامِ خلّت بھی ہے، جہاں کمالاتِ خلیلی کا صدور ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اُس پر سلام بھیجتا ہے۔ جیسا فرمایا وَسَلٰمٌ عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ ۔ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔ (اور ابراہیمؑ پر سلامتی ہو، اس طرح ہم نیکو کاروں کو اجر دیتے ہیں۔) پھر لطیفۂ سر ہے، جو قدمِ موسیٰؑ ہے یہاں کمالاتِ تکلّم ظاہر ہوتے ہیں۔ گویا یہ مقامِ طور ہے، جہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو تکلّم سے سرفراز فرماتا ہے۔ اور مخاطبت سے نوازتا ہے۔ جیسا فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا۔ (اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام کیا بحیثیتِ کلام (یعنی الفاظ و بیان میں)۔ اس کے بعد مقام لطیفۂ خفی ہے جو قدمِ عیسیٰؑ ہے۔ یہاں روح اللّٰہیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ مقام قربِ نوافل ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمالیہ قدیمہ بندے سے منسوب ہو جاتی ہیں، یعنی بندہ اللہ کی قدرت و طاقت سے کام کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡــئَةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ۔ (میں بتاتا ہوں تمہارے واسطے مٹی سے پرندے کی صورت پھر پھونکتا ہوں اُس میں تو وہ اللہ کے حکم سے اُڑتا ہوا پرندہ ہو جاتا ہے۔ اور مادر زاد اندھے کو بینا کرتا ہوں، کوڑھی کو شفا دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں۔) اس کے بعد مقام لطیفۂ اخفیٰ ہے، جو قدمِ محمد رّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہاں محبوبیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے

Marfat.com

کمالاتِ ذاتیہ و مقدّراتِ صمدیہ بندے پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کو اشارۂ رفرف کے ذریعہ ـــــــ کھینچ کر مقامِ قابَ قوسین تک لے آتا ہے جہاں قربِ فرائض حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے اعضا سے خود کام کرتا ہے۔ فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (جب تم نے کنکری ماری، تم نے نہیں ماری، بلکہ اللہ نے کنکری ماری) یا اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔ (وہ لوگ جنھوں نے تمھاری بیعت کی یقیناً انھوں نے اللہ کی بیعت کی) صدورِ فعل بندے سے ہوتا ہے لیکن اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے۔ اور یہ انسانیت کا انتہائی معراجِ کمال ہے۔ اس کے آگے کوئی مقام نہیں۔

حصولِ کمالات کا طریقہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً استعدادِ کمالات تو عطا فرما دی ہے لیکن اس استعداد کا ظہور بغیر مشق و مجاہدہ کے نہیں ہوتا۔ جس طرح ہر انسان کو ایک پہلوان کی استعداد عطا فرمائی ہے لیکن ہر انسان پہلوان نہیں ہوتا۔ وہی لوگ پہلوانوں کی طاقت حاصل کرتے ہیں جو عرصۂ دراز تک مشق و ریاضت میں خاص اصول کے ساتھ مشغول و مصروف رہتے ہیں۔ جیسے جیسے مجاہدہ ترقی کرتا ہے استعداد ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ یہ انسان کا ظاہری اور جسمانی کمال ہے جو قوم و ملّت کی عزّت و وقار کی بلندی اور انسانیت کی حفاظت کا کام انجام دیتا ہے۔ اگر یہ کمال شر و شیطنت سے مامون و محفوظ ہو تو اکثر ولایت کے راستے پر کھینچ لاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کمالاتِ باطنیہ کی استعداد عطا فرمائی ہے۔ لیکن جب تک صحیح طریقے، اور اصولِ طریقت کے ماتحت ریاضت و مجاہدہ پر مداومت نہ کی جائے یہ استعداد ظاہر نہیں ہوتی اور انسان کمالاتِ باطنیہ تک نہیں پہنچتا۔

Marfat.com

صراطِ مستقیم اِن کمالاتِ باطنیہ کے حصول اور مقصود تک رسائی کا سیدھا راستہ:- اول اسلام میں داخل ہونا۔ پھر اپنے اسلام میں ایمان کی شمع روشن کرنا۔ پھر اس روشنی میں صلاح و تقویٰ اختیار کرنا۔ پھر صلاح و تقویٰ میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کرنا۔ پھر اس مشاہدہ کی ظاہر و باطن یکساں تصدیق کرنا۔ پھر اُس تصدیق کو دوسروں تک پہنچانا ــــ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ اسی راستے کی تصدیق و تبلیغ جملہ انبیاے کرامؑ نے کی، اور آج تک اس امتِ مرحومہ کے جملہ اولیائے کرام کرتے چلے آرہے ہیں۔ جس طرح ہر علم و فن کے لیے ایک استاد اور رہنما کی ضرورت، اسی طرح یہ راستہ اختیار کرنے کے لیے ایک آشنائے راہ اور کامل و مکمّل رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بغیر رہنما کے اس راستے کے خطرات سے بچ کر منزلِ مقصود پر پہنچنا آسان نہیں ہے۔

قرآنی اشارات اس صراطِ مستقیم کی استقامت کے لیے قرآنِ کریم ان الفاظ میں بدیہی اشارات فرماتا ہے ــــ اسلام کے لیے :- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔ اے ایمان والو ! (پہلے) اسلام میں کامل طریقے سے (یعنی ظاہراً و باطناً) داخل ہو جاؤ ـ ایمان کے لیے :- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۔ اے ایمان والو، اللہ پر اُس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو رسولؐ پر نازل ہوئی، اور اُس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل ہوئی ایمان لاؤ۔ اور جن لوگوں نے اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت سے انکار کیا، یقیناً وہ بہت دُور گمراہی میں بھٹک گئے ـ اور صلاح و تقویٰ کے لیے ارشاد فرماتا ہے :- اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ـ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور صلاحؔ

Marfat.com

تقویٰ اختیار کیا وہی لوگ جنتی ہیں۔ شہادت کے لیے:۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ ان لوگوں کو مردہ نہ کہو (یعنی مردوں میں اُن کا شمار نہ کرو) جو اللہ کے راستے میں (ظاہری یا باطنی موت) مارے گئے۔ بلکہ (یقیناً) وہ زندہ ہیں اور تم (اُن کی زندگی کو) نہیں سمجھ سکتے ۔ اور اِن مراتب کو درجہ بدرجہ ایک ہی آیت میں اِس طرح بیان فرمایا ہے۔ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔ پہلا اور ارفع مرتبہ نبوت کا۔ پھر صدیقیت کا۔ پھر شہادت کا اور اس کے بعد صالحین کا مرتبہ ہے۔ اور صراطِ مستقیم کے یہی اہم مقامات۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نوعِ انسان کو صراطِ مستقیم کے اِن مقاماتِ جلیلہ پر فائز و مستفیض فرمائے۔ اور بنی آدم کو مقصدِ تخلیق تک پہنچا کر کمالاتِ ظاہری و باطنی عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۱۳

اعتدال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْھُدٰی

اعتدال اعتدال اس حدِ اوسط یعنی درمیانی حالت کو کہتے ہیں جو زیادتی کمی یا بہ اصطلاحِ علماء افراط اور تفریط سے بچی ہوئی ہو۔ اعتدال کی حالت میں شدت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اور نہ کسی رُخ یا پہلو کا غلبہ یا دباؤ منصور ہوتا ہے۔

اسلام کی اعتدال پسندی اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اعتدال بخشا اور اس اُمت کو "اُمتِ وسط" فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ط (ہم نے تم کو امتِ اوسط، یعنی درمیان میں یا اعتدال پر رہنے والی قوم بنایا ہے)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جسم و روح، نور و ظلمت، حیوان و مَلک اور بلندی و پستی کے درمیان پیدا کر کے عبادات و ریاضات کے ذریعہ علوی، روحانی اور اُخروی ترقی کی استعداد عطا فرمائی ہے اور خطا و گناہ کے ذریعہ پستی، مادّیت اور نفسانیت کے قعرِ مذلّت میں گر جانے کی اہلیّت بھی رکھی ہے۔ جب یہ انسان اعتدال پر رہتے ہوئے ترقی کرتا ہے تو فرشتگانِ مقرّبین سے گزر جاتا ہے۔ اور جب اپنے حدِ اعتدال سے نیچے آ کر شدت اختیار کرتا

Marfat.com

اور ظلمت قبول کرتا ہے تو حیوان سے پست ہو جاتا ہے۔

سنت اللہ جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ بندے حد اعتدال سے تجاوز یا قصور کر کے انسانیت کا انہدام اور روحانیت کی توہین کرنے لگے ہیں، تو انسانیت اور روحانیت کو دوبارہ حدّ اعتدال پر لانے کے لیے ہادیوں اور رہنماؤں کو مقرّر و مبعوث فرماتا ہے تاکہ صحیح تعلیمات کے ذریعہ وہ اپنی انسانیت کو بحال کریں۔ اگر وہ قوم اُن کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، تو اُس کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسری قوم کو خلق فرماتا ہے جو صحت مند انسانیت اور پاکیزہ روحانیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہی سنّت اللہ ہے اور آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک یہی سنّت جاری وساری رہی ہے کہ غیر معتدل قومیں ختم ہوتی، اور اعتدال کی حامل قومیں اُن کی جگہ لیتی رہی ہیں۔

انسانیّت کے اِرتقائی اَدْوار آدم علیہ السّلام سے لے کر نوح علیہ السّلام تک انسانیت کا وہ ابتدائی اور سادہ دَور تھا جس نے کچھ زیادہ ارتقا حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لیے چند اذکار اور چند مختصر اخلاقی امورات سے اُن کو ارتقا کی طرف ہدایت کی گئی۔ کیونکہ اُس وقت انسان اپنی زندگی کو حیوانات کی فطری زندگی کے قریب رکھ کر دن گزارتا رہا تھا۔ اور بعض خونخوار حیوانات سے درندگی سیکھ کر اعتدالِ انسانیت سے تجاوز بھی کرتا رہا تھا۔ آخر نوح علیہ السّلام کے زمانے میں وہ اس درجہ غیر معتدل اور جاہل ہو چکا تھا کہ جب اُن کو اعتدال پر لانے کے لیے چند قوانین اور اصولِ عبادات شریعتِ اوّلیہ کی صورت میں نوح علیہ السّلام کے ذریعہ دیے گئے تو انھوں نے (سوائے گنے چنے افراد کے) پوری قوم کے ساتھ سرکشی اور نافرمانی کی۔ تو تقریباً نو سو برس کی جد وجہد کے بعد نوح علیہ السّلام کو اُن کے لیے عذابِ الٰہی طلب کرنا پڑا۔ اور پوری قوم طوفان میں غرق کر دی گئی۔ اور اُن کی جگہ ایک

Marfat.com

معتدل قوم نمودار ہوئی۔ اس قوم نے ایک عرصہ تک اعتدال سے کام لیا۔ اور اپنی مطمئن زندگی کے ساتھ ارتقا کی طرف مائل رہی۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ جب اُس کو دولت و ثروت ۔۔۔۔۔ کے ساتھ مطمئن زندگی نصیب ہوتی ہے تو وہ اعتدال سے ہٹنے لگتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ظالم اور عیّاش ہوجاتا ہے۔ اور عشرت پسندی کا لازمی نتیجہ جہل ہوتا ہے۔ جب ان کے بعد آنے والی اقوام عاد و ثمود و ہود و لوط وغیرہ نے ظلم کی رسّی دراز کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ تمہیل کے مطابق تھوڑی تھوڑی ڈھیل دینے کے بعد اُنھیں کیفرِ اعمالی میں مبتلا کرکے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اور اُن کی جگہ معتدل قومیں آتی رہیں۔

بنی اسرائیل حضرت یوسف علیٰ نبینا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اللہ تعالیٰ نے مصر میں بھیجا جنھوں نے اپنا دورِ غلامی اعتدال کے ساتھ گزار کر مصر کی وزارت حاصل کی اور بنی اسرائیل کو امن و امان کے ساتھ مصر میں آباد کیا۔ جب اُن کو بھی عزت، رفعت اور اقتدار ملا تو وہ بھی اعتدال سے ہٹ کر عشرت پسند ہوگئے۔ جب اُن کا ظلم بھی حد سے زیادہ بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنی نعمتیں اور رحمتیں چھین لیں۔ اور یہی نہیں کہ وہ پھر مصریوں کے غلام بن گئے، بلکہ اُن پر ایک ظالم و جابر بادشاہ فرعون مسلّط کیا گیا، جس نے ان کے لڑکوں کو قتل اور لڑکیوں اور عورتوں کو لونڈی باندی بنا کر ان کے ظلم کی خاطر خواہ سزا دی۔ یہ قانونِ الٰہی ہے۔

ہر فرعونے را موسیٰ اور جب مدعیِ الوہیت فرعون کا ظلم بھی حد سے تجاوز کر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ظلم کو ختم کرنے اور اعتدال کے راستے کی ہدایت کے لیے اس کی جملہ تدابیر کے باوجود اسی کی سلطنت میں موسیٰ علیہ السّلام کو پیدا کیا۔ اور اُس کے کمال احتیاط کے باوجود اسی کے گھر میں اُن کی پرورش فرمائی۔ اور اُنھوں نے قوم بنی اسرائیل کو بڑھنے کا راستہ بتایا۔ مصریوں کے ظلم و جبر سے بچا کر ان کے ذہن و تفکر کو اعتدال و

Marfat.com

ایمان کی طرف رجوع کیا۔ آخر اللہ تعالےٰ نے فرعون کو، جب وہ اپنی آخری حدِ سرکشی پر پہنچ گیا، مع اُس کی ظالم قوم کے غرقاب کر کے انسانیت کی ترقی کیلیے راستہ ہموار کر دیا۔

حصولِ اقتدار و حکومت کا الٰہی قانون

اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر شام کی طرف آئے جہاں ایک اور ظالم قوم حدِ اعتدال سے گزر کر ظلم و ستم کا سکہ جمائے ہوئے تھی تو موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "آؤ، ان کے ظلم کو ختم کر کے عدل و انصاف کی حکومت قائم کریں"۔ تو اُن کی قوم نے جواب دیا "اے موسیٰؑ جنگ و جدال ہمارا کام نہیں۔ تم اپنے خدا کو لے کر اس قوم کا مقابلہ کرو۔ جب تم غالب آ کر امن و امان قائم کرو گے تو ہم آ کر آباد ہو جائیں۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ حصولِ اقتدار و حکومت کا الٰہی قانون کیا ہے۔ جس قوم میں محنت، جفاکشی، اتحاد و اتفاق، کمزوروں کی امداد، فریادیوں کی فریاد رسی اور مظلوموں کی داد رسی کے جذبات نہ ہوں وہ قوم سلطنت و حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ حکمتِ الٰہیہ عطا کی گئی تھی اُنھوں نے اپنی قوم کے مرض کی صحیح تشخیص کر کے مناسب علاج تجویز کیا۔ اور محنت و جفاکشی کی تنگ وادی میں لا کر پھنسا دیا۔ راستہ پانچ دن کے سفر سے زیادہ طویل نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو چالیس برس کے طویل عرصے تک اس میں مبتلا رکھا۔ یعنی جب منزلِ مقصود کے لیے صراطِ مستقیم اختیار کی جائے تو وہ اقرب ترین راستہ ہوتا ہے۔ لیکن صراطِ غیر مستقیم اپنی کجیوں کے مطابق دُور سے دور تر ہو جاتی ہے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو چالیس برس تک صحرائے سینا کے چکّر میں سرگردان رکھا۔ کیونکہ جب کسی قوم یا فرد کو اللہ تعالےٰ بنانا چاہتا ہے تو اُسے مصائب و آلام، کلفت و محنت سختی و جفاکشی میں مبتلا کر کے جدوجہد کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور اُس کی قوت و حیات کو بحال رکھنے کے لیے اپنی قدرت و رزاقیت سے غیبی سامان مہیّا فرماتا ہے۔ جس طرح

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو غربت و فلاکت میں مبتلا کیا۔ اسی طرح من وسلویٰ کے ذریعہ انھیں رزق پہنچایا۔ اور ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری کردیے۔

من وسلویٰ "من" ایک میٹھی اور خوش ذائقہ رطوبت رات کے وقت فضائے آسمانی سے زمین پر شبنم کی طرح اترتی تھی اور صبح تک سبزوں اور پتیوں پر تہ بہ تہ جم کر ایک عمدہ غذا بن جاتی تھی۔ (حکما کا قول ہے کہ "شیرخشت" جو آج کل اطبا تلیین کے لیے استعمال کرتے ہیں "من" کی ایک قسم ہے جو اب بھی اسی طرح آسمان سے اتر کر سبزہ زاروں اور درختوں کے پتوں پر جمع ہو جاتی ہے اور بقول بعض "ترنجبین" کی طرح ہے۔ واللہ اعلم) اور "سلویٰ" بٹیر کی طرح ایک چھوٹا پرندہ ہے (آج بھی شکار کرنے والے بڑی دلچسپی سے اس کا شکار کرتے ہیں۔ سردی کے موسم میں اس کا شکار ہوتا ہے۔ شکاری ایک بڑے وسیع میدان میں رات کے وقت جمع ہوتے ہیں۔ ان کے پاس بولنے والے بٹیر پنجروں میں موجود ہوتے ہیں۔ جب قریب صبح بٹیروں کا جھنڈ فضا میں اڑتا ہوا گزرتا ہے تو ان کے پنجروں میں پرورش و تربیت یافتہ بٹیر آواز لگاتے ہیں۔ ان کی آواز سن کر بڑی تعداد میں بٹیر بے اختیار زمین پر بھد بھد گرنے لگتے ہیں۔ گرنے سے وہ ایسی چوٹ کھاتے ہیں کہ تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ وہ ہوش میں آئیں شکاری انھیں پکڑ پکڑ کر جھولے میں بھر لیتے ہیں، جو پال کر لڑانے اور ذبح کر کے کھانے میں آتے ہیں ان کا گوشت نہایت لذیذ و مفید ہوتا ہے اور بعض بلغمی و اعصابی امراض کے مریضوں کو استعمال کرایا جاتا ہے۔ یہی پرندہ اسی طرح کافی تعداد میں قوم موسیٰؑ پر نازل ہوتا تھا جو بھون کر کھاتے تھے) یہ سلویٰ اگر دوسرے دن کے لیے رکھا جاتا تو خراب ہو جاتا تھا۔ یہ اس لیے کہ وہ قوم توکل کی خوگر ہو جائے۔

بارہ چشمے جب موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کیلیے پانی کی دعا مانگی، تو

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کسی پتھر پر اپنا عصا مارو، جب انھوں نے ایک پتھر پر اپنا عصا مارا، تو اُس کے چار پہلو سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بارہ گروہ تھے ہر ایک نے ایک ایک چشمہ اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ سفر میں یہ پتھر اُن کے ساتھ رہتا جہاں جاتے اسے بھی لے جاتے۔ اس سفر کی صعوبت اور جفاکشی نے ان کی نئی نسل کے عادات و اطوار بدل دیے۔ ان کی راحت طلبی محنت کوشی، اور تعیش جدّوجہد سے بدل گیا۔ نفس کشی اور حصولِ مقصد کی آرزو نے اُن کے اندر ارتقائی صلاحیتوں کو اُبھار دیا۔

انسان کی فطری تغیرپسندی

یہ ایک عجیب خصلت ہے انسان کی کہ وہ ایک حالت پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی زندگی میں اختلاف اور تنوّع پسند کرتا ہے۔ آخر موسیٰؑ کی قوم نے بھی ایک ہی غذا پر اکتفا نہ کی اور موسیٰؑ سے کہا لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ ہم ایک ہی کھانے "من وسلویٰ" پر صبر نہیں کرسکتے فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے (آسمانی غذا کے علاوہ) زمین سے اُگنے والی چیزیں، سبزی، ککڑی، مسور اور پیاز وغیرہ پیدا کرے) موسیٰؑ نے کہا "کیا تم ادنیٰ کو اعلیٰ پر ترجیح دیتے ہو۔ (اگر ایسا ہے) تو تم شہر میں بود و باش اختیار کرو۔ وہاں تم کو یہ سب چیزیں مل جائیں گی۔ الغرض انھوں نے ملک شام بیت المقدس میں جاکر اُس ظالم قوم سے جہاد کرکے فتح حاصل کی اور اُن کو وہ زندگی نصیب ہوئی جو چالیس سال پہلے ہونے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زراعت کے ذریعہ اُن کی مطلوبہ غذا کے علاوہ حکومت بھی عنایت فرمائی۔

قومی ارتقا میں سنّتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنّت کا اظہار ان کلمات سے فرمایا ہے:۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ جب

Marfat.com

کوئی قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کے لیے جدّ و جہد کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی حالت کو بدل دیتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے چالیس سالہ سفر کے مصائب و آلام سے جدّ و جہد اور محنت و جفاکشی سیکھی تو اللہ تعالےٰ نے اُن کو دولت، عزّت، سلطنت اور حکومت عطا فرمائی۔ اور جب تک وہ عدل و انصاف سے حکومت کرتے رہے، امن و سلامتی اور خوش حالی اُن کی محکوم رہی۔ لیکن دولت اندھی ہوتی ہے۔ اور جس کے پاس رہتی ہے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے وہ حق کو حق، باطل کو باطل، اچھے کو اچھا بُرے کو بُرا سمجھنے اور ہلاکت و فلاح میں تمیز کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ یہی حال موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) کا ہوا۔ وہ حکومت و سلطنت اور اقتدار و امارت پا کر عیش پسند ہی اور ظلم و جہل کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ اور چونکہ ان تمام چیزوں کا دار و مدار دولت و مال و منال پر ہے اس لیے اُنھوں نے دولتِ دنیا کمانے اور مال و اسباب جمع کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

داؤد علیہ السلام

اور جب بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی عبادت اور روحانیت سے دُور ہٹ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنّتِ جاریہ کے مطابق حضرت نبی داؤد علیہ السلام کو اُن میں مبعوث فرمایا۔ اور اُن کو دولت و سلطنت اور تعدّد ازدواج سے مالامال فرمایا۔ تاکہ وہ دولت، تموّل، ازدواج اور دنیاوی معاملات میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا سکھائیں۔ ان کے حرم میں ایک سو بیویاں تھیں۔ وہ اصلاح و تبلیغ کے لیے دشمنانِ خدا اور دشمنانِ انسانیّت سے لڑتے رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو غالب رکھا۔ اُن کی عبادات اور مناجات کا یہ حال تھا کہ جب وہ خدا کے حضور میں مناجات کرتے تو پتھر تک کانپ جاتے اور ہلنے لگتے تھے۔ حیوانات بھی جمع ہو کر اُن کی گریۂ و زاری اور مناجات میں شریک ہوتے اور ذکر کرتے تھے۔ اور چونکہ حکومت و سلطنت میں غلبہ کے لیے ہتھیار اور سامان کی ضرورت ہوتی ہے،

Marfat.com

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ جب وہ لوہے کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو وہ موم کی طرح نرم ہو جاتا اور آپ لوہے سے زرہ (بکتر) اور اسلحہ جات تیار کرتے جو لڑائی میں کام آتے۔

تقاضائے حکمت

جب حضرت داؤد علیہ السلام ابتداً لوہے سے سامان اور ہتھیار بناتے تو اُن کی قوم پوچھتی۔ اے داؤد، یہ کیا کرتے ہو، یہ چیزیں کس کام آئیں گی؟ لیکن آپ ان کو اس کا جواب نہ دیتے۔ جو بات آئندہ ظاہر ہونے والی ہے۔ اس کے متعلق سوال کرنا نادانی ہے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی راز کو قبل از وقت ظاہر نہ کیا جائے۔ مگر حضرت لقمان جو اسی قوم سے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حکمت عطا کی گئی تھی اُنھوں نے دیکھا تو اُن کے دل میں بھی یہی سوال پیدا ہوا کہ یہ کیا ہے، اور کیوں ہے؟ مگر ان کی حکمت نے اُن کو سوال کرنے سے روکا اور اپنے دل میں کہا، جو بات آگے چل کر معلوم ہو ہی جائے گی اُس کے متعلق سوال کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ آخر جب داؤد علیہ السلام نے زرہ، خود، اور جوشن وغیرہ تیار کر لیا اور وقت آیا کہ اس کا استعمال لوگوں کو بتایا جائے تو آپ نے زرہ پہن کر لقمان علیہ السلام سے فرمایا "یہ زنجیروں کی ایک قمیص ہے جو میدانِ جنگ میں تلوار کی کاٹ سے جسم کی حفاظت کرے گی۔ اور یہ چیزیں اس اس کام کی ہیں، ان کے استعمال کا یہ طریقہ ہے مگر ان سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے جدال وقتال میں زیادتی حرام ہے۔

سلیمان علیہ السلام

حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ اور نبی ہوئے۔ قرآن اور دیگر کتب سماوی توریت اور انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سلطنت کے مطابق اور کوئی سلطنت نہ تھی۔ قرآن فرماتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خدایا، مجھے ایسی سلطنت عطا کر جو نہ گزشتہ کسی کے پاس رہی ہو نہ آئندہ کسی کو ملے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی۔ اور اُن کو ایسی

Marfat.com

سلطنت بخشی جو گزشتہ یا آئندہ کسی بادشاہ کو نہ ملی۔ اُن کی سلطنت کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انسانوں پر ہی نہیں، بلکہ حیوانات وجنّات وغیرہ پر بھی حکومت کرتے تھے۔ جنات اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری بجالاتے اور حیوانات اُن کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ لمحہ لمحہ اُن کو اطلاع دیتے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے اور کون کس حال میں ہے۔

ہُدہُد کی غیر حاضری

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے جلسہ کیا جس میں تمام جنّات، حیوان اور انسان کے نمایندے بلائے گئے۔ لیکن جلسہ کے وقت ہُدہُد حاضر نہ تھا۔ (یہ ایک چھوٹی چڑیا ہے جسے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں۔ اس کی چونچ لمبی اور سر پر ایک تاج ہوتا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے کھاتی اور اپنی لمبی چونچ سے درختوں کو کھوکھلا کرکے گھر بناتی اور اس میں رہتی ہے۔) حضرت سلیمان علیہ السّلام نے پوچھا، ہُدہُد کہاں ہے؟ کیوں حاضر نہیں ہوا؟ اور حکم دیا کہ اُسے حاضر کریں۔ اگر اُس نے عذرِ معقول پیش نہ کیا تو اُسے سزا دی جائے گی۔

شہرِ سبا

جب ہُدہُد حاضر ہوا تو اُس نے بتایا، کہ میں ہوا میں پرواز کرتے ہوئے ایک شہر سے گزرا، جہاں ایک ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اُس کے پاس ایک عظیم الشان تخت ہے، اُس کی رعایا شاد و خوش حال ہے۔ لیکن وہ سب بت پرستی اور آفتاب پرستی کرتے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی سلیمان علیہ السّلام کی رگِ نبوت میں حرکت پیدا ہوئی۔ انھوں نے ایک خط لکھ کر ہُدہُد کو دیا اور کہا۔ "اگر تو سچا ہے تو یہ خط لے جا کر اُس ملکہ کی گود میں ڈال دے اور دیکھ کہ وہ اس کا کیا جواب دیتی ہے۔" ہُدہُد نے وہ خط لے جا کر ملکہ کی گود میں ڈال دیا۔ ملکہ نے اپنے سرداروں کو جمع کرکے وہ خط سنایا جس میں لکھا تھا۔ "بالتحقیق یہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور اللہ کے نام سے شروع کیا جاتا ہے، جو مہربان اور بخشش کرنے والا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ

Marfat.com

تم مجھ سے سرکشی نہ کرو اور مسلمان ہو کر مجھ سے مل جاؤ۔" یہ خط سُنا کر ملکہ بلقیس نے اپنے سرداروں سے کہا۔ "میں تنہا تو کوئی کام نہیں کرتی۔ تم سے مشورہ کر لیتی ہوں۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ میں اس کا کیا جواب دوں؟" اُس کے سرداروں نے کہا۔ "ہم تو بڑی قوت والے ہیں۔ جنگ سے نہیں ڈرتے۔ باقی تم ہماری ملکہ ہو، تم جیسا حکم دو گی ویسا ہی کریں گے۔" بلقیس نے کہا "دیکھو یہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے بے عزّت اور خراب کر دیتے ہیں۔ اس لیے جنگ کا خیال کرنا تو مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ تحفہ تحائف بھیج کر دیکھتی ہوں کہ وہ موافقت کی طرف قدم اُٹھاتے ہیں، یا مخالفت اختیار کرتے ہیں۔"

شانِ نبوت

جب بلقیس کے سردار تحفے لے کر سلیمان کے پاس آئے تو اُنھوں نے کہا "مجھے تمھارے تحفہ تحائف اور مال و دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس سے بہتر دولت و نعمت عطا کی ہے۔ تم واپس لے جاؤ اور بلقیس سے کہہ دو کہ وہ آ کر اُس خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لائے جس نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے اور اپنی رعایا کو بھی اسلام کی تلقین کرے۔ ورنہ اگر ہم خدائی لشکر لے کر تمھاری طرف آئے تو تم اس کا مقابلہ نہ کر سکو گی۔" پھر بلقیس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا اور کہا۔ "یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اُدھر جائیں، اور اُن سے بات چیت کریں۔ یا وہ ہماری بات مان لیں گے یا ہم اُن کی۔ مصالحت سے کام نکالنا بہتر ہے۔ اگر جنگ ہوئی تو فساد برپا ہو گا اور ملک خراب ہو جائے گا۔

ملکِ دل

ملکہ بلقیس نے صحیح کہا کہ جب کوئی بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتا ہے تو وہ برباد ہو جاتا ہے۔ اس سے ہمیں ایک لطیف اشارہ یہ ملتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ بھی جو بادشاہِ کل اور مالکِ حقیقی ہے جب اپنے کسی بندے کے ملکِ دل میں تشریف فرما ہوتا ہے تو اُس کے سوا تمام چیزیں دل سے نکل جاتی ہیں۔ اور دل ماسوا سے خالی ہو جاتا ہے۔ وہ صرف

Marfat.com

خدائے وحدہٗ لاشریک کا عرش ہوجاتا ہے۔ یہی معنی ملک دل کی بربادی کے ہیں۔ اور واقعتہً یہ دل کی بربادی نہیں بلکہ حقیقی آبادی ہے۔ بربادی ماسوی اللہ کے اعتبار سے ہے۔ اس مثال کو اپنے باطن پر منطبق کرنے سے بڑے اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمارا دل شہر سبا ہے جس پر بلقیسِ نفس حکومت کرتی ہے۔ جو بتوں' یعنی اپنی خواہشات کی پرستش میں مبتلا ہے۔ اور خدا کی فرمانبرداری اور عبادت بجا نہیں لاتی، تو سلیمانِ روح 'جس کا کام خدا کی مخلوق کو خدا کی طرف رجوع کرنا ہے بلقیسِ نفس کو اسلام کی تلقین کرتی ہے۔ اور جب بلقیسِ نفس تجربات سے کام لیتی ہے اور دیکھتی ہے کہ سلیمانِ رُوح طاقت ور اور زبردست حاکم ہے تو وہ اس سے موافقت کی راہیں تلاش کرنے لگتی ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے سلیمانِ رُوح اور بلقیسِ نفس میں موافقت ازدواجی قائم ہوگئی تو ملکِ دل پر اسلامی حکومت یعنی حکومتِ الٰہی قائم ہوجاتی ہے۔

تختِ بلقیس

جب سلیمان علیہ السلام کو بلقیس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے اپنے درباریوں اور سرداروں سے فرمایا۔ "کیا تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو بلقیس کے آنے سے پہلے اُس کا تخت اُٹھا لائے۔"؟ درباریوں میں سے ایک دیو نے کہا" قبل اس کے کہ تم دربار برخاست کرو، میں اُس تخت کو اُٹھا لاؤں گا۔" لیکن سلیمانؑ کے وزیر آصف' نے 'جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمِ کتاب (یعنی اسماء وکلامِ الٰہی کا علم) حاصل تھا' کہا۔" قبل اس کے کہ تمھاری پلک جھپکے میں اُس تخت کو لے آتا ہوں۔" معاً سلیمان علیہ السلام نے آنکھ کھول کر دیکھا وہ عظیم الشان تخت دربار میں موجود تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ دربار کے دروازوں سے کسی طرح نہیں نکل سکتا تھا۔ اور یہی کرامت تھی کہ نہ چھت ٹوٹی' نہ دروازے کشادہ کیے گئے، اور تخت دربار میں آگیا۔

معجزہ، کرامت اور استدراج

(ان تینوں کا تفصیلی بیان "مینائے مصطفائی" دَورِ اوّل صفحات ۶۷، ۱۱۹، ۱۲۱، ۲۲۵، ۲۲۶ میں دیا گیا ہے

Marfat.com

وہاں ملاحظہ فرمائیں) یہاں تختِ بلقیس کے واقعہ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ معجزہ نہ تھا کیونکہ وہ بظاہر حضرت سلیمان کی طرف سے ظاہر نہیں ہوا۔ اگر وہ خدا سے دعا کرتے تو اُن کے ذریعہ یہ معجزہ ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر وہ زمانے کی ترقی اور ارتقائے بشری سے یقیناً مطلع تھے کہ ایک زمانے میں انسان اپنی مادّی طاقت اور فنّی ترقی کے ذریعے ہزاروں یا لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار حاصل کرے گا۔ اور اس وقت اس کارنامہ کی شانِ معجزہ باقی نہ رہے گی۔ اور یہ استدراج بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ دیو استدراج سے کام لیتا ہوگا۔ اور یہ نبی کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی مستدرج کے عمل کو ممدوح بنائے۔ لہٰذا یہ کرامت کی قسم سے ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آصف بن برخیا کی طرف سے ظاہر ہوئی، جو سلیمان علیہ السلام کے کامل متبع اور اُن کے وزیر تھے۔ جنھوں نے علم اسمار و کتابِ قدرت کے ذریعہ تختِ بلقیس کو دربار میں پہنچا دیا۔ تاکہ شانِ معجزہ قائم رہے اور استدراج کی اہمیت کم ہو جائے۔ اور ہدایت کے طلبگار منکرین نبی کے معجزہ اور اولیار کی کرامت کو استدراج سے ممیز کر سکیں۔ اور انھیں حضرت خاتم الانبیار صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے والے واقعہ معراج کے متعلق شک و شبہ نہ رہ جائے کہ جب ایک نبی کے ایک امتی کے ذریعہ یہ کرامت ظاہر ہو سکتی ہے کہ ایک جمادی بے جان شے دُور دراز مقام سے طرفۃ العین میں پہنچ جائے تو کیا خدا کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ ایک جسمِ نورٌ علیٰ نور کو طرفۃ العین میں قاب قوسین تک سیر کرا کے واپس پہنچا دے اس واقعۂ تختِ بلقیس سے ایمان کا تکامل اور ذہنیتِ بشری کا ارتقار بھی مقصود ہو سکتا ہے۔

علمِ اسمار و سائنس

اگرچہ واقعۂ تختِ بلقیس موجودہ سائنس کے نزدیک کچھ زیادہ محیّر العقول نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ آج کی سائنس نے خود محیّر العقول رفتار حاصل کر لی ہے۔ لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ سائنس کے تمام کارناموں میں کونسی طاقت کام کرتی ہے، فنّی و مادی طاقت ہے یا روحانی؟ تو آپ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں

Marfat.com

کہ یہ روحانی طاقت نہیں ہے۔ کیونکہ روحانی امور مادی طاقت کے محتاج نہیں۔ اس لیئے صاحبانِ علمِ اسماء، وہ تمام نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو سائنس کو میسر ہے۔ مگر سائنس روحانی طاقت سے محروم ہے۔ پھر بھی ہم موجودہ زمانہ میں فنّی و سائنسی امور کو روحانی طاقت سے .... اور روحانی طاقت کو فنّی و سائنسی تجربات سے روکنے کے حامی نہیں ہیں۔ بلکہ ان دونوں طاقتوں کا مالک ہونے اور ان کو ہموار و ہمنوا بنانے کے طرفدار ہیں، اور ارض و سما کی ہر چیز کو اپنی تسخیر میں لانے کے علاوہ انسان کو نورانی و روحانی طاقتوں سے بھی بہرہ ور ہونے کے متمنّی ہیں۔ تاکہ انسان ان دونوں طاقتوں کے ذریعہ مشیئتِ قدرتِ مطلقہ سے آگاہی حاصل کر کے، اس کے تبلائے ہوئے راہِ تکامل پر چل کر سرمنزلِ معرفت پر جو حقیقی نصب العینِ انسان و انسانیت ہے پہنچ سکے۔

مذہب اور سائنس

دین اسلام نے کسی علم و فن کے حصول کی ممانعت نہیں کی ہے سائنس اگرچہ فنّی اور برقی طاقت سے متعلق ہے۔ لیکن ہمیں بالضرور اس کا علم حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سائنس میں اس درجہ پھنس کر رہ جائیں کہ علمِ وسمار کا انکار کر دیں اور اُس کے حصول کی طرف راغب نہ ہوں۔ دین و مذہب تو علمِ سائنس سیکھنے کی کھلی اجازت دیتا ہے، لیکن سائنسداں نہ صرف یہ کہ اسلام، روحانیت اور علمِ اسمار سے انکار کرتے ہیں، بلکہ تمام انسانوں کو اس سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ سائنس کوئی طاقت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی طاقت کا اعتراف کرتے ہوئے چاہتے ہیں کہ اس کو انسانیت کے لیے مفید اور باعثِ فلاح طاقت بنانے کی کوشش کی جائے۔ برخلاف اس کے سائنسداں مذہب و روحانیت کی طاقت ہی سے انکار کرتے ہیں اور اسمار و کلام کی طاقت کو تسلیم کرنے کیلیے اب تک تیار نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر روحانیت کو

Marfat.com

ترقی ہوئی تو سائنس کا وقار گر جائے گا۔ اور یہی دلیل اس بات کی ہے کہ سائنس روحانیت سے برتر نہیں ہے۔ اور علم اسماء و کلام کے مقابلے میں اس کا وجود دوسرے نمبر پہ ہے۔ جو اب تک انسان کو استدراج کی طرف کھینچ لینا چاہتا ہے۔ اس کے نظریے اور نصب العین کو صحیح راستے پر لانے کی ضرورت ہے۔

سائنس کے مواقع

سلیمان علیہ السلام کے قصے سے جو قرآن نے بیان کیا ہے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام جس طرح حیوانات اور اجنہ سے کام لیتے تھے اسی طرح روحانیت سے بھی کام لیتے تھے۔ لیکن اِن دونوں طاقتوں کے استعمال کے جداگانہ مواقع ہوتے تھے۔ جہاں روحانیت سے کام لینے کی ضرورت ہو وہاں جنی طاقت اور جہاں جنی طاقت سے کام لینے کی ضرورت ہو وہاں روحانیت سے کام لینا محل ناشناسی ہے روحانیت کا ایک اہم فیصلہ یہ ہے کہ جس طاقت سے حملہ کیا جائے اسی طاقت سے اُس کا دفاع کریں۔ جیسے امام حسین علیہ السلام نے کربلا کی مادی اور آلاتی جنگ میں روحانیت سے کام نہیں لیا۔ اور خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے جیپال یوگی کے استدراج کے مقابلے میں اپنی روحانیت سے کام لیا۔ اور پرتھی راج کی مادی طاقت کو شہاب الدین غوری کے سپرد کر دیا۔ اس طرح از روئے اسلام سائنسی ایجادات کے استعمال میں موقع شناسی کا حکم حاصل ہوتا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم روحانی کاموں میں سائنس کو استعمال نہ کریں۔ ہاں، مادیات میں جہاں تک کام نکالنے ضرورت ہے ہم سائنس سے کام لے سکتے ہیں۔ مذہب نہ سائنس کی بالکلیہ تردید کرتا ہے اور نہ اُس کی پرستاری کی اجازت دیتا ہے۔ سائنس کو چاہیے کہ وہ مذہب کے ذریعہ روحانیات میں خدا کی قدرت کا بھی مشاہدہ کرے۔ سائنسداں مذہب سے ٹکر نہ لیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ روحانیات سے ٹکر لینے والے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی

Marfat.com

ہے کہ مذہب اور سائنس کے درمیان اعتدال پیدا کیا جائے۔

سلیمان و بلقیس

سلیمان علیہ السّلام نے اپنے دربار کے فرش کو آئینہ بنا دیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چھچلے تالاب میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اور اُس میں در و دیوار کا عکس نظر آرہا ہے۔ جب بلقیس دربار میں پہنچیں اور انھوں نے دیکھا کہ نیچے پانی بھرا ہوا ہے تو اپنے لباس کو ٹخنوں سے اوپر اُٹھا لیا تاکہ پانی میں اُترنے سے بھیگ نہ جائے لیکن جب پاؤں رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی نہیں ہے۔ اور وہ اپنی اس ناواقفیت پر شرمندہ ہوگئی۔ بلقیس کی یہی شرمندگی سلیمانؑ کی پہلی فتح تھی۔ کیونکہ انھوں نے بغیر بحث و کلام کے ثابت کردیا کہ وہ اصل حقیقت سے کتنا واقف ہیں۔

مظاہر عالم

یہی حال آئینۂ مظاہر عالم کا ہے کہ انسان جب مظاہر کائنات میں شیونات کا ظہور دیکھتا ہے تو اُسے یا تو ماسوی اللہ سمجھ کر اُسے خدا کا غیر یا اُس کی ضد ہونے کا یقین کرلیتا ہے۔ حالانکہ فرما دیا گیا۔ لَا غَیْرَ لَہٗ وَلَا ضِدَّ لَہٗ (اُس کا کوئی غیر ہے نہ اس کا کوئی ضد)۔ اور یا اُسے مثل و مانند سمجھ کر اُس کے عینِ خدا ہونے کا یقین کرتا ہے اور پرستش کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ فرما دیا گیا لَا مِثْلَ لَہٗ وَلَا مِثَالَ لَہٗ۔ (نہ اُس کی کوئی مثل ہے نہ مثال)۔ جس طرح بلقیس نے فرشی آئینے کو نہیں پہچانا اور پانی سمجھا، اسی طرح انسان سورج کو نہیں پہچانتا اور اس میں خدا کا عکسِ جمال دیکھ کر اسی کو خدا سمجھ لیتا ہے اور اُس کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ یہ دونوں حالتیں غلط ہیں۔ یہ مظاہر عالم نہ عینِ اسمائے خدا ہیں اور نہ غیر اسمائے خدا۔ بلکہ مظاہر اسمائے الٰہی ہیں۔ اور اسمائے الٰہی نہ عینِ صفاتِ خدا ہیں نہ غیر صفاتِ خدا بلکہ اعتباراتِ صفاتِ خدا ہیں۔ اسی طرح صفات نہ عینِ ذاتِ خدا ہیں نہ غیر ذاتِ خدا بلکہ کمالاتِ ذاتِ الٰہی ہیں۔ اور یہ زائد بر ذات بھی نہیں ہیں، کیونکہ مخلوق ہی زائد بر ذات کا حامل ہوسکتا ہے۔ خالق کے لیے زائد بر ذات کا تصور ممتنع ہے۔

Marfat.com

جو لوگ اپنی ذاتِ وہمی کی مانند اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھتے ہیں وہ انھیں اشتباہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے معرفت ذاتِ الٰہی عقل و فہم کی دسترس سے وراء الوراء ہے، جو نفی و اثبات کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی معرفت نہ سلبِ کلّی میں حاصل ہوتی ہے نہ ایجابِ کلی میں ۔ بلکہ سلب و ایجاب کے درمیان کی حالت وہ معرفتِ معتدل ہے جہاں عجز واقع ہوتا ہے۔ یہی حقیقی معرفت ہے ۔ یعنی جہاں ہم کہیں خدا نہیں ہے وہیں خدا ہے۔ اور جہاں کہیں یہ خدا ہے وہ خدا نہیں ہے ۔ جلّ شانہٗ و جلّ جلالہٗ ۔

موعظۃ الحسنہ سلیمان علیہ السّلام نے بلقیس کی حالت سے معلوم کر لیا کہ وہ اس حکمت سے متاثر ہو گئی ہے۔ اور اس کی شرمندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیا ہے۔ آپ نے اُسے عزّت کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا اور پوچھا۔ "کیا تمھارا تخت ایسا ہی ہے؟ بلقیس نے کہا "یہ تو جیسے بالکل میرا ہی تخت معلوم ہوتا ہے" کیونکہ اُس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میرا وہ عظیم الشان تخت مجھ سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا۔ اور یہ باہر سے دربار میں کیونکر آسکتا ہے۔ یہ تو دربار کے اندر ہی بنایا گیا ہوگا۔ پھر سلیمان علیہ السّلام نے کہا "یہ تمھارا ہی تخت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہاں پہنچ گیا ہے۔ میں اُسی قادرِ مطلق خدا کا پیغمبر ہوں۔ اور یہ کام میرے وزیر آصف نے اسماء و کلام کی لطیف روحانیت سے انجام دیا ہے اور پلک جھپکنے کی مدّت میں تمھارے دُور و دراز ملک سے یہاں اُٹھا لیا ہے۔" اُس وقت بلقیس خدا کی قدرت اور سلیمان علیہ السلام کی نبوّت پر ایمان لائی۔ اور کہا۔ "اے میرے پروردگار، میں نے بتوں کو پوج کر اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اب میں اللہ کے لیے جو پروردگارِ عالم ہے سلیمان علیہ السّلام پر ایمان لاتی ہوں۔ اور اُس کے ساتھی بھی ایمان لائے ۔ اور سب نے اُن کی متابعت اختیار کی۔ یہ تھا اندازِ تبلیغ رسالت کہ

Marfat.com

بغیر کسی مقابلہ اور جد وجہد کے سلیمان علیہ السلام نے رُوح کو رُوح سے متاثر کیا۔ اور عقل و فراست سے وہ کام لے لیا جو جنگ وجدال، فتنہ وفساد، تیر وتلوار، بحث ومباحثہ اور کفر وبدعت کے فتاوے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ طریقے موعظۃ الحسنہ کے نہیں ہیں۔ ان میں ضد بڑھ جاتی ہے اور انسان ضد میں حقائق کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ امورات تبلیغ میں انتہائی اعتدال پسندی کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ کسی بندۂ خدا کو حق وحقیقت کی طرف متوجہ کرے تو حکمت و دانائی اختیار کرنا چاہیئے۔ کلام کی نرمی دل کے ساتھ رُوح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس امت کے وہی علماء کار تبلیغ میں کامیاب ہوئے ہیں جنھوں نے اس راز کو جانا اور حُسنِ مواعظت سے کام لیا ہے۔ اور وہ علماء جنھوں نے اپنی تبلیغ میں شدت وسختی اختیار کی وہ سوائے اس کے کہ اپنا ایک الگ گروہ بنا کر اور لوگوں میں افتراق پھیلا کر چلے گئے کوئی صحیح کام اُن سے نہ ہو سکا۔

بلقیسِ نفس

جب ملکہ بلقیس نے اپنی سلطنت کے ساتھ خود کو بھی سلیمانؑ کے حوالے کر دیا تو چونکہ سلیمان علیہ السلام عادل حاکم اور انسانوں کے مقامات کو جاننے والے تھے اس لیے فرمایا کہ جب تم نے اپنی سلطنت اللہ تعالیٰ کے سپرد کی تو اللہ تعالیٰ کی شکوریت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمھیں اس سے بہتر سلطنت وحکومت عطا کرے۔ اب تم، میری اور اپنی سلطنت کی ملکہ ہو اور میں اپنی اور تمھاری سلطنت کا بادشاہ۔ جس طرح زوج زوج مل کر ایک فرد کامل ہوتے ہیں، اسی طرح یہ دونوں سلطنتیں مل کر ایک کامل سلطنت بن گئی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل واکرام ہے۔ اس تمثیل کو اگر اپنے باطن پر مطابق کریں تو کتنا بہتر نتیجہ نکلتا ہے، کہ جب بلقیسِ نفس نے سلیمانِ روح کی موافقت اور قربت اختیار کی تو بلقیس نفس کو عالم مادی کی سلطنت کے ساتھ عالم روحانیت پر بھی قبضہ واختیار حاصل ہو گیا۔ وہ پہلے رُوح سے جدا ہو کر

Marfat.com

اپنی خواہشات کی پرستش میں مبتلا تھی۔ اب روح سے وابستہ ہو کر خدا پرستی اور حق آگاہی کی طرف مائل ہو گئی۔ جب روح میں فنا ہوئی تو اُسے روحانی بقا حاصل ہو گئی۔ اُس نے اپنی سلطنت کو خدا کے لیے چھوڑا تو ساری دنیا کی سلطنت اُسے حاصل ہوئی۔ اُسے وہ سرور و اطمینان نصیب ہوا جس نے اُس کو مقامِ تسلیم و رضا پر پہنچا دیا۔ اسی مطمئن نفس کو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں یوں مخاطب فرمایا ہے۔ "یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (اے نفسِ مطمئنہ راضی برضا ہو کر اپنے پروردگار کی طرف رجوع ہو جا (یعنی میرے دربار میں حاضر ہو جا) پھر میرے خاص بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا) اور جب وہ راضی بہ رضا ہو کر (اپنی اسی زندگی میں۔) اللہ تعالیٰ کی جنت میں داخل ہو گئی تو ہر قسم کے مالوفاتِ جسمانی و دنیاوی کے علاوہ مالوفاتِ روحانی و ملکوتی بھی اُسے عطا کیے گئے۔ یہی بقائے جاوید ہے۔ یہی اعتدالِ اسلامی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے دینِ وسط فرمایا اور پسند کیا۔

عیسیٰ علیہ السلام پھر جب قوم بنی اسرائیل ظلم وستم پر اُتر آئے اور ان میں بے اعتدالی اتنی شدت سے پیدا ہو گئی کہ انبیاء کو قتل کرنے لگے تو اُن کو اس افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال پر لانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اور چونکہ ان میں دنیا کی محبت افراط سے تھی اس لیے عیسیٰ علیہ السلام نے اسے کم کرنے کے لیے، نہ اپنا مکان بنایا۔ نہ شادی کی، نہ اولاد ہوئی، نہ دولت جمع کی۔ ایک تہمد اور چادر پہنتے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے اور خلق اللہ کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے معجزات سے کام لیتے اور لوگوں کو دینِ حق کی تبلیغ فرماتے۔ کچھ مل جاتا تو فبہا، افطار کر لیتے ورنہ مسلسل روزے رکھ کر کاٹ دیتے۔ جب قوم بنی اسرائیل اُن کی تعلیمات سے آشنا ہونے لگی تو شیدائیان و پرستارانِ حکومت و سلطنت کو فکر لاحق ہوئی کہ وہ عوامی طاقت حاصل کر کے بادشاہت اختیار کریں گے اور اُن کی حکومت خطرے میں

Marfat.com

پڑ جائے گی۔ اس لیے اُن کو گرفتار کر کے اپنے نزدیک سولی پر چڑھا یا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے انھیں سولی سے بچا کر رفعت عطا فرمائی۔ اُن کے ترفّع کے بعد اُن کے بارہ حواریوں نے جو دینِ الٰہی کی تبلیغ کر کے کارِ نبوت کو مدد دینے کی وجہ سے نصاریٰ کہے جاتے تھے، توحید کا سبق دینے اور روحانیت پھیلانے کا کام انجام دینا شروع کیا۔ لیکن جب اُن کے ساتھ منافقین اور غدّارانِ انسانیت شامل ہوئے تو انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی حقانیت اور اسباقِ رسالت کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ کتابِ آسمانی میں تحریف کی۔ اور حق و صداقت کا راستہ کذب و بطلان میں مخلوط ہو کر رہ گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی تھیں، انھیں اپنی کتابِ محرفہ سے نکال دیا۔

خاتم الانبیاء

اس وقت دنیا میں آسمانی کتب کی متبعین دو قومیں برسرِ اقتدار تھیں، ایک یہود جو مادیت کے چکر میں گرفتار اور دولت و تموّل کے نشے میں سرشار تھے۔ اور دوسرے نصاریٰ جو روحانیت کے غلبہ میں چور اور رہبانیت کے جذبہ سے مجبور ہو کر بحالتِ تفریط اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ سچی اعتدال پسندی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور بندگانِ خدا کو افراط و تفریط سے بچا کر درمیانی صراطِ مستقیم پر چلایا جائے۔ پس اللہ تعالےٰ نے وجودِ مقدسِ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ جنھوں نے دنیا کو آسان، فطری اور معتدل راستے کی ہدایت فرمائی کہ نہ تم یہودیوں کی طرح روحانیت سے دست بردار ہو کر سرتاپا دولت و مادیت میں غرق ہو جاؤ اور نہ نصاریٰ کی طرح دنیا کو بالکل ترک کر کے رہبانیت اختیار کرو، بلکہ وقت داں اور موقع شناس بن جاؤ، جو وقت جس کام کا آجائے اُس وقت وہی کام انجام دو۔ عبادت کے وقت عبادت بجالاؤ اور دنیاوی امورات کے وقت دنیا کا کام پورا کرو۔ کاشتکاری کا موقع ہو کاشتکاری کرو۔ تجارت سامنے آئے

Marfat.com

تو سمجھ بوجھ کر اُسے انجام دو۔ ملازمت کی ضرورت پڑ جائے تو اُس میں بھی ایمان اور صلاحِ عمل سے پیچھے نہ ہٹو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر حال میں عبادات و روحانیات کے لیے جو اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں اور جو حالتیں بتا دی گئی ہیں اُنھیں اپنے اپنے وقت و حالت کے مطابق انجام دیتے رہو۔ یہ ہے معتدل بندگی اور صحیح راہِ نجات۔ اگر اس پر چلتے رہے تو یقیناً منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔

رسولؐ کی عملی زندگی

اس تدریس و تعلیم و تبلیغ میں، یہی نہیں کہ صرف الفاظ و بیان اور اجرائے قوانین پر اکتفا کی جاتی، حضور آقائے نامدار نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود عمل کر کے دکھایا، اور اُس کے نتیجے سے دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کاشت بھی فرمائی، کھجور کے باغات لگائے۔ کیاریوں میں پانی دیا اور فصلوں سے نفع اُٹھا کر دکھایا۔ آپؐ نے تجارت بھی کی، اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو اُن کی امّید سے زیادہ منافع لا کر دیا۔ حضورؐ نے سرداری، شہسواری اور لشکر کشی بھی فرمائی، میدانِ جنگ میں کامیاب ترین سپہ سالار کے فرائض بھی انجام دیے، ازدواجی زندگی میں بلند ترین اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا اور عبادت کے اوقات میں پائے مبارک کو متورّم کر کے دکھا دیا۔ یہ تھی رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ عملی زندگی جسے آپؐ نے عالمِ انسانیت کے لیے نمونہ بنایا۔ اور اسی کا نام دینِ اسلام رکھ کر انسانوں کو دعوت دی کہ لوگ آئیں، اور یہ صحیح، سچا اور سیدھا راستہ اختیار کر کے اپنے معراجِ کمال کو پہنچیں۔

مسلمان کی شان

رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس عملی زندگی کے سایے میں ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ مسجد کا پیش امام ہونے کے ساتھ اپنے کردار و اخلاق کے ذریعہ مصلحِ قوم اور حق و صداقت کا معلّم بھی ہو۔ خطیب ہونے کے ساتھ زہد و اتقا کا نمونہ بھی پیش کرے۔ ازدواجی زندگی کے عیش و تنعم کے ساتھ میدانِ کارزار میں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جانباز

Marfat.com

سپاہی بھی ہو۔ تاجر ہونے کے ساتھ عامّۃ الناس کی بھلائی و بہبود کا خواہاں بھی ہو۔ ملازم ہونے کے ساتھ حاکم و محکوم کے حقوق کا محافظ بھی ہو۔ مزدور ہونے کے ساتھ ایماندار بھی ہو۔ اور اگر خدا حکومت و اقتدار عطا فرمائے تو عادل بھی ہو۔ وہ سب کچھ ہو مگر رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ یہ ہے حقیقی مسلمان کی شان۔ پس امّتِ محمّدیہ کا سچا دعویدار وہی ہے جو اس شان کا مسلمان ہو۔ ورنہ نام کا مسلمان ہونا خدا کے نزدیک کار آمد نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دارِ عمل یعنی کارخانۂ قدرت میں نام نہیں کام چاہتا ہے۔ اور ہر کام میں خلوصِ نیّت کو دیکھتا ہے۔

راہِ اعتدال

پس اے انسانو، اور اے مسلمانو! راہِ اعتدال پر آجاؤ۔ دولت دنیا پیدا کرو مگر دنیا کو دل کے مندر میں سجا کر اس کی پوجا نہ کرو۔ حکومت و سلطنت حاصل کرو مگر اُس کے غلام نہ بن جاؤ۔ ازدواجی زندگی اختیار کرو مگر عبادت کے اوقات کو نہ بھول جاؤ۔ تم میدانِ جہاد میں کشتوں کے پُشتے لگا دو مگر ناحق کسی کو طمانچہ نہ مارو، تم عاجزوں اور بےکسوں کے سامنے رواداری اور فروتنی سے کام لو، مگر ظالم کے طمانچہ پر اپنا دوسرا گال پیش نہ کرو، بلکہ اس کا ہاتھ مضبوط پکڑ کر اپنی طاقت کا اندازہ کرا دو کہ ہم تمھارے طمانچے کا جواب طمانچہ سے دے سکتے ہیں۔ مگر ہم مسلمان ہیں، ہم کو حلم کا سبق دیا گیا ہے۔ ہم کمزوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسلامی رواداری کی وجہ سے معاف کرتے ہیں۔ تم ہم سے نہیں، بلکہ ہمارے خدا سے ڈرو جو منتقمِ حقیقی ہے اور تم سے انتقام لے سکتا ہے یہ ہے وہ راہِ اعتدال جس کی اسلام نے تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو، بلکہ بنی نوعِ انسان کو اِس صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور کامیاب و بامراد رکھے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۳

مُلک و مَلکُوت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْخَالِقِ الْعَوَالِمِ۔ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ صَاحِبِ الشَّرِیْعَتِ وَالْخَاتَمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ الْکَامِلِیْنَ الْمُکَمِّلِیْنَ بِالْاَخْلَاقِ وَالْمَکَارِمِ۔

اعتبارات ماسوی اللہ کے دو اعتبارات ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے حس و ادراک کی حُدود میں داخل ہیں۔ اور دوسرے وہ جو حس و ادراک سے باہر ہیں۔ وہ ہستی و وجودِ ماسوی اللہ جو ہمارے احساسات و ادراکات اور علوم و تجربات میں داخل ہے عالمِ ملک، عالمِ شہادت یعنی یہی جو ظاہری دنیا کہی جاتی ہے۔ اور وہ جو ہمارے حواس کی حُدود سے باہر ہے عالمِ ملکوت، عالمِ غیب یا باطنی اور روحانی دنیا کہلاتی ہے ــــــــــــــــــــــــــــــــ۔ یہ باطنی اور روحانی دنیا چونکہ فرشتوں اور ارواح کی دنیا ہے۔ اس لیے اس کو عالمِ ملکوت کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہ ہمارے حواسِ ظاہر و باطن کی دسترس سے باہر ہے اس لیے اس کو عالمِ غیب کہتے ہیں۔ جس طرح عالمِ ملک عناصر و جمادات، نباتات و حیوانات سے مملو ہے اسی طرح عالمِ ملکوت ارواح و فرشتگان اور انوارِ ملکوتی سے سرشار و آباد ہے۔ اور مقام کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مانع نہیں جس طرح ملکوت فضا و خلا میں ہے اُسی طرح عالمِ مُلک کے باطن میں بھی ملکوت موجود ہے۔

Marfat.com

ملکوتِ کُل شئ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتا ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ. (ہاں) پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا ملکوت ہے اور تم سب اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو) اِس آیت میں "ملکوتِ کل شئ" کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کائنات کا ایک عالم "ملکوتِ آفاقی" عرشِ اعظم کے اوپر تک ہے اسی طرح ہر شے بلکہ ہر ہر ذرے کے باطن میں ایک عالم "ملکوتِ نفسی" ہے۔ اور اس ملکوتِ نفسی کے باطن میں "جبروتِ نفسی" اور اُس کے باطن میں "لاہوتِ نفسی" ہوتا ہے۔ ان ہی عوالم کے اعتبار سے انسان کو کائناتِ جامع یا عالمِ صغیر کہتے ہیں۔ اور خاصانِ خدا ہر مقام کو اپنے ہی باطن میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

عالمِ کن فیکون ہمارا جسمِ ظاہر عالمِ ناسوتِ نفسی ہے۔ جب ہم دروازۂ لطیفۂ قلب سے اپنے باطن میں داخل ہوتے ہیں تو ایک عالمِ نور نظر آتا ہے۔ یہ روحانی عالم ہے اسی کو ملکوت کہتے ہیں۔ یہی ہماری روحِ انسانی ہے۔ یعنی ہماری رُوح جس کو اللہ تعالیٰ نے "امرِ ربّی" کا خطاب دیا ہے۔ یہ رُوحِ انسانی قدیم سرمدی نہیں، بلکہ حادث و مخلوق ہے، جو ازل میں ملکوتِ کبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے "امرِ کُن" سے پیدا ہوئی ہے۔ اور چونکہ عالمِ ملکوت مخلوق و حادث ہونے کے باوجود ابدی ہے اس لیے یہ روحِ انسانی بھی ابدی یعنی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ یہ عالمِ ملکوت وہ عالم ہے جہاں عالمِ ناسوت کی طرح امورات کی انجام دہی میں اسباب و ذرائع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں جب ارادۂ الٰہی سے کوئی امر (حکم) ظاہر ہوتا ہے تو اس کا ظہور ہی ایک شکلِ خلقی اختیار کر لیتا ہے۔ اسی کو عالمِ "کن فیکون" کہتے ہیں۔

عالمِ ناسُوت یہ ہمارا یہی عالمِ ظاہر ہے جو حدودِ احساسات و عقول و فہوم کے درمیان واقع ہے۔ یہاں خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ اس عالم سے نکلنے کے بعد خواہشاتِ نفسانی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور انسان مشیئت و قدرتِ الٰہی کے ماتحت آجاتا ہے۔ یہاں ہر امر کے

Marfat.com

ظہور کے لیے اسباب و ذرایع کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر سبب و ذریعہ کے کوئی کام ظاہر نہیں ہوتا۔ سوائے قدرت، معجزہ اور کرامات کے کہ یہ ملکوتی امورات اس عالم اسباب و علل میں بھی بغیر سبب وعلت کے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے عقول کے واسطے باعث عجز ہوتے اور معجزہ کہے جاتے ہیں۔ بہر سال ہماری روح ہمارے جسم سے پہلے ازل میں پیدا ہو کر عالم ملکوت میں منبسط اور شاداں وفرحاں تھی۔ اور جب اس کے عالم ناسوت میں ظاہر ہونے کا وقت آیا تو پہلے صلب پدر میں ایک مادہ یا ہیولیٰ پیدا ہوا جس میں شکل انسانی اختیار کرنے کی استعداد و قابلیت موجود تھی اس کے بعد جب وہ ۹ ماہ کے لیے اپنے مستقر خاص میں جو اسی کام کے لیے مخصوص تھا ٹھہرا تو اس نے کامل شکل انسانی اختیار کی۔ گویا اُس کا جسم ایک ایسا مکان بنا دیا گیا جس میں مکین آکے ٹھہرے اور اپنے اس جمال و کمال کو ظاہر کرے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے ودیعت فرمایا تھا۔ چنانچہ جو جسم جس "رُوح" کے ساتھ زیادہ مناسبت و موافقت رکھتا تھا، اس جسم میں وہ روح داخل کی گئی۔ وہ جسم اس رُوح کے لیے بہت تنگ و تاریک تھا۔ اس لیے روح کا وہ انبساط جو عالم ملکوت میں اُسے حاصل تھا مفقود ہو گیا۔ اور وہ حالت انقباض میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے روح میں اپنے جمال و کمال کے اظہار کا جذبہ یعنی محبت و شیدائیت بھی ودیعت فرمائی تھی۔ وہ جسم کی کال کوٹھری میں اپنے ہی نور مناسبت کا عکس دیکھ کر اُس پر شیدا ہو گئی۔ اور اس قید خانہ کے انقباض کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔

بلوغ عقل انسانی

جس طرح ہمارا جسم رحم مادر میں ۹ ماہ رہ کر کمال شکل انسانی کو پہنچتا ہے۔ اُسی طرح ہمارا ذہن و دماغ ہماری عقل کے لیے رحم مادر ہے۔ جہاں وہ قویٰ و احساسات کے ذریعہ نشوونما پاتی اور تقریباً پندرہ سال میں حد بلوغ کو پہنچتی ہے۔ اس عرصہ میں وہ کائناتی و آفاقی مشاہدات سے خاص علوم حاصل کرتی ہے۔ اور ایک ایک

Marfat.com

چیز کو سوچ سمجھ کر اُس کا معیار مقرر کرتی ہے۔ وہ اپنے جسم کو دیکھتی ہے اور اُس سے ظاہر ہونے والے جمال و کمال کو مشاہدہ کرتی ہے، تو اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ جمال و کمال جسم مادّی کا خاصّہ نہیں۔ کوئی اور چیز ہے جس کا جمال و کمال اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور وہ اپنی روح تک پہنچ جاتی ہے۔ اور یقین کرتی ہے کہ اس جسم سے جو کچھ بھی جمال و کمال ظاہر ہو رہا ہے وہ جسم کا نہیں، بلکہ رُوح کا ہے۔

نیستانِ جمال و کمال

اب صاحب عقل انسان اپنی رُوح پر غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہ رُوح اس مقام مادّی یا عالم ناسوت کی چیز نہیں۔ اس لیے کہ وہ حواس کے ادراک سے ماوراء ہے۔ ایسی چیز ناسوتی نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ وہ ملکوتی ہوگی پس وہ اپنے وطن مالوف یعنی عالم ملکوت کا علم حاصل کرنے کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ وہ عالم اِس عالم سے کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے اور اس عالم مادّی کی طرح منتشر، مضطر اور متغیر نہیں ہے، بلکہ سرور و انبساط اور سکون و استقرار کا مقام ہے تو مضطرا اور بے چین ہو جاتا ہے، اور اپنے اصلی وطن اور عیش و عشرت کے مکان کو یاد کر کے گریہ و زاری، بے تابی و بے قراری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسانِ عاقل و کامل کی اسی حالت کو مولانا رومؒ نے نہایت لطیف اور عمدہ پیرایہ میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائیہا شکایت می کند

بانسری سے سنو، یہ کس کی کہانی سنا رہی ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ اپنی جدائی کا ماجرا بیان کر رہی ہے اور فراق کی شکایت کرتی ہے ـــ یہاں بانسری سے مولاناؒ کی مُراد انسانِ کامل ہے۔ کیونکہ بانسری میں سات سوراخ سُر، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت، نکھاد کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ اور بانسری کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ ساتوں سوراخ کھلے ہوئے اور اپنی مخصوص آواز

Marfat.com

قائم ہوں، یعنی بے سُرے نہ ہوں جس سُوراخ سے جو آواز نکلنی چاہیے اُس سے وہی آواز نکلے۔ اسی طرح انسانِ کامل کے سات ظاہری سُوراخ دو کان، دو آنکھ، دو ناک اور ایک منہ۔ یا سات باطنی سوراخ ایک لطیفۂ قالبؔ دوسرا لطیفۂ نفس، تیسرا لطیفۂ قلب، چوتھا لطیفۂ رُوح، پانچواں لطیفۂ سِرّ، چھٹا لطیفۂ خفی اور ساتواں لطیفۂ اخفیٰ ہوتا ہے۔ (ان کا بیان اس سے قبل کیا جا چکا ہے)۔ بانسری بالنسری میں جس کو کلانٹ کہتے ہیں دس سُوراخ ہوتے ہیں۔ جو انسان کے پانچ لطائفِ خلقی اور پانچ لطائفِ امری کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بھی یہی شرط ہے کہ یہ ساتوں یا دسوں سُوراخ کھلے ہوئے اور اپنی آواز پر قائم ہوں۔ (اگر بانسری کا کوئی سُوراخ بھی اپنی مخصوص اور سُریلی آواز نہ دے رہا ہو تو نَے نواز اُسے پسند نہیں کرتا اور اگر اس کی اصلاح نہ ہو سکے تو اُسے پتھر سے کچل کے پھینک دیتا ہے اسی طرح انسان ایک ایسی بانسری ہے جس کا نَے نواز خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ جب تک انسان کے یہ لطائف کارآمد اور کھلے ہوئے نہ ہوں اور سُریلی آواز نہ نکل رہی ہوں نَے نواز اُسے پسند نہ کرے گا) اس طرح مولاناؒ نے بانسری سے انسانِ کامل مراد لیا ہے جس کے یہ سوراخ کھُل گئے ہیں۔ جس طرح بانسری سے دردناک آواز میں فراق و جُدائی کی شکایت کی جاتی ہے۔ اسی طرح کامل انسان اپنی جُدائی اور فراق کو محسوس کرتا اور اُسے بیان کرتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ ؎

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

بانسری کہتی ہے کہ جب سے مجھ کو میرے اصلی وطن "نیستاں" سے کاٹ کر لائے ہیں اُس وقت سے میں ایسی دلدوز آواز میں نالہ کر رہی ہوں کہ جو مرد و عورت اُسے سنتا ہے رونے لگتا ہے۔ بعینہٖ یہی انسانِ کامل کی ہیئتِ کذائی ہوتی ہے کہ جو اُسے دیکھتا ہے یا اُس کا کلام سنتا ہے۔ اُسے اپنا اصلی وطن یاد آجاتا ہے اور اپنی حالتِ فراق کو محسوس کر کے رنج و غم میں گرفتار ہو جاتا۔ اور نالہ و فغاں اختیار کرتا ہے۔ اور یہی انسانِ کامل کی پہچان ہے کہ جو اُس کے پاس بیٹھے وہ خدا کو یاد

Marfat.com

کرنے لگے۔ پھر فرماتے ہیں۔ ؎

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

(بانسری زبانِ حال سے کہتی ہے، اگرچہ میں نے اپنے درد انگیز نالوں سے مرد و زن کو رُلا دیا ہے۔ مگر ابتک کوئی درد آشنا نہ ملا) مجھے ایک ایسے بیقرار اور درد آشنا کی تلاش ہے جس کا سینہ دردِ فراق سے چاک چاک ہو تاکہ میں اپنے دردِ اشتیاق کو اُس سے کہہ سکوں (اور وہ سمجھ سکے کہ میرے نالوں میں آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ مولانا رومؒ بلکہ ہر عصر کے انسانِ کامل کے دل میں محبوبِ مطلوب کا دردِ اشتیاق اس درجہ الم انگیز ہوتا ہے کہ وہ بے چین ہو کر دوسرے فراق آشناؤں کی تمنّا کرتا ہے تاکہ اپنے دردِ اشتیاق سے اُن کو اور اُن کے دردِ اشتیاق سے اپنے درد کو ہوا دے جس کی چنگاریاں پھیل کر ساری دنیا کو درد آشنا بنا دیں۔

انبساطِ رُوح

اولیاء اللہ یا پیغمبران علیہم السلام جو تعلیم دی ہے کہ معراجِ انسانیت حاصل کرو۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح تم عالمِ ملکوت سے اسباب کے ذریعہ اس عالمِ ناسوتِ انسانیت .... میں آ کر قید و بند میں مبتلا ہو گئے ہو اسی طرح واپس لوٹ کر عالمِ ملکوت میں اپنی وہی زندگی حاصل کرو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جب ہم کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو آج ہی ہم اُس کی طرف لوٹنے کی فکر کیوں نہ کریں۔ اسی مقصد کے لیے فرمایا ہے "مُوۡتُوۡا قَبۡلَ اَنۡ تَمُوۡتُوۡا!" مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ یعنی زندہ رہتے ہوئے اپنے اوپر موت کی حالت طاری کر لو۔

فطری خواہشات

درحقیقت انسان کی ناسوتی زندگی خواہشات کا ایک مجموعہ ہے۔ خواہشات کی دو قسم ہیں۔ ایک فطری اور دوسری نفسانی۔ فطری خواہشات میں حوائجِ ضروریۂ انسانیہ ہیں۔ (مثلاً کھانا پینا، سونا جاگنا۔ احتباس و استفراغ، حرکت و سکون) یہ وہ

Marfat.com

حوائج ضروریہ ہیں جو عالم ناسوت میں پیدا ہونے کے بعد لاحق ہوتے' اور ان کے متعلق خواہشات معلوم و نامعلوم ' بالارادہ اور بلا ارادہ ' پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ہاں ' اگر کوئی صاحب تصرف ولی کامل دستگیری فرمائے تو یہ خواہشات اس درجہ قابو میں آجاتی ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔

خواہشات نفسانی یہ حظ و لذت والی خواہشات ہیں ، جو احساسات میں سے کسی نہ کسی حواس سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً نرم و نازک اور لطیف اور سُریلی آوازوں کو سننے کی خواہش ' خوش رنگ اور جاذب نظر چیزوں کو دیکھنے کی ' خوشبویات و عطریات سونگھنے کی۔ لذیذ اور ذائقہ دار چیزیں چکھنے کی۔ اور حظ و لذت بخشنے والی چیزوں کو چھُونے ٹٹولنے اور دبانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہی دونوں خواہشیں انسان کی ناسوتی زندگی بن کر چھا جاتی ہیں۔ اگر حدِ اعتدال میں ہوں تو روحانیت میں معاون ہوں گے۔

ملکوت کی طرف دو قدم یہ دونوں خواہشیں اس درجہ انسان پر غالب ہوتی ہیں کہ انسان ان کا محکوم اور فرمانبردار بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ساری زندگی ان کی پوجا اور بندگی کرتا رہتا ہے۔ وہ جس قدر اس خواہشات کی فرمانبرداری کرتا اور ان کو پورا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اُتنا ہی یہ دُگنی چوگنی بڑھتی جاتی ہیں اور دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مقام ان کو نہیں روک سکتا۔ ہاں ' اگر کوئی رہنمائے طریقت مل جاتا ہے تو وہ اِن خواہشات کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں ڈال دیتا ہے۔ اُس وقت یہ خواہشات باقی رہتے ہوئے بھی شریعت کی پابند ہو کر سیر ملکوتی کی مانع نہیں ہوتی ہیں۔ اور جب یہ خواہشات شریعت کی متابعت سے قابو میں آجاتی ہیں تو وہ ایک قدم ملکوت کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اور دوسرے قدم پر جب یہ خواہشات اِس

Marfat.com

درجہ فنا ہو جاتی ہیں کہ نفس میں آنکھ ہی نہیں کھولتیں تو نفس قلب کے مقام پر آجاتا ہے جو ملکوت کا دروازہ ہے۔ اور انسان آسانی سے ناسوت کو چھوڑ کر ملکوت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وسعتِ ملکوت عالمِ ملکوت اتنا وسیع، عریض، پہن اور کشادہ عالم ہے کہ اس عالمِ ناسوت جیسے ہزار عوالم اُس کے ایک گوشہ میں پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔ جو انسان اس خواب کے سے عالم میں پہنچ جاتا ہے، وہ تا حدِّ نظر چاروں طرف اپنا ہی مکان و مقام پاتا ہے۔ اور اُس کی رُوح اس پہنائے عظیم میں منبسط ہوتی اور پھیل جاتی ہے۔ اس انبساط سے رُوح کا وہ ثقل معدوم ہو جاتا ہے جو اُسے عالمِ اجسام یا ناسوت کی پستی میں دبا رہا تھا۔ اب اس رُوح میں اتنا ہلکا پن پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نیچے اُترنے کی بجائے اوپر اُٹھتی اور اعلیٰ علیین تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مرنے کے مومنین و صالحین کی ارواح رہتی ہیں۔ اگر اس زندگی میں رہتے ہوئے کسی کی رُوح میں وہ انبساط پیدا ہو جائے جو اُسے علیین تک پہنچا دے تو گویا وہ عالمِ ناسوت کے اعتبار سے مر گیا اور عالمِ ملکوت میں چلا گیا۔ یہی مُوْتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوا کے معنی ہیں۔

قلبِ مؤمن عرش اللہ مؤمن کا دل چونکہ تابع روح ہوتا ہے اس لیے رُوح جتنا انبساط حاصل کرتی ہے قلب بھی اتنا ہی وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عرشِ اعظم سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ عرش پر استویٰ رکھتا ہے۔ عرش میں سماتا نہیں ہے۔ لیکن قلبِ مؤمن وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالےٰ سما جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے اسماء و صفات و شیونات سب مؤمن کے دل میں اُتر آتے ہیں۔ اور عرش اللہ تعالےٰ کا پانی پر بھی ہے وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ تمہارا امتحان کرنے کیلیے کہ تم میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

پانی پر اپنا عرش بنایا ہے۔

استویٰ علی العرش (استویٰ کے معنی میں موجودہ علماء کے درمیان عجب اعتقادی اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ ایک وہ علماء ہیں جو استویٰ کے معنی میں اللہ تعالےٰ کو عرش پر بیٹھا ہوا تصوّر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا اللہ تعالےٰ نعوذ باللہ جسمانیت وشخصیت رکھتا ہے کہ عرشِ اعظم پر اس طرح آکر بیٹھ گیا ہے جس طرح ایک بادشاہ اپنے تختِ سلطنت پر بیٹھتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ ۔ بیٹھنے، رُک جانے یا بالذات قائم ہو جانے کا تصوّر ہی اللہ تعالیٰ کی سبحانیت اور تنزیہ کے منافی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہے اور ذات کے اعتبار سے عرش پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اعتقاد بھی حقیقتِ واقع سے دُور ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو خواہ عینِ ذات نہ مانا جائے۔ مگر صفات کو غیرِ ذات یا ذات سے جُدا کیونکر مانا جا سکتا ہے جب کہ ذات وصفات بعینہٖ قدیم ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جہاں ذات ہو وہاں صفات نہ ہوں۔ یا صفات ہوں اور ذات نہ ہو۔ اگر ایسا تصوّر کیا جائے تو نعوذُ باللہ دو قدیم، یعنی ذات کو الگ قدیم اور صفات کو الگ قدیم ماننا پڑے گا۔ اس لیے کوئی صورت ذات وصفات کے جدا ہونے کی نہیں ہے۔ اسی طرح بعض دیگر علماء عجیب عجیب شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔

حقیقتِ استویٰ اُستویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو خلق فرمایا تو کائنات کی تسخیر بذریعۂ اسباب اُسے سپرد کر دی اور کائنات میں اُسے اختیار دے دیا۔ اور اپنے بلا واسطہ اختیار وامر کو عرشِ اعظم پر روک لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کے امر واختیار کے مقابلے میں کوئی اختیاری حرکت نہ کر سکتا اور

Marfat.com

جزا وسزا سے بری الذمّہ ہو جاتا۔ پس استویٰ علی العرش اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا استویٰ نہیں بلکہ امر واختیار کا استویٰ ہے۔ اور اس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔ وَاللہُ تبارک تعالیٰ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَتِہٖ۔)

قلبِ مومن کی وسعت

بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "میرا قلب عرشِ اعظم سے زیادہ وسیع ہے" بحالتِ سُکر فرمایا ہے۔ اس لیے اس قول کا اعتبار نہیں ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ کلام نتیجہٗ سُکر نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (کہ آپؐ نے فرمایا ہے قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَرْشِ اللہِ تَعَالیٰ) بحالتِ صحو "شہودی تصدیق" فرمائی ہے۔ اس قول کو سُکر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ عرشِ اعظم کو علم وادراک نہیں ہے۔ اور قلب مومن علم وادراک رکھتا ہے۔ یہ اپنے علم وادراک کے اعتبار سے عرشِ اعظم سے بڑا اور وسیع تر ہے۔ اور وہ اپنے علم وادراک اور محبّت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ اور اِس طرح تمام ایرادات ساقط ہو جاتے ہیں۔

مراتب کے اعتبار سے اختلافِ نظر

مظاہر کائنات کو نظر اُٹھا کر دیکھنے والے اپنے مرتبے کے اعتبار سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک عامی ہیں، ایک عالم اور ایک عارف — عامی کائنات کی ایک ایک چیز کو محض شئے سمجھتے اور دیکھتے ہیں۔ وہ اُسے نہ مصنوع جانتے ہیں نہ مخلوق، نہ مظہر جانتے ہیں نہ آثارِ افعالی۔ اُن کے نزدیک یہ ساری کائنات بس اشیائے مرئی کا اجتماع ہے۔ اور یہ چیزیں اتنی اور ایسی ہی ہیں جیسی نظر آرہی ہیں۔ ان کو نگاہ کی فریب خوردگی اور حقائقِ اشیاء کا کوئی علم نہیں۔ نہ کسی چیز کے باطن میں جھانک کر دیکھنے کی ضرورت۔ وہ حیوانات کے مرتبے پر ہیں۔ جس طرح حیوانات

Marfat.com

مظاہر کائنات اور اشیائے مرئی کو دیکھتے ہیں اُسی طرح وہ دیکھتے ہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے اُن سے پست ہیں کہ وہ حیوان ہو کر حیوان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ انسان ہو کر حیوان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پس ایسے ہی لوگوں کی بابت فرمایا ہے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ وہ جانور ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ۔ یہی لوگ غافلین ہیں ہیں۔

کن فیکون

غرض فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ہیں، یہ عالم ملکوتِ صغیر ہر شے کے باطن میں حدودِ عرش کے نیچے ملتا ہے اور عالمِ کبیر میں حدودِ عرشِ اعظم کے اوپر واقع ہے۔ اس عالم کی صفات سے اللہ تعالیٰ نے اس سے ماقبل کی آیت میں متعارف کرایا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ بالتحقیق اس کا امر (یہ ہے کہ) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے "ہوجا!" وہ ہوجاتی ہے۔

تمثیلِ معمار

مثلاً ایک معمار جب کسی عمارت کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کا نقشہ سب سے پہلے اُس کے علم میں موجود ہوتا ہے۔ اور بعینہٖ ویسا ہی موجود ہوتا ہے جیسا اُس نے بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ پھر وہ اسی علمی نقشے کو اپنے ذہن میں لا کر دیکھتا اور پسند کرتا ہے۔ پھر اُس کو قلم کے ذریعہ اپنے ذہن سے نکال کر کاغذ پر مرتسم کر دیتا ہے۔ اور جب یہ نقشہ خارجِ علم و ذہن کاغذ پر موجود ہو جاتا ہے تو پھر آلاتِ معماری، مزدور، اینٹ، گارا، چونا اور سیمنٹ یا لو (یعنی اسباب و لوازماتِ عمارت) کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسے جیسے اسباب و لوازمات اپنے وقتِ خاص پر مہیا اور فراہم ہوتے ہیں عمارت بننا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسی علمی نقشے کے مطابق جو علمِ معمار میں تھا ظاہر میں ایک واقعی عمارت موجود نظر آتی ہے۔ اس مثال کے ذریعہ جب ہم علمِ الٰہی تک پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں

Marfat.com

کہ علم الہٰی ذاتِ الہٰی کی طرح قدیم ہے اور سرمدی ہے۔ اور اس علم الہٰی میں کائنات کی یہی شکل وصورت جو نظر آرہی ہے پہلے سے موجود تھی پھر جب اللہ تعالےٰ نے ارادہ کیا کہ یہ کائنات خارج از علم کاغذی نقشے کی طرح موجود ہو جائے تو اُس علمی شکل وصورت کو حکم دیا "کُن" وہ عالم ملکوت میں ویسے ہی موجود ہو گئی جیسی علم الہٰی میں تھی۔ اور چونکہ یہ عالم نوری بغیر اسباب و ذرایع کے صرف امرِ کُن" سے موجود ہوئی اس لیے اس کو عالم امر کہا گیا۔ اور یہ 'عالم' عرش اعظم سے اوپر ہے۔ عرش اعظم سے نیچے عالم اسباب شروع ہو جاتا ہے جسے عالم اسباب، عالم شہادت، عالم خلق یا عالم مادّی بھی کہتے ہیں۔

عالم غیب

اگر ہم اپنے تخیل کو ایک مصنوعی سیّارے کی طرح سیدھے آسمان کی طرف پرواز کرائیں، تو یہ فضائے ہوائی سے گزرتا ہوا آسمانوں کو طے کرکے تا حدِ عرش پہنچ جائے گا۔ یہ کائناتی فضا جو ہمارے تخیل نے طے کی، عالم شہادت ہے یعنی جہاں جہاں ہمارا تخیل پہنچا اُس کو نگاہِ تخیل نے دیکھا مشاہدہ کیا اور وہاں سے معلومات فراہم کیں۔ لیکن مقام عرش کے اوپر عالم غیب شروع ہو جاتا ہے جہاں ہمارا تخیل بھی کام نہیں کرتا۔ اور اسی غیب پر ایمان لانا اسلامی تعلیم ہے۔ جیسا فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔ یعنی قرآن کریم ایسے متقیوں کو سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

ایمان بالغیب کا نور

اَلْاِیْمَانُ نُوْرٌ۔ ایمان بھی ایک روشنی ہے اور ایسی روشنی ہے جس پر عالم شہادت کی تاریکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایمان کی یہ روشنی عالم غیب میں سریان کرتی اور غیبی انوار و مشاہدات سے معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس لیے کہ نورِ ایمان کو نورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی نسبت ہے جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ پر چھوڑ کر آگے تشریف لے گئے اسی طرح

Marfat.com

ہمارے ایمان کا نور ہماری عقل و فہم و ادراک کو نیچے چھوڑ کر عالمِ غیب، بلکہ غیب الغیب تک پہنچتا اور اللہ تعالیٰ کی شہودی معرفت حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایمان کی آنکھیں ہیں، جو ملکوت و جبروت سے گزر کر لاہوت میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی دیدار کرتی ہیں جیسا ہم جنّت میں کریں گے۔

ملک سے ملکوت

اب جبکہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہم اس عالمِ ملک میں آنے سے پہلے عالمِ ملکوت (..........) میں تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پھر وہیں لوٹ کر جانا ہے تو اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس زندگی میں رہتے ہوئے اِس عالمِ ملک سے اُس عالمِ ملکوت میں پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمّت کے تمام اولیائے کرام، جو مقام رسیدہ ہیں ہم کو ملک سے ملکوت کی طرف سیر کرنے کے خاص طریقے بتاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص طریقہ مراقبہ ہے۔ جس میں ہم عالمِ ملک سے تعلق منقطع کر کے اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور یہی اقرب ترین راستہ ہے۔ کیونکہ جس قدر عوالم ہمارے جسم سے باہر عرش تک، پھر ملکوت، جبروت اور لاہوت ہیں اسی قدر ہمارے باطن میں موجود ہیں۔ جب ہم اپنے باطن کے عالمِ صغیر کی سیر کرتے ہیں تو گویا حقیقۃً وہ عالمِ کبیر ہی کی سیر ہوتی ہے۔ اور ہم جس طرح علمِ الٰہی سے یہاں آئے ہیں یہاں سے پھر سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کر کے علمِ الٰہی میں واپس لوٹ جاتے ہیں۔ یہاں فنا ہوتے ہیں اور وہاں بقا پاتے ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دور ۲
سا غ ۱۵

شریعتِ محمدی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ سِرَاجًا مُّنِیْرًا وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ مُتَّصِفٌ بِالْخُلُقِ الْاَعْلٰی۔

شریعت کی تعریف شریعت وہ قوانینِ زندگی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم رسولوں صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کے وسیلے سے عالمِ انسانیت پر عائد کیے اور اُن کو پہنچا دیے۔ تاکہ ان ہی قوانین پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی گزارے اور حکومتِ الٰہی میں فساد واقع نہ ہو۔ جب ایک بادشاہ اپنی سلطنت کے لیے مکمل قوانین بنا کر اپنی رعایا کو دیتا اور اُن پر چلنے کی تاکید کر دیتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رعایا کی زندگی میں اُلجھنیں پیدا نہ ہوں، امورِ سلطنت میں انتشار، اور نظامِ حکومت میں خلفشار واقع نہ ہو۔ ظلم و استبداد کی راہیں نہ کھل جائیں۔ رعایا کے حقوق پامال نہ کیے جائیں۔ عدل و انصاف کا گلا نہ گھونٹا جائے۔ طاقتور کمزور کو اور جابر مجبور کو نقصان نہ پہنچائے۔ امن و سلامتی کی فضا قائم رہے۔ اور اس کی سلطنت ایک ایسا مثالی نمونہ بن جائے جو اُس کی بادشاہت کے شایانِ شان ہو۔ ان قوانین کی

Marfat.com

پابندی بادشاہ کی دوستی اور فرمانبرداری ظاہر کرنے کی وجہ سے انعام واعزاز پانے کی مستحق ہوتی ہے اور ان قوانین کا توڑنا بادشاہ کی غدّاری اور دشمنی کی دلیل ہوتی ہے، اور سزا و عذاب کی مستحق۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت کے جو قوانین اپنے رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے وہی "قوانینِ شریعت" کہے جاتے ہیں۔ اور جس طرح ایک بادشاہ اپنے قوانین کی پابندی کرنے والوں سے خوش ہوتا اور اُن کو انعام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ پابندِ شریعت لوگوں سے خوش ہوتا۔ اُن کو بڑی سے بڑی جزا دیتا اور دین و دنیا میں اُن کا اعزاز بلند کرتا ہے۔ اور جس طرح ایک بادشاہ اپنے قوانین کو توڑنے والوں سے ناراض ہوتا اور سزا دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ شرعی قوانین سے روگردانی کرنے والوں کو اپنا دشمن فرماتا اور عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اور ایسے لوگ دین اور دنیا دونوں جگہ نامراد ہوتے ہیں۔

شریعت کے اعتبارات

شریعتِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ظاہر سے باطن تک چار اعتبارات ہیں۔ بہ اعتبارِ ناسُوت، جو عالمِ ظاہر سے متعلق ہیں اُن کا نام "شریعتِ مطلق" ہے۔ بہ اعتبارِ ملکوت، جو عالمِ باطن سے متعلق ہیں اُن کا نام "طریقت" ہے بہ اعتبارِ جبروت، جو عالمِ واحدیت یعنی عالمِ صفات سے متعلق ہیں، ان کا نام "حقیقت" ہے۔ اور بہ اعتبارِ لاہوت، یعنی عالمِ ذات، ان کا نام "معرفت" ہے۔

شریعت کی کلّی مثال

شریعت کی مثال میں علمائے حقّہ نے "انار" کو پیش کیا ہے کہ اگر تمھارے ہاتھ میں انار ہو اور اُس پر تمھیں اختیار بھی ہو تو یقیناً تم اُن لوگوں کے اعتبار سے خوش قسمت ہو جن کے ہاتھ میں انار نہیں ہے۔ لیکن کیا اس انار کو ہاتھ میں رکھنے سے اُس کی لذّت اور فائدہ تمھیں حاصل ہو سکتا ہے؟ نہیں! ــــ تمھیں اُس کی لذّت حاصل کرنے کے لیے اُس کے باطن سے دانوں کو نکالنا ہوگا۔ اب اگر تم نے دانوں کی

Marfat.com

نکال لیے تو جب تک منہ میں ڈال کر نہ چباؤ گے لذت حاصل نہ ہو گی۔ لذت حاصل ہونے کے بعد بھی اُس کی شفا اور فرحت کے اثرات کو مخالف اثرات سے بچانے کی ضرورت ہو گی۔ تب اپنے وقت پر وہ انار تمھاری رُوح کو فرحت و انبساط سے مالامال کر سکے گا۔ بعینہٖ یہی مثال شریعت کی ہے کہ جب انسان شریعت کا پابند ہو گیا، تو گویا اُس کے ہاتھ میں سالم انار آ گیا۔ جس میں دانے بھی ہیں، دانوں میں مزے دار رس بھی ہے۔ اور رس میں فرحت و شفا بخش اثرات بھی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اس شریعت کے باطن میں طریقت کے راستے سے داخل ہو اور روحانی طاقتیں حاصل کرے، جو انار کے دانوں کی طرح ہیں۔ پھر طریقت کے باطن سے حقیقت حاصل کرے جو مزے دار رس کے مانند ہے۔ پھر اُس حقیقت کے باطن سے اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل کرے۔ تب اس انارِ شریعت کا پورا پورا اثر فرحت و شفا بخشی یعنی حیاتِ جاوید حاصل کر سکے گا۔

شریعت کے دو رخ

جس طرح ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں اسی طرح شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دو رُخ ہیں، ظاہر اور باطن۔ ظاہر کا دار و مدار باطن پر ہے۔ باطن نہ ہو تو ظاہر کا وجود کالعدم یا بے جان یا بے کار قرار پائے گا۔ لیکن ظاہر کے بغیر باطن کا وجود ممکن ہے۔ یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ باطن ہو لیکن وہ ظہور میں نہ آیا ہو۔ مثلاً ظاہر کی مثال میں ہم شعلے کو پیش کریں گے، جو ماچس کی تیلی رگڑنے کے بعد ظاہر ہو رہا ہے۔ جب تک تیلی کے باطن میں شعلہ ہے، ظاہر ہوتا رہے گا۔ اور جب باطن میں شعلہ ختم ہو جائے گا تو ظاہر شعلہ بھی بجھ جائے گا۔ پس جب ہم ماچس کی تیلی کو رگڑنے سے پہلے دیکھتے ہیں تو اُس کے باطن میں شعلہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ باطن کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظاہر بھی ہو۔ لیکن جب ہم نے ماچس کو رگڑ کر اُس کے باطنی شعلے کو ظاہر کر دیا تو چونکہ ظاہر کا مدار باطن پر ہے جب تک باطن ہو گا

Marfat.com

ظاہر ہو سکے گا۔ ورنہ نہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ باطن اصل ہے اور ظاہر اُس کی فرع ۔ پس جب ہم کسی چیز کی اصل یا حقیقت تک پہنچنا چاہیں تو ہمیں اُس کے باطن کو کھول کر کرید کر یا علمی طریقے سے اُس کے باطن میں داخل ہونے کی ضرورت ہوگی ۔

ظاہر شریعت یہ وہ اعمالِ ظاہری ہیں جو اظہارِ بندگی اور فرماں برداری کے لیے ظہور میں آئیں ۔ اور عقل و ہوش و حواس اُنھیں ادراک سے ثابت کر سکیں ۔ ان کی دو قسمیں ہیں ۔ اوامر اور نواہی ۔

اوامر یہ اللہ تعالےٰ کے وہ احکامات ہیں جنھیں اپنے فائدے اور فلاح و بہبود کے لیے ظاہر کرنا (بجالانا) فرض ہے ۔ یا وہ احکامات ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دیے ہیں ۔ اور اُن کے طریقے خود عمل کر کے بتائے ہیں ۔ اُن کو تسلیم و رغبت کے ساتھ ادا کرنا سنّت ہے ۔ یا وہ طریقے اور خاموش احکامات ہیں جو ائمہ و مجتہدین یا بزرگانِ دینِ متین نے استجلابِ رحمت اور استشعاعِ نورانیت کے لیے تدوین فرمائے ہیں مستحبات اور باعثِ ترقیِ درجات ہیں ۔ یا بعض وہ خصوصی احکامات ہیں جو خاص اوقات میں خاص لوگوں پر مرشدوں یا بزرگوں کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں ' یا خود اپنے اوپر لازم کر لیے جاتے ہیں وہ سلوک و مجاہدہ کے لازمات ہیں ۔ اِن اوامر پر عمل کرنا اور پابند رہنا بندگی کی جان ہے ۔ ان کی مشاکلت ہی زندہ بندگی کا ثبوت ہے ۔ ورنہ بندگی مردہ ہے ۔

نواہی یہ وہ امورات ہیں جن کا ارتکاب کسی نہ کسی نہج سے جسمانیت یا روحانیت ' انفرادیت یا اجتماعیت کیلیے مضرت رساں یا ہلاکت آفریں ہیں ۔ اِن میں سے وہ امورات جن کے لیے حکم صریح وارد ہے وہ حرام ہیں ۔ جو مُنتِج قبیح ہیں ' ناجائز ہیں ۔ جو مانعِ حسنات ہیں مکروہ ہیں ۔ اور جو مانعِ ترقی ہیں وہ ممنوع ۔

Marfat.com

حرام | وہ امورات جن سے بچنے کا حکمِ صریح وارد ہے اور جن پر جان بوجھ کر اصرار کرنا اور بالضد قائم رہنا دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے[1]۔ وہ اعتقادی ہیں یا قولی یا فعلی یا غذائی ۔ چنانچہ بالاعتقاد :- ماسوی اللہ کو فی العبادت معبود، بالذات موجود، بالرغبت مقصود، بالاشتیاق مطلوب، فی الحقیقت محبوب ماننا اور غیر اللہ کو حاجت روا جاننا حرام ہے ۔ بالقول :- کلماتِ کفر و شرک، بے ادبیِ رسالتؐ، توہینِ صحابہؓ، غیبتِ مومنین، الزام تراشی، دروغ حلفی، غلط شہادت، جھوٹ، مکر و فریب، گالی دینا، شدتِ کلام اختیار کرنا۔ فساد کا بیج بونا اور بحث و مباحثہ میں مسلّمات کی تردید کرنا ۔ بالعمل :- ماسویٰ کی پرستش یا سجدہ کرنا، کسی غیر کی نذر ماننا، خدا اور رسول کے برابر کسی کا احترام کرنا، اِثم و عدوان کی اعانت کرنا، کسی غیر کے نام پر قربانی کرنا، چوری، زنا، نامحرمات کی طرف بالقصد نظر کرنا، قتل کا مرتکب ہونا اور جملہ بدعات حرام ہیں ۔ بالاغذیہ :- شراب، سور، مردہ، غیر ذبیحہ، زہر اور تمام نشے والی چیزیں حرام ہیں۔

ناجائز | یہ وہ امورات ہیں جو اپنے نتیجے میں گناہ، عذاب اور قباحت پیدا کرتے ہیں۔ اور جن کی ممانعت نصِ قطعی سے ثابت ہے۔ اور یہ بھی یا اعتقاداً ہوتے ہیں یا قولاً یا عملاً یا غذاءً۔ اعتقاداً :- اللہ کو غیر اللہ، اور رسول اللہؐ کو عام انسانوں کے برابر جاننا، کسی پیر فقیر یا مزار کو بالذات مشکل کشا یا حاجت روا ماننا۔ اور وہ امورات جن کا اعتقاد کرنا شریعت میں ناجائز ہے۔ قولاً :- اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف میں وہ کلمات استعمال کرنا جن سے منع کیا گیا ہے ۔ اور جو صفات سلبیہ کو ایجاب میں اور صفاتِ ایجابیہ کو سلبیہ میں تبدیل کرنے والے ہیں ۔ یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و مدح اور ثنا و تعریف میں وہ کلمات استعمال کرنا جو رسولؐ کو مرتبۂ الوہیت میں پہنچا دے، یا عام انسانوں کے مرتبے پر لے آئے ۔ اور وہ کلمات جو شریعت میں ناجائز ہیں۔ عملاً :- مسلمین و مومنین یا سلامتی کے علم برداروں کو ایذا پہنچانا، حقوق اللہ، حقوق العباد اور

[1] بالضد اصرار کے معنی 'خدا کی حرام کردہ چیز کو حرام ہی نہ جاننا اور اس کی حرمت سے انکار کرنا' ہیں۔

Marfat.com

حقوق نفس کی طرف سے بے پرواہی اور ہمسایوں سے بے توجہی کا برتاؤ کرنا۔ اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانا۔ امانت میں خیانت کرنا۔ نیک کاموں کے راستے میں روڑے اٹکانا۔ غذائیں:۔ بے محنت اور ناحق رزق کھانا، کسی کا دل دکھا کر غذا حاصل کرنا، اور ایسی چیزیں جن کے متعلق جواز ثابت نہ ہو۔ وغیرہ۔

مکروہ یہ وہ امورات ہیں جو قلب و روح میں اس درجہ کراہت و انقباض پیدا کردیں کہ نفرت ظاہر ہو کر مانعِ حسنات ہو جائے۔ ان کی دو قسم ہے۔ تحریمی و تنزیہی۔ مکروہ تحریمی وہ ہے جس کی کراہت حرمت تک پہنچ جائے۔ یعنی وہ کسی پہلو سے حرام کی طرف بھی مائل ہو جائے۔ جیسے اُن وساوس کا دل میں آنا جو خدا، رسول، انبیا، کتب سماوی، فرشتگان، آخرت اور تقدیر خیر و شر کے لیے باعثِ شکوک و شبہات ہوں۔ اور مکروہ تنزیہی وہ تمام اعتقادات، اقوال اور معاملات ہیں جو نفس کو خوش کرنے اور حسنات کو زائل کرنے والے ہیں۔ جیسے ذہنی عیاشی، رکیک شاعری اور تمام لہو و لعب وغیرہ جیسا کہ فقہ کی کتابوں سے تفصیلاً معلوم ہو سکتا ہے۔

ممنوع یہ وہ امورات ہیں جو حرام، ناجائز یا مکروہ تو نہیں ہیں لیکن کسی طبیب جسمانی یا طبیب روحانی یا اُستاد و مربّی کی طرف سے خاص لوگوں کو خاص وقت کے لیے روک دیا گیا ہے۔ ان میں جملہ اوامر و مالوفات ہو سکتے ہیں۔ کوئی قید نہیں ہے۔ جیسے حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا رومؒ کو بیعت سے قبل ایک دن کی نماز فجر سے منع فرمایا تھا۔

پیر کا حکم جب مولانا رومؒ نے حضرت شمس تبریزؒ سے بیعت کی تمنّا کی تو انھوں نے فرمایا کہ جس دن تم نماز فجر ترک کردگے اسی دن تم کو بیعت کریں گے۔ مولانا رومؒ عمر بھر نے زندگی میں کوئی نماز قضا نہ کی تھی پہلے تو اس کے لیے تیار ہی نہ ہوئے۔ لیکن جب اسی حکم پر اصرار پایا تو مسلسل ارادہ کرنے کے باوجود نماز قضا نہ کر سکے۔ روز ارادہ کرتے تھے کہ آج

Marfat.com

فجر کی نماز نہ پڑھوں گا۔ لیکن وقت آنے پر شوقِ سجدہ سے اس درجہ بے تاب ہو جاتے کہ ارادہ فسخ ہو جاتا اور نماز پڑھ لیتے۔ اور حضرتِ شمسؒ سے التجا کرتے کہ یہ شرط معاف کر دی جائے۔ لیکن اُن کا اصرار اٹل تھا، وہ بیعت کرنے سے انکار کر دیتے۔ ایک دن مولاناؒ مصمم ارادہ کر کے مسجد میں بیٹھے کہ آج میں نماز نہ پڑھوں گا۔ مؤذن نے فجر کی اذان دی، دل بے تاب ہو گیا۔ اور نماز کے قضا ہونے کا خیال کوہِ عذاب بن کر سر پہ آ گرا۔ مگر آپ ارادے پر قائم رہے، مکبّر نے تکبیر شروع کی آپ دل تھامے بیٹھے رہے۔ امام کی آواز آئی آپ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگے۔ سلام پھیرا گیا اور آپ جماعت میں شریک نہ ہوئے۔ اِس ضبطِ بے پناہ سے آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور دل میں طوفانِ عظیم برپا تھا۔ آپ ٹہل رہے تھے اور وقت گزر رہا تھا۔ آخر اتنا تنگ ہو گیا کہ صرف فرض کی دو مختصر رکعتیں پڑھی جا سکتی تھیں۔ اُس وقت آپ بے قابو ہو گئے اور سنت چھوڑ کر فرض کی نیت کی اور ہاتھ باندھ لیا۔ جب سلام پھیرا تو غم سے نڈھال اور کشمکش سے اتنا تھک چکے تھے کہ وہیں لیٹ کر سو گئے۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف ارزانی فرمائی اور مسکرا کر بطریقِ خوش طبعی ارشاد فرمایا "جلال الدین ہم سے کیوں ناراض ہو کہ آج ہماری سنّت ترک کر دی۔" کیا جواب دیتے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ حضرت شمس تبریزؒ کی خدمت میں آئے۔ جب ماجرا بتایا تو اُنھوں نے فرمایا "دیکھا، تم نے سنت ترک کی تو رسولؐ کا دیدار اور شرفِ تکلم حاصل ہوا۔ اگر تم فرض بھی ترک کرتے تو خدا کا دیدار ہوتا۔" یہ ہے پیر کے حکم کا راز کہ جب وہ کسی نیک کام سے روکتا ہے تو اس کا نتیجہ اُس کے ثواب سے بہت زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

ترکِ سنّت کا راز اس واقعہ سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ادائے سنت میں ثواب ہے اور ترکِ سنّت میں عذاب۔ امرِ عذاب کیونکر نتیجۂ ثواب پیدا کر سکتا ہے

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نتیجۂ ثواب ترکِ سنت سے نہیں پیدا کیا تھا، بلکہ یہ مولاناؒ کی اس جدوجہد اور جذبہ کی قربانی کا نتیجہ تھا جو اُن کو سنت کے وقت پیش کرنی پڑی۔ اور اس کام کے لیے اُنھوں نے اتنی تکلیف اُٹھائی اور غم سہا کہ اور کسی کام میں اُن کو لاحق نہ ہوا تھا۔ اور شمس تبریز علیہ الرحمہ جانتے تھے کہ نماز ترک کرنا مولانا کے لیے کتنی زبردست قربانی کا مترادف ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے ترکِ نماز کا حکم دیا۔

باطن شریعت جس طرح شریعت کے ظاہری قوانین ہیں اسی طرح شریعت کے باطنی قوانین بھی ہیں جنھیں طریقت کہتے ہیں۔ شریعت اور طریقت کے قوانین میں فرقِ مابہ الامتیاز نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ شریعت کے قوانین صرف ظاہری شکل و صورت کے ساتھ بجا لائے جاتے تھے۔ اب وہی اعمال و قوانین شوق و ذوق و جذبہ اور والہانہ محویت کے ساتھ بجا لائے جاتے ہیں۔

سیر الی اللہ شریعت میں وہ لفظاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ذکر کرتا تھا۔ اب وہ معناً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ .... کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی لَآ اِلٰہَ سے اپنے باطن میں تمام باطل معبودوں، کاذب مسجودوں، ناقص مطلوبوں، فانی محبوبوں اور وہمی موجودوں کی نفی کرتا ہے۔ اور اِلَّا اللّٰہ سے معبودِ برحق، مسجودِ صادق، مطلوبِ کامل، محبوبِ باقی اور موجودِ حقیقی کا اثبات و تصدیق کرتا ہے۔ اور اس نفی و اثبات کے زینے سے اُتر کر اپنے باطن میں عالمِ ملکوت کی سیر کرتا ہے۔ اور جب وہ انوارِ ملکوتی سے آشنا ہوتا ہے تو اُسے ایک لذت و سرور حاصل ہوتا ہے جو اس طریقت کے باطن یعنی حقیقت کی چیز ہے جہاں وہ ذوق و جذبہ کی زنجیر پکڑ کر اتر جاتا ہے۔ اور اس لذت و سُرور سے کماحقہٗ مستفیض ہوتا ہے۔ اس عالمِ حقیقت میں نہ ذکرِ نفی "لَآ اِلٰہَ" ہوتا ہے نہ ذکرِ اثبات "اِلَّا اللّٰہ" اِس عالم کی لذت و سرور میں کائنات ہی

Marfat.com

نہیں، بلکہ جملہ اسماء و صفات گم ہو جاتے ہیں سوائے ایک اسم "اللہ" کے۔ اور وہ لذت و سرور کے ساتھ ذکر اسم جامع "اَللہ اَللہ" میں محو و مستغرق ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اس لذت و سرور کی بھنور میں غوطہ لگا کر مقام معرفت پر پہنچتا ہے تو وہاں اسم ذات "اَللہ" بھی چھوٹ جاتا ہے طریقت ختم ہو جاتی ہے۔ اور جذبۂ الٰہی اُسے ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جس کا حقیقتہً کوئی نام نہیں سمجھنے اور اشارہ کرنے کے لیے خواہ اُسے عالم معرفت کہیں یا عالم جذب وغیرہ سے یاد کریں، مگر یہ سب محض اشارات ہیں۔ جب یہاں سالک کی زبان ہی گنگ ہو جاتی ہے اور تکلم و کلام کو کوئی یارا ہی باقی نہیں رہتا تو اسم و رسم کی گنجائش کہاں۔ یہ ایک عالم بے خبری ہے۔ یہی عالم فنا فی اللّٰہی۔

سیر فی اللہ اب اس عالم میں سیر فی اللہ ہوتی ہے جو اُس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے خدا جس طرح چاہے اُسے سیر کراتا ہے۔ اس سیر فی اللّٰہی میں اسماء و صفات الٰہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سالک جو جانتا ہے علم الٰہی سے جانتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے بصارتِ الٰہی سے دیکھتا ہے، جو کرتا ہے دستِ قدرت سے کرتا ہے۔ اس وقت اسے بقا باللّٰہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ مرتبۂ ولایت پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کا دوست اور خدا اُس کا دوست ہو جاتا ہے۔

نفسِ مطمئنہ یہاں اُس کو نفسِ مطمئنہ عطا کیا جاتا ہے، یعنی دین و دنیا کی کوئی خواہش، کوئی آرزو، کوئی مقصد، کوئی تمنا، کوئی حاجت اُس کے اطمینان کو بے اطمینانی سے نہیں بدل سکتی۔ وہ وہی چاہتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اس لیے ساری کائنات کو اپنی ہی مرضی و خواہش پر چلتا ہوا دیکھتا ہے۔ نہ اُس کا کوئی غیر ہوتا ہے نہ اپنا، نہ دوست ہوتا ہے نہ دشمن، نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا، نہ عذاب ہوتا ہے نہ ثواب، نہ کفر ہوتا ہے نہ اسلام، نہ نور ہوتا ہے

Marfat.com

نہ ظلمت، نہ تکلیف ہوتی ہے نہ آرام، نہ رنج ہوتا ہے نہ راحت۔ کیونکہ یہ تمام امورات صفات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ صفات سے گزر کر سیر فی اللہ یعنی ذات کے مشاہدے میں مشغول ہے اور حقیقی جنت یہی ہے۔ یہی مقامِ جمع ہے۔ اسی کو وصال کہتے ہیں۔ یہاں نصف دائرہ عروج تمام ہو جاتا ہے۔

سیرِ من اللہ

جب اللہ تعالیٰ اُس کو مقامِ وصال میں انعام واکرام سے نوازتا ہے تو اُسے پھر اُسی عالم کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جہاں سے اُس نے سیر الی اللہ شروع کی تھی۔ اس سیر من اللہ میں اُسے فرق بعد الجمع حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اس سیر کو تمام کر کے دائرۂ نزول پورا کرتا ہے اور جب اپنے اُسی مقامِ بدایت پر پہنچتا ہے تو اُس کی سیر منتہی ہوتی ہے اسے مقامِ جمع الجمع کہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ منتہی سالک تمام حالات اور تمام مقامات کا جامع ہوتا ہے۔ اور اس حالتِ نزولِ تمام میں وہ عوام سے بالکل نزدیک ہو جاتا ہے تاکہ رُشد و ہدایت کا کام کر سکے۔ اس وقت اگرچہ اُس کا نفس مطمئنہ ہوتا ہے اور اس میں شرارت اور خطا کی طرف رغبت باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی وہ معصوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ خطا کی استعداد نفس میں باقی ہوتی ہے۔ اگر پوری نگہداشت نہ کی جائے تو خطا کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

نفسِ قدسی

ہاں انبیاء علیہم السلام کو وہ نفسِ قدسی عطا کیا جاتا ہے جس میں خطا کی خواہش باقی نہیں رہتی اس لیے اُن کو معصوم کہتے ہیں، ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی وقت ادنیٰ خدشہ بھی ہو تو وحیِ الٰہی ان کی دستگیری کرتی ہے۔

خطائے آدمؑ

یہاں پر ذہنِ انسان فوراً آدم علیہ السلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس دعوے کے خلاف کہ انبیاؑ معصوم ہوتے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آدم علیہ السلام سے خطا کیوں سرزد ہوئی جس کے نتیجے میں جنت کا لباس اُتر گیا۔ اور آپؑ

Marfat.com

عرصہ دراز تک گریۂ وزاری میں مصروف اور "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" کے مقر ومعترف رہے؟
تو اس کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ خطا، خطا نہیں بلکہ ایک ایسی حرکتِ اضطراری تھی جو ازل میں مقدر ہو چکی تھی۔ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء و امتحان تھا جس میں آدم علیہ السلام اپنی فراستِ نبوت اور پیغمبرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔ اور یہ مقام انتہائی غور و تفکر کا ہے۔ اگر انسان اس عجیب راز سے واقف ہو جائے تو اُس کے ایمان کی بڑی بڑی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔ اور اس کے لیے آدمؑ و ابلیس کا تقابل ضروری ہے۔

آدمؑ و ابلیس

آدمؑ و ابلیس دو برابر کی مقابل طاقتیں تھیں۔ آدم علیہ السلام کے ذریعہ ابلیس کا اور ابلیس کے ذریعہ آدم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا۔ خطا بظاہر دونوں سے سرزد ہوئی۔ شیطان نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کی قربت حاصل کر کے بظاہر حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ۔۔۔ یہ تو تھا تو دونوں کا امتحان لیکن ابلیس علیہ اللعن نے اس امتحان کا جواب بغاوت، سرکشی، غرور، تکبّر اور فخر و تبختر سے دیا۔ اور آدم علیہ السلام نے اعترافِ گناہ، عجز و انکساری، گریۂ وزاری، توبہ و استغفار اور اظہارِ عبدیت سے دیا۔ شیطان امتحان میں فیل ہوا اور نکال دیا گیا۔ آدم علیہ السلام امتحان میں پاس ہوئے اور اللہ تعالےٰ نے اُن کو اپنی پیغمبری کے مرتبۂ صفوت پر فائز فرمایا۔ اس انکشافِ راز کے بعد آدم علیہ السلام کی اس حرکتِ اضطراری کو خطا و گناہ میں شامل کرنا غلطی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی صاحب آدم علیہ السلام کو خطا کا مرتکب ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیت پیش کریں اور کہیں کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ کے حکمِ صریح "فَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی خلاف ورزی کی اس لیے وہ اس الزام سے نہیں بچ سکتے ۔۔۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ خلاف ورزی آدم علیہ السلام کی

Marfat.com

نیت وارادہ کے ماتحت نہ تھی۔ اور عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اس لیے وہ اس الزام سے بری الذمہ ہوں گے۔ دراصل آدم علیہ السلام حکم "وَلَا تَقْرَبَا" کے معنی میں مشکوک ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس درخت سے قربت کی ممانعت، جو پہلے ہی اُن کے قریب تھا "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" هٰذِهِ اسم اشارہ قریب ہے) واضح نہیں تھی ۔۔۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے ایک لطیف معنی اور بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ ہم نے کہہ دیا (یعنی پہلے بتا دیا) کہ اے آدم، تم اور تمھاری بیوی اس باغ میں رہو اور اپنی مرضی سے جو جی چاہے کھاؤ، اور (ہم دیکھیں کہ تم) دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔ مگر تم (اپنے نفسوں پر) ظلم کر کے رہو گے۔ یعنی یہ شجر ممنوعہ تمھارے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے اور تم بالضرور اس کی قربت حاصل کرو گے اور اس کے نتیجے میں جنت کا لباس تم سے چھین لیا جائے گا۔ تم اس باغ کے آرام سے نکل کر دنیاوی آلام و مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان حالات سے اطلاع دی جو ان کی زندگی میں پیش آنے والے تھے۔ اگر آپ کہیں کہ یہ معنی کس قرینے سے اخذ کیے گئے، تو آپ کو "فَتَكُوْنَا" کے حرف "فا" پر غور کرنا ہوگا۔ اگر یہ معنی ممکن نہ ہوتے تو "ولا تقربا" کے بعد "ولا تکونا من الظالمین" ہوتا۔ یعنی قریب نہ جاؤ اور ظالموں میں سے نہ ہو جاؤ۔ لیکن حرف "فا" نے "تکونا" کو "تقربا" کی نوعیت سے جُدا کر دیا۔ اور "تکونا" فعل مضارع ہے، جس کے معنی میں استقبال بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تم ہو جاؤ گے ظالموں میں سے۔ (واللہ اعلم)

مقامِ جمع الجمع

وہ سالک جو حالتِ فراق سے سیر الی اللہ کے ذریعہ عروج کر کے حالتِ وصال (یعنی مقامِ جمع) میں پہنچا تھا۔ اور وہاں سے "سیر فی اللہ" ختم کر کے، سیر من اللہ کے ذریعہ فرقِ بعد الجمع اختیار کر کے فراق کے اُسی مقام پر پہنچا جہاں سے اُس نے

Marfat.com

سیرالی اللہ شروع کی تھی تو وہ جملہ حالاتِ فراق و وصال، فرق و جمع، عروج و نزول، دین و دنیا، خواب و بیداری اور کثرت و وحدت کا جامع ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل ہوتا ہے کہ رشد و ہدایت کا کام سرانجام دے اور اللہ کے بندوں کو سیدھا راستہ راستہ دکھائے۔ وہ معصوم تو نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کے دامنِ حفاظت میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفسِ مطمئنّہ سے غافل نہ رہے۔ اور اُسے بے لگام نہ ہونے دے۔

بہشت کے دو رُخ

جس طرح شریعت کے دو رُخ ہیں، اسی طرح بہشت کے دو رُخ ہیں۔ ایک ظاہر، یعنی صورتِ بہشت اور دوسرا باطن یعنی حقیقتِ بہشت۔ بہشت ایک آرام، راحت اور لذّت و سُرور کا مقام ہے۔ لذّت و سرور کی "صورت" یہ ہے کہ انسان ان سے صرف اتنا لطف اندوز ہوتا ہے کہ اس کا احساسِ لذّت اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ آرام میں ہے اور لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اور لذّت و سُرور کی "حقیقت" یہ ہے کہ وہ اس درجہ لطف اندوز ہوتا ہے کہ خود سر سے پَیر تک لذت و سرور بن جاتا ہے۔ اور اُس میں ایسا محو و مستغرق ہوتا ہے کہ اُسے نہ اپنا احساس ہوتا ہے نہ لذّت و سُرور کا۔ پس جو لوگ صرف صورتِ شریعت کے حامل ہیں، اُن کو صورتِ بہشت حاصل ہوگی۔ اور اُن کو اس حالت میں اگرچہ کوئی رنج غم تکلیف یا کدورت لاحق نہ ہوگی، اور نعمائے جنّت میں سے ہر چیز اُن کو میسّر ہوگی۔ لیکن دیدارِ خداوندی، جو ادنیٰ و اعلیٰ ترین الطاف و اکرامِ الٰہی ہے ان کو ایک وقتِ خاص اور قلیل وقفہ کے لیے نصیب ہوگا۔ اور وہ بس تھوڑی دیر دیدار خداوندی سے سرشار ہو سکیں گے۔ باقی اوقات اس دیدار کے انتظار میں گزریں گے۔ اور اس انتظار کی تکلیف کا احساس نعمائے جنت پر غالب ہوگا۔ اور جو لوگ حقیقتِ شریعت کے حامل ہیں۔ وہ اگرچہ دیگر نعمائے جنت سے لطف اندوز نہ ہوں۔ مگر

Marfat.com

وہ ہمہ اوقات دیدارِ خداوندی سے سرشار رہیں گے اور اس درجہ محو ہوں گے کہ احساسِ سرشاری بھی باقی نہ رہ جائے گا۔

خلاصہ قربِ الٰہی کی اصل و بنیاد شریعت ہے۔ اسی بنیاد پر دینِ اسلام اور معرفتِ خداوندی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اور قوانینِ شریعت کی پابندی اس درجہ لازم و ضروری ہے کہ خود صاحبانِ شریعت اس کی پابندی کے مکلف ہوئے۔ صحابۂ کرامؓ نے زیادہ سے زیادہ پابندی و اتباع کر کے مراتب کمال حاصل کیے۔ اور آج بھی جو شریعت کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرے زیادہ سے زیادہ مراتب کمال حاصل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو شریعتِ مطہرہ کے ذریعہ کمالاتِ ولایت سے سرفراز فرمائے اور ظاہری و باطنی مشکلات کو دُور کر کے سلوک آسان فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۶

جسم، روح اور قلب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

روح

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ آپ سے لوگ رُوح کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے۔ رُوح امر ربی ہے۔ سائل نے روح کو جاننے کے لیے سوال کیا تھا کہ "کیا ہے؟" لیکن اس کا جو جواب دیا گیا' وہ بذاتِ خود محتاجِ تحقیق ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ امر ربیّ کے متعلق سوال کیا جائے کہ "کیا ہے؟" مثلاً کسی شخص کے متعلق سوال کیا جائے کہ "یہ کون ہے؟ اور اُس کا جواب دیا جائے کہ "یہ پاکستانی یا امریکی ہے۔" تو اب ہمیں جغرافیہ کا نقشہ اُٹھا کر پاکستان اور امریکہ کا محلِّ وقوع، حدودِ اربعہ، آب وہوا، فصل وموسم، مزاج وکیفیات، زبان ومعاشرت، سماجی وثقافتی رسم ورواج، اقتصادی، سیاسی اور تاریخی حالات کی تحقیق ضروری ہوگی۔ اس کے بعد ہم کو اپنے سوال کا جواب مل سکے گا، کہ وہ کس معیار کا آدمی اور کس سرزمین کا باشندہ ہے۔ اسی طرح جب سائل کو جواب دیا گیا کہ روح امر ربیّ ہے تو سائل پر یہ فرض عائد ہوجاتا ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ امر ربیّ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیونکر ہے؟ اور

Marfat.com

ان سوالات کو حل کرنے کے لیے کائنات کے نقشہ پر حواس وعقل کے ذریعہ چھان بین کی جائے گی۔ نوعیتِ تخلیق پر غور کیا جائے گا۔ اور نتائج حاصلہ سے علّتِ غائی کا پتہ لگایا جائے گا۔ تب اس سوال کا جواب کہ "روح کیا ہے؟ ہماری سمجھ میں آسکے گا۔

امرِ ربّی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جملہ مخلوق کو زوج زوج، مثل وضد، نشیب وفراز، نور وظلمت، رات دن، اچھا بُرا، سعید وشقی اور دوست ودشمن وغیرہ پیدا کرکے ایک کی معرفت کو دوسرے پر منحصر رکھا ہے۔ دو میں سے اگر ایک کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے تو دوسرا آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ مثلاً جو دن کو پہچان لے گا وہ رات کو ضرور پہچان سکے گا یا رات کو پہچان لے گا تو دن کا پہچاننا آسان ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایسی چیز سامنے آئے جسے ہم نہ پہچانتے ہوں تو اُس کا مقابل تلاش کریں۔ اور ان دونوں میں جو زیادہ قریب ہو اور جسے آسانی سے پہچان سکتے ہوں پہچان لیں دوسرا خود بخود پہچان لیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ امرِ ربّی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ہم امرِ ربّی کو پہچانتے تو روح کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوتی۔ اور امرِ ربّی کو اس لیے نہیں پہچانتے کہ وہ ہمارے حواس کے احساس وادراک سے بعید ہے۔ اب اگر ہم امرِ ربّی کو جاننا پہچاننا چاہتے ہیں تو ہمیں ضرورت ہوگی کہ ہم اس کا مقابل، اس کا ضد یا اُس کا عکس تلاش کریں اور دیکھیں کہ وہ ہم سے قریب ہے یا دُور اور ہم اُسے آسانی سے پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟

خلقِ ربّی

اب جب ہم امرِ ربّی کا مقابل تلاش کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خلقِ ربّی اس کا زوج، ضد یا عکس ومقابل ہے۔ اور خلقِ ربّی یہی عالمِ اجسام ہے جسے ہم دیکھتے، سنتے، چکھتے، چھوتے اور سونگھتے ہیں۔ عقل سے سمجھتے اور تمیز سے پہچان لیتے ہیں اور یہ ہمارے احساسات سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اگر اس خلقِ ربّی کی معرفت کما حقّہٗ

Marfat.com

حاصل ہو جائے تو امرِ ربی کی معرفت آسان ہو جائے گی۔ اور اس کے لیے ہمیں سوال کرنا چاہیے کہ یہ "عالمِ اجسام" کیا ہے؟ کیوں کر ہے؟ اور کہاں ہے؟

عالمِ اجسام یہ جاننے کے لیے کہ عالمِ اجسام کیا ہے ہمیں مزید سوالات کرنے ہوں گے یہ کیوں نظر آتا ہے؟ کیوں سنائی دیتا ہے۔ وغیرہ۔ اور ان کے جوابات حاصل کرنے کے لیے ہمیں تجربات سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔ آئیے، ہم اپنے سامنے ایک ایسے مجلّٰی و مصفّٰی شیشے کی دیوار کھڑی کریں جس کا رُخ و پشت دونوں مصفّٰی ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ شیشے کی دیوار نظر نہیں آتی اور اُس کے دوسری طرف کی تمام چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ کیونکہ شیشے کی دیوار کا جسم لطیف ہے۔ اور اُس کی دونوں سطح مجلّٰی اور مصفّٰی ہے۔ اب ہم اُس کی ایک طرف کوئی رنگ یا جسم کثیف ایسا لگا دیں جو ہماری نظر کو شیشے کے جسم میں روک دے تو اب ہمیں شیشہ نظر آنے لگے گا۔ اور دوسری طرف کی کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ اس تجربہ سے ثابت ہوا کہ نظر آنے کے لیے جسم کا اتنا کثیف ہونا شرط ہے جو نظر کو روک لے اور دوسری طرف نہ گزرنے دے۔ اس طرح ہمارے سوال کا جواب مل گیا کہ عالمِ اجسام یعنی یہ عالم ہمیں کیوں نظر آتا ہے؟ یہ اس درجہ کثیف ہے کہ اس سے ہماری نظر پار نہیں ہوتی۔ اس میں رک کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے نظر آجاتا ہے۔ یہی جواب "سماعت" کے متعلق ہے کہ جب آواز ہوا میں لہر پیدا کرتی اور ہوا کی لہر پردۂ سماعت سے ٹکراتی اور رُک جاتی ہے تو آواز سنائی دیتی ہے۔ وغیرہ۔ جب ہم نے عالمِ خلق (خلقِ ربی) کو اپنے ظاہری احساسات سے محسوس کر کے پہچانا۔ تو ہمیں جواب مل گیا کہ عالمِ اجسام کثیف ہے اور اپنی کثافت کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے۔

عالمِ اجسام کیونکر ہے؟ اب عالمِ اجسام کی چگونگی کے متعلق سوال کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ عالم ظہورِ کائنات کے اعتبار سے آخری عالم ہے

Marfat.com

اور اس کے بعد کوئی عالم نہیں ہے۔ اگر کوئی عالم ہوتا تو اس عالم کے بجائے وہ عالم نظر آتا۔ اور اُس کے ظہور کے مقابلے میں اس کا ظہور چھپ جاتا۔ پس ہم کو اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے کہ چونکہ ظہور کی امواج اس ساحل سے آکر ٹکراتی اور واپس بطون کی طرف لوٹ جاتی ہیں اس وجہ سے یہ عالمِ اجسام قائم ہے۔ اور جب امواجِ ظہور رُک جائیں گی یہ عالم نیست و نابود ہو جائے گا۔

عالمِ اجسام کہاں ہے؟

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہر ظہور اپنے بطون پر قائم ہے تو عالمِ اجسام بھی وہیں ہے جہاں اس کے دیگر باطنی عوالم ہیں۔ یہ تصور کرنا کہ عالمِ اجسام کہیں اور ہے اور عالمِ ارواح کہیں اور، ہے یہ حقیقت کے خلاف ہوگا۔ اس لیے کہ جہاں باطن ہوگا وہیں اس کا ظہور ہو سکتا ہے۔ جہاں باطن نہ ہو وہاں ظہور نہیں ہو سکتا۔ اور اس نکتہ پر معرفت کے بڑے بڑے مسائل موقوف ہیں۔

خلق اور امر کا تقابل

اب جبکہ ہمیں خلقِ ربّی کی معرفت حاصل ہو گئی تو ہم امرِ ربّی سے اس کا تقابل کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ جب یہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد و عکس ہیں تو اُن کی تعریفات بھی اُلٹ جائیں گی۔ مثلاً یہ خلقِ ربّی محسوس ہے تو امرِ ربّی غیر محسوس ہوگا۔ یہ آخری عالم ہے تو وہ ابتدائی عالم ہوگا (کیونکہ حقیقتہً عالم دو ہی ہیں عالمِ خلق اور عالمِ امر۔ باقی عوالم اعتباراً عالم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عالم حدِ یقینی کا نام ہے اور صرف ان دونوں عوالم میں حدِ یقینی پائی جاتی ہے)۔ یہ کثیف ہے تو وہ لطیف ہوگا۔ یہ ظاہر ہے تو وہ باطن ہوگا۔ وغیرہ۔

امرِ ربّی کی معرفت

جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ امرِ ربّی غیر محسوس ہے تو اُسے دیکھ کر، سن کر، چکھ کر، سونگھ کر اور چھو کر معلوم کرنے کی کوشش کرنا دُور از کار ہے بلکہ جس طرح عالمِ اجسام مادی احساسات کے ذریعہ پہچانا گیا تھا اسی طرح "عالمِ امر" روحانی

Marfat.com

قوتوں سے معلوم کیا جائے گا۔ چنانچہ ہم اس عالم کو روح کی بصیرت سے دیکھ سکتے ہیں۔ روح کی سماعت سے سن سکتے اور دیگر روحانی احساسات سے ہی ادراک کر سکتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے روحانی قوائے باطن اسی طرح کارآمد صحیح اور بے عیب ہوں جس طرح ہمارے ظاہری احساسات ہیں۔ (اور یہ ممکن نہیں ہے جب تک کسی مربی کے ذریعہ اُن کو کارآمد بنانے کے لیے صحیح طریقہ پر تربیت نہ کی جائے)

امرِ ربّی کی معرفتِ علمی

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ خلقِ ربی یہی عالم اسباب و علل ہے جس میں ہر شے کا ظہور علت و سبب اور زمان و مکان کا محتاج ہے۔ یعنی اگر اسباب وسیلے اور ذرایع ہوں گے تو اشیاء کا ظہور ہو گا۔ ورنہ نہیں۔ اور عالم امر اس کا اُلٹا ہے، تو لامحالہ وہ اپنے ظہور میں اسباب و علل کا محتاج نہ ہو گا۔ نہ زمان و مکان کی مادّی قید اُس پر عائد ہو گی۔ وہ محض ایک عالمِ نور ہے جو مشیئت و قدرت کے ماتحت امر "کن" سے پیدا ہوا اور اپنی نوری رفتار کے ساتھ باطن سے ظاہر ہوا اور امر سے خلق کی طرف سفر کر رہا ہے۔ اور ہمارے کثیف مادّی احساسات کو جو باطن یا عالمِ امر میں داخل ہونا چاہتے ہیں واپس خلق کی طرف پھینک دیتا ہے اس لیے یہ وہاں پہنچنے سے قاصر و عاجز ہو جاتے ہیں۔ یہ عالم، محسوس تو نہیں ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ یہ عالمِ نور ہے اس لیے نورِ عقل ہی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس علم کے لیے بطریقِ استمداد اگر ایک لنگ مثال پیش کی جائے تو بیجا نہ ہو گا۔

خورشید کی مثال

ایک لنگ مثال ہے۔ لیکن اس سے ہماری عقل کو اتنی مدد ضرور مل سکتی ہے کہ وہ امرِ ربّی کو بطریقِ علم جان سکے کہ کیا ہے؟ سورج ایک مادّی مخلوق ہے اور اُس کی مادّی روشنی، اُس کی ابتدائے تخلیق سے آج تک برابر اُس کے جسمِ ناری سے ظاہر کی طرف خارج ہو رہی ہے اور نوری رفتار سے حدودِ نظامِ شمسی تک

Marfat.com

پھیل رہی ہے۔ سورج کی اس روشنی کی پیدائش خود بخود ہو رہی ہے، یہ کسی سبب و علت پر منحصر نہیں۔ سورج کی یہ روشنی حقیقتاً غیر مرئی ہے۔ یعنی نظر نہیں آتی۔ (اگر ہم دن کے وقت زمین کو چھوڑ کر سورج کی طرف پرواز کریں تو حدودِ ثقل و کشش سے گزر جانے اور خلائے بسیط میں پہنچ جانے کے بعد ہمیں سورج کی روشنی نظر نہ آئے گی۔ ایک طرف روشن سورج کا کرّہ ہوگا۔ ایک طرف چاند کی طرح چمکتی ہوئی زمین یا دیگر اجرامِ فلکی دکھائی دیں گے اور دن کو تارے نظر آنے لگیں گے) یہ مثالِ عالمِ امر کی ہے۔ اب سورج کی یہی روشنی جو غیر مرئی ہے جب کسی جسمِ کثیف زمین چاند ستارے وغیرہ پر پڑتی ہے تو چونکہ جسم کی کثافت کی وجہ سے اُس سے پار نہیں ہو جاتی اس لیے اس کو روشن کر دیتی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ سورج کی روشنی نظر آ رہی ہے۔ یہ سورج کی روشنی نظر نہیں آ رہی ہے بلکہ روشنی سے فضائے ہوائی کے ذرّات اور اجسامِ کثیفہ نظر آ رہے ہیں۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ مختلف اجسام میں اس روشنی کا مختلف ظہور ہوتا ہے۔ جب یہ روشنی گلاب کے پھول پر پڑتی ہے تو سرخ رنگ نمودار ہوتا ہے اور اُس کی پتیوں پر پڑتی ہے تو سبز رنگ اختیار کرتی ہے۔ دُھلے ہوئے کپڑے پر پڑتی ہے تو اُجلا کرتی ہے، اور دھوبی کا جسم اس سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ سُرخ و سبز وغیرہ الوان سوائے سورج کی روشنی کے ظہور کے اور کچھ نہیں ہے۔ پس سمجھنے کیلیے اگر ہم سورج کی روشنی کو عالمِ امر کی مثال اور سرخ و سبز وغیرہ رنگ کو عالمِ خلق کی مثال سمجھیں تو ہماری عقل کو اس کی علمی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور توجّہِ علمی کے لیے اتنا اشارہ کافی ہے۔

روحِ انسانی

اب جبکہ ہمیں رُوح کے متعلق یہ جواب ملا کہ وہ امرِ ربّی ہے اور مخلوق امری کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نوری ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نور کا خاصّہ یہ ہے کہ وہ جس کثیف جسم پر پڑتی ہے اُس کی مناسبت سے ظہور اختیار کرتی ہے تو ہمیں اپنی روح کی علمی معرفت آسان ہو گئی۔ اب ہم اپنے جسم کے ایک ایک عضو اور ایک ایک حصّہ کو د[illegible] جو ہماری

Marfat.com

رُوح کے مَنظر ہیں، اپنی رُوح کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اور ہر ہر شان و تعین اور ظہور و حدوث میں اپنی رُوح کا جلوہ، عقل کی بصیرت سے دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے جسم میں رُوح کی وحدانیت

ہمارے اعضا کی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور اس اختلاف کی وجہ سے ان کے خواص، افعال، اسماء وصفات بھی مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً کان میں سماعت، آنکھ میں بصارت وغیرہ۔ لیکن ساخت کے اختلاف کے باوجود ان اعضا کی بنیاد، اعصاب حِس پر ہوتی ہے یا اعصاب حرکت پر۔ اور یہی روحِ انسانی کے ظہور کا آلہ ہیں۔ پس ہر ایک عضو میں وہی رُوح کار فرما ہے جسے امرِ ربّی کہا گیا ہے۔ اس نور کی چند شعاعیں جب حیوانی اور نفسانی قابلیات کے آئینوں کے چھن کر اعضاء تو اس پر پڑتی ہیں تو اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی صفات و افعال ظاہر کرتی ہیں۔ روح وہی ایک ہے جب کان میں ظہور کرتی ہے سماعت بن جاتی ہے، آنکھ میں ظہور کرتی ہے بصارت بن جاتی ہے وغیرہ۔ اس لیے کہ اس روحِ انسانی کے نور میں جملہ صفات موجود ہیں۔ جس مظہر پر وہ نور پڑتا ہے ایک خاص ظہور اختیار کرتا ہے۔ اور ہم اپنی بصیرتِ عقل کے ذریعہ روح کو دیکھ سکتے اور اس کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

قلب

قلب کے معنی اُلٹے اور صورت بدلنے والے کے ہیں۔ جیسے "انقلاب" یا "قلبِ ماہیت" جب ہم آئینے پر نظر ڈالتے ہیں تو اُس میں ہمارا عکس اُلٹا نظر آتا ہے۔ یعنی ہمارے داہنے اعضا بائیں اور بائیں اعضا داہنے نظر آتے ہیں۔ اس کا نام عکس ہے یعنی اُلٹا۔ یہ قلب ہماری رُوح اور ہمارے جسم کے درمیان، یعنی عالمِ امر اور عالمِ خلق کے درمیان برزخ ہے۔ اسے رُوح اور جسم کے درمیان ایک "آئینہ دیوار" تصور کرنا عین مناسب ہے۔ جس کا رُخ رُوح کی طرف مجلّٰی اور مصفّٰی ہے۔ اور اس کی پشت نفس و جسم کی طرف ہے۔ اور چونکہ نفس و جسم

Marfat.com

کثیف ہیں۔ اس لیے اس آئینے کی پشت اس طرح بند ہو گئی ہے جیسے قلعی شدہ آئینے کی پشت ۔ اس لیے اس میں قابلیتِ انعکاسی ہے اور رُوح کی طرف سے عالمِ امر کی جو چیز، جو بات، جو اسم اور جو صفت اس کے سامنے آتی ہے اُس کا عکس آئینۂ قلب میں منعکس ہو جاتا ہے ۔ اور چونکہ جملہ موجودات عالمِ امر میں ہمہ وقت موجود ہیں اس لیے دل میں کائنات (عالمِ خلق اور عالمِ امر) کی ہر چیز منعکس ہو سکتی ہے ۔ اور اس کی وسعت اس درجہ ہے کہ کائنات ہی نہیں بلکہ کائن کے جملہ افعال، اسماء، صفات، تعینات اور شیونات کا عکس بیک وقت اس پر پڑ سکتا ہے ۔

آئینے کی وسیع دامانی

ہم آئینے کو اپنے ہاتھ میں لیں تو بظاہر وہ ایک چھوٹی سی چیز نظر آئے گا لیکن جب اُس کے باطن میں جھانکیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ تمام وسعتیں جو کائنات کی آسمانوں میں نظر آتی ہیں سب اس میں موجود ہیں ۔ بلکہ یہ وسعتیں تو وہ ہیں جہاں تک ہماری نظر نے کام کیا ہے ۔ اگر ہماری نظر اس سے زیادہ کام کرے تو اس سے زیادہ وسعتیں اس آئینے میں نظر آ سکتی ہیں جن کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی ۔ یعنی ایک چھوٹا سا مخلوق و محدود آئینہ اپنے باطن میں جملہ عالمِ خلق و عالمِ امر بلکہ مکان و لامکان کی تمام وسعتیں سمیٹے ہوئے ہے ۔ اسی طرح ہمارا آئینۂ قلب ہے، جو ہمارے باطن میں بمنزلۂ عرش عالمِ کبیر کے ہے ۔ جس طرح عرشِ اعظم کا ایک رُخ عالمِ امر کی طرف اور ایک عالمِ خلق کی طرف ہے ۔ دل کا ایک رُخ جو رُوح کی طرف ہے رُخِ امری اور دوسرا رُخ جو جسم کی طرف، خلقی ہے اور چونکہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ کر اُلٹ جاتے ہیں اس لیے اس آئینے کو قلب کہتے ہیں ۔ اور عالمِ خلق انفسی کا لطیف ترین اور ارفع ترین جسم ہے ۔ اس کے بعد عالمِ امر انفسی ہے

اولین مخلوق

اللہ تعالیٰ کی خلقتِ امری میں اولین مخلوق نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور عالمِ امر میں اس نورِ محمدیؐ کے کئی اعتبارات ہیں ۔ اور اعتبار کی بنا پر اس کا

Marfat.com

خاص نام ہے۔ چونکہ یہ خود ظاہر ہے اور ظاہر کرتا ہے، جملہ کائنات میں اسی کی روشنی ہے۔ اس لیے اس کو نور کہتے ہیں۔ چونکہ یہ مدرِک اور مدرَک ہے یعنی ادراک کرسکتا اور درک کراتا ہے اس لیے اس کو عقلِ اول کہتے ہیں۔ اور جملہ عقولِ اضافی اسی عقلِ اول کے ظہورات ہیں۔ اور چونکہ یہ نور خود حیات رکھتا ہے اور دوسرے کو حیات پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے اس کو روحِ اعظم کہتے ہیں۔ اور چونکہ جملہ کائنات ایک کتابِ الٰہی ہے اور اس کتاب کے جملہ حروف و عبارات اسی نور کے ذریعہ لکھے گئے ہیں، اس اعتبار سے اس کو قلم کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم خالق و مخلوق، عابد و معبود، ساجد و مسجود، رازق و مرزوق، ستّار و مستور، غفار و مغفور، وغیرہ وغیرہ کے درمیان حیثیتِ برزخی رکھتا ہے۔ یعنی اس نور سے گزر کر ہی تمام رحمتیں اور افعالِ الٰہی خلق کو پہنچتے ہیں، اور بندے کے تمام نذر و نیاز، دعا و عبادت، سجدے اور نیکیاں اللہ تعالیٰ تک پہنچتی ہیں، اس لیے اس کو برزخِ کبریٰ بھی کہتے ہیں۔

اعتباری اختلافات

یہ اختلافِ اسمائی و صفاتی ——— جو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آرہا ہے ہرگز قابلِ حیرت و استعجاب نہیں۔ اس لیے کہ یہ اعتباری اختلافات خود ہمارے اندر موجود ہیں جن کی بنا پر ہمارے اسماء، افعال اور صفات مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اپنے باپ کے اعتبار سے ہم "بیٹا" ہیں۔ اپنے بیٹے کے اعتبار سے ہم "باپ" ہیں۔ بہن کے اعتبار سے ہم بھائی ہیں اور بیوی کے اعتبار سے "شوہر"۔ ان کے علاوہ کچھ اور صفاتی اعتبارات ہیں جیسے فرمانروائی کے اعتبار سے افسر ہیں، سخاوت کے اعتبار سے سخی، انصاف کے اعتبار سے عادل۔ اسی طرح مسلم، مومن، صالح، متقی، وغیرہ اعتبارات کی بنا پر اسماء ہیں۔ اسی طرح اگر اس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو فعالیت کے اعتبار سے آدمِ کبیر اور قابلیت کے اعتبار سے سوائے کائنات کہیں۔ یا خدا کی زیادہ حمد کرنے کے اعتبار سے احمد اور مخلوق سے مدح کیے جانے

Marfat.com

کے اعتبار سے محمّد (صلوٰۃً وسلاماً دائماً ابداً) کہا جائے تو اس میں کوئی حیرت کا مقام نہ ہونا چاہیئے۔

حدودِ عالمِ امر

نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہونے کے بعد تسبیح و تقدیس کے ساتھ لامکاں میں کئی ارب سالوں تک نور افشانی کی۔ اور جہاں تک لامکاں کو اپنی امری روشنی سے منور فرمایا وہی عالمِ امر کی حدودِ مکانی ہیں۔ یہی وہ دائرۂ امری ہے جس کے باہر کوئی مخلوق امری یا خلقی نہیں۔ بلکہ سب کے سب ماسوی اللہ اسی دائرے کے اندر ہیں۔ حتیٰ کہ عرشِ اعظم .... اور لوحِ محفوظ تک اسی نور کے دائرے میں محدود و مقید ہیں۔ جنت و دوزخ بھی جمالی اور جلالی اعتبار سے اسی عالم کے خاص مقامات میں مقرر و متعین ہیں۔

حدود عالمِ خلق

عرشِ اعظم کے اس رُخ سے جو عالمِ خلق کی طرف ہے عالمِ خلق شروع ہوتا اور جمادات کے اسفل السافلین تک آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس نقطۂ جمادی کے نیچے سوائے انسان کے اور کوئی عالم نہیں ہے۔ جنات، حیوان اور نباتات، جمادات وعناصر ان کے درمیان کے عوالم ہیں جو عروج میں عروج اور نزول میں نزول کرتے ہوئے اپنا عالم تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

خلاصہ کلام

روح کے متعلق سوال میں اللہ تعالےٰ نے یہ جواب دے کر کہ یہ امرِ ربی ہے ہمیں تفکر کی طرف ہدایت فرمائی اور شوق دلایا کہ ہم امرِ ربی کی تحقیق میں سیرِ عقلی کریں یعنی صورت وظاہر کی سطح سے معنی و باطن کے عمق میں غوطہ لگائیں۔ غوطہ خور جب سمندر میں غوطہ لگاتا ہے تو کچھ نہ کچھ ضرور اُس کے ہاتھ آجاتا ہے۔ موتی نہیں تو سیپ سہی، خالی ہاتھ تو نہیں آتا۔ اسی لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے تَفَکَّرُوْا فِیْ آلَاءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِ اللّٰہِ۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نشانیوں، تعینات وشیونات، افعال اسماء وصفات میں غور کرو، مگر ذاتِ الٰہی میں فکر نہ کرو۔ کیونکہ نورِ عقل کو ذات تک رسائی نہیں

Marfat.com

یہ نہ سوچو ذاتِ خدا کیا ہے، کیونکر ہے، کیسا ہے، کہاں ہے، کب سے ہے؟ کیونکہ ذات میں تفکر کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اُس کی کچھ نشان دہی کی جاتی جب کوئی نشان ہی نہیں ہے تو تفکر کو کیوں کر راستہ مل سکتا ہے۔ نشانیاں جو کچھ ہیں وہ اسماء وصفات کی ہیں پس ہم ان کے متعلق غور کر سکتے ہیں۔ اور اپنی استعداد کے مطابق موتی تلاش کر سکتے ہیں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دو ۲
ساغر ۱۷

حسنِ خلق

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

مومنِ کامل اور حسنِ خلق

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا۔ کامل ترین مومن ایمان میں وہ ہے جس کا خلق سب سے اچھا ہو۔ یعنی جو مومن سب سے زیادہ حسنِ خلق رکھتا ہے۔ اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر ہمارے لیے میدانِ عمل کا راستہ کھول دیا، تاکہ ہم اپنے ایمان کو کامل تر بنانے کے لیے اپنے اخلاق کو دوسروں سے بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اور اس بات کا لحاظ و خیال رکھیں کہ کوئی دوسرا اخلاق میں سبقت نہ لے جاسکے۔ جب اخلاق میں بلند کردار ہوگا تو ایمان میں کامل ہوگا اور جب ایمان میں کامل ہوگا تو مقربِ درگاہِ خداوندی ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے نزدیک ہوگا۔ اور جب دوست نزدیک ہو تو سبحان اللہ "کیا کچھ" فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ وہ اللہ سے راضی ہوگا اور اللہ اُس سے راضی ہو جائے گا۔ پھر اسے کوئی خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کا حزن۔ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

Marfat.com

اثراتِ خُلق

خُلق وہ عادت واطوار اور کردار ورفتار ہے جو بے تکلف سرزد ہو، اور دوسرے آدمی پر اثر انداز ہو۔ مثلاً جب دو آدمی آپس میں ملتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں کچھ ایسے خاموش اخلاقی جذبات کا اظہار ہو جاتا ہے جو دفعتہً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر یہ جذبات انبساطی ہیں تو زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ بلکہ اس معنی کو دوسرے کا دل از خود معلوم کر لیتا ہے، اور یقین کرتا ہے کہ میری ملاقات سے یہ اتنا ہی خوش ہوا ہے جتنا میں اس کی ملاقات سے خوش ہوا ہوں۔ یہی ابتدائی جذبہ دونوں کے درمیان محبت کا بیج بن جاتا ہے۔ اور اگر کوئی رکاوٹ درمیان میں نہ آجائے تو اس سے شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں اور یہ محبت ایک سایہ دار درخت بن کر اُن کی زندگی پر چھا جاتی ہے۔ اور اگر یہ ابتدائی جذبات وتاثرات انبساطی ہونے کی بجائے انقباضی ہیں تو زبان سے ہزار کچھ کہا جائے "میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ مجھے آپ کے ساتھ بڑی انسیت ومحبت ہے"، بالکل بیکار ہوگا۔ کیونکہ شخص مقابل جب اپنے دل میں کوئی انبساطی اثر محسوس نہ کرے گا تو جان لے گا کہ غلط بیانی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اور دونوں کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے گی۔

خوش خُلق وبد خُلق

اگر ملاقات، معاملات اور معاشرت میں کسی کا اندازِ نظر شگفتہ، طریقِ ملاقات دل پسند، طرزِ گفتار دل نشیں، نشست وبرخاست مؤدّب، کردار وعادات راحت رساں اور نیت وجذبات فلاح وبہبود پر مبنی ہیں اور وہ اسلام میں داخل ہے تو یقیناً خوش خُلق، صاحبِ حسنِ معاشرت اور مؤمن وصالح ہوگا۔ لیکن اگر اس کے برخلاف ہے تو وہ آدمی بد خُلق، بد معاشرہ اور طالح الانسان ہے۔

نتائجِ اخلاق

آپ اپنی زندگی میں جیسی جیسی اہم شخصیتوں سے ملے ہیں اُن کے اخلاقِ حسنہ یا رذیلہ سے آپ اس درجہ ضرور متأثر ہوئے ہوں گے کہ اس کی یاد آج تک

Marfat.com

آپ کے حافظہ میں محفوظ ہوگی ۔ اور یہی نہیں کہ اس کی یاد محض باقی ہے، بلکہ آپ جس وقت اس کا خیال کرتے ہیں وہی اثر آپ کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اور آپ اُس سے خوشنود یا رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

اور یہی نہیں کہ یہ اخلاقی اثر اسی زندگی تک ہے اور موت کے بعد ختم ہو جائے گا ۔ نہیں نہیں یہ اثرات زائل ہونے والے نہیں، بلکہ قیامت اور اُخروی زندگی میں بھی بحالہ باقی رہیں گے ! اور وہاں بھی ان کے اثرات میں کمی یا مفر نہ ہو گا ۔ یہی عذاب و ثواب کا باعث ۔ اخلاق و معاملات کا اثر ریاضات و مجاہدات اور فرائض و واجبات سے بھی قوی اور دیرپا ہوتا ہے ۔

طریقِ حصولِ اخلاقِ کریمہ

اخلاقِ کریمہ حاصل کرنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کے حاملوں اور کردارِ حسنہ کے معلّموں کی صحبت و مجالست اختیار کریں اور اخلاقی کتب کا مطالعہ کرتے رہیں ۔ اور اگر خود حسّاس و باشعور ہیں تو اپنے دل پر دوسروں کے اخلاق کا اثر محسوس کریں اور دیکھیں کہ جب ایک شخص آپ کے ساتھ کسی خاص طریقہ سے پیش آیا تو آپ نے اس کا کیا اثر لیا ۔ اگر آپ اُس بات سے خوش ہوئے اور آپ کے دل میں قبولیت و پسندیدگی کا اثر غالب آیا تو جانیں کہ یہی خُلقِ حَسَن ہے آپ دوسروں کے سامنے اس سے بھی بہتر پیش کرنے کی کوشش کریں ۔ اگر آپ اُس کی کسی بات سے کبیدہ خاطر ہوئے اور ناگواری کا اثر محسوس کیا تو سمجھ لیں کہ وہ بداخلاقی ہے آپ دوسروں کے ساتھ اس طرح پیش نہ آئیں ۔ یونہی رفتہ رفتہ توجّہ کرتے رہنے سے آپ کریم النفس خوش اخلاق، راحت رساں اور معاشرے کے لیے مفید انسان بن جائیں گے ۔

خانگی اخلاق

گھر میں بعض افراد ہم مرتبہ ہوتے ہیں، بعض بڑے اور بعض چھوٹے ۔ اپنی گھریلو زندگی میں خُلقِ حَسَن کی فضا پیدا کرنا اور اُسے قائم رکھنا اشد ضروری ہے ۔
کیونکہ انسان کے لیے اس کا گھر ہی تربیت گاہِ اخلاق اور اپنے کرداری مُہروں کو احسن طریقے سے چلانے کی بساط ہوتا ہے ۔ اگر گھر میں اخلاقی فضا قائم نہ ہو تو سادہ طبیعت اور خورد سال بچے

Marfat.com

باہر کہیں اخلاقی اسباق حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ گھر میں جو ابتدائی اثر واقع ہوتا ہے وہی زندگی بھر قائم رہتا ہے۔ اسکول، کالج یا معاشرہ اس میں ترقی وجلا تو پیدا کرسکتا ہے، لیکن اس ابتدائی اثر کو زائل کر کے اس کے خلاف اثرات رونما نہیں کرسکتا۔ جو لوگ بچوں کی شکایت کرتے ہیں کہ فلاں بچہ غلط ماحول یا معاشرے کی بے راہ روی سے بد اخلاق و بدکردار ہوگیا زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اگر تلاش کی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اس اخلاق کا بیج اپنے گھر ہی سے حاصل کیا تھا۔

آدابِ بزرگان

ہمارے گھر میں ماں باپ، چچی چچا، پھوپی پھوپا، بڑے بھائی بہن وغیرہ گھر کے بزرگ ہیں جس طرح ان کا فرض ہے کہ مذکورہ بالا اخلاق حسنہ کو اپنے چھوٹوں پر آزمائیں اور اُن کے دل میں نیک و بد اخلاق کی تمیز پیدا کریں، اسی طرح چھوٹوں کا فرض ہے کہ وہ بڑوں کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں اور کوئی بات ایسی نہ کریں جو انھیں ناگوار ہو۔ اور بزرگوں کی خدمت میں سب سے بڑا ادب و احترام یہ ہے کہ ان کے احکامات کی پوری پوری فرمانبرداری کی جائے۔ اور جس چیز سے روک دیں اُس سے رُک جائے۔ رفتار، کلام، حرکات و سکنات میں پیش قدمی کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ جملہ امورات میں اُن کے پیچھے اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ جن علمائے نفسیات کا یہ مقولہ ہے کہ اس سے احساس کمتری پیدا ہوتا ہے تجدید نظر کے قابل ہے۔

برابری کے آداب

یہ برابری یا سن و سال میں ہوتی ہے یا مرتبے میں۔ اگر سن و سال میں برابری ہے لیکن مرتبے میں دوسرا بڑا ہے، یا مرتبے میں برابر ہے اور سن و سال میں بڑا ہے تو دونوں آپس میں ایک دوسرے کو بزرگانہ مرتبہ دینے کی کوشش کریں۔ یعنی ایک دوسرے کا ادب و احترام کریں۔ لیکن بزرگوں کے ادب و احترام کے مقابلے میں کسی قدر بے تکلفی کا شائبہ ہوگا۔ اور اگر دونوں حیثیت سے برابر ہوں گے تو احترام پر بے۔ تکلفی غالب ہوگی۔

Marfat.com

چھوٹوں پر شفقت

گھریلو زندگی میں بلوغت سے قبل بچوں کی کافی اہمیت ہوتی ہے، یہ وقت بچوں کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ معصومیت کے ساتھ شوخی، چلبلا پن، عجلت، شرارت اور غیرضروری چیزوں کے متعلق پوچھنے، سمجھنے اور چھونے کا جذبہ غالب رہتا ہے کھیل کود اور کھانے پینے کی چیزوں کی طرف رغبت حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ نہایت حکمت اور دانائی سے اُن کی تربیت کی جائے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ جو بات ہم اُن میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، اُن سے یہ نہ کہیں کہ تم ایسا کرو، بلکہ خود ویسا ہی کر کے اُن کے سامنے مسلسل اور متواتر نمونہ پیش کرتے رہیں۔ یا اگر کسی بات سے روکنا ہے تو ہم خود اُس سے بچنے اور رُکنے کی مثال اُن کے ذہن میں بٹھاتے رہیں۔ بچے جب ایک بات کو مسلسل دیکھتے، اور محسوس کرتے ہیں تو تقلیداً خود بھی ویسا ہی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ وہ بات اُن کی فطرت ثانیہ یعنی عادت ہو جاتی ہے۔

چھوٹوں پر تشدّد

یہ بات بارہا کے تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ بچوں کی اصلاح و نصیحت کے لیے تشدّد اختیار کرنا، یا بچوں کو ڈرا کر کسی طرف موڑنا عقلمندی نہیں ہے۔ اس سے بچے ضدی اور تشدّد پسند ہو جاتے ہیں۔ یعنی جیسا اُن کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی کرتے ہیں۔ اور اُن کی شخصیت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بچوں کی فطرت ہے کہ جب اُنھیں کسی کام سے روکا جاتا ہے تو اور شدّت سے وہی کام کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی طبیعت میں نرمی اور لچک ربڑ کی گیند کی مانند ہوتی ہے کہ جہاں سے پھینکی جائے ٹکر کھا کر اُسی طرف واپس لوٹتی ہے۔ اسی طرح بچے وہی کام کرتے ہیں جس سے منع کیا جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کو کسی کام سے روکنا نہ چاہیے، بلکہ اُن کی توجہ کو دوسری طرف موڑ دینا چاہیے۔ تاکہ وہ خود اس کام سے رُک جائیں۔

Marfat.com

اخلاق ہمسایہ گان ہمسایوں کے ساتھ اگر اعزا کے سے اخلاق برتے جائیں تو افضل اور بہتر ہیں۔ ورنہ کم از کم خوردی و بزرگی کا لحاظ تو اسی طرح رکھنا لازمی اور ضروری ہے ۔ آپ کو بہر حال یہ ثابت کرنا ہے کہ آپ ہر حال میں اُن کے مددگار معاون اور خیر اندیش ساتھی ہیں ۔

دفتری اخلاق اگر دفتر میں بھی خانگی اخلاق کی فضا پیدا کر دی جائے اور وہی آداب خوردانہ و بزرگانہ و متوسطانہ ملحوظ رکھے جائیں تو سبحان اللہ ۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا خیال ضرور رکھا جائے کہ ہم ایسے اخلاق کا مظاہرہ دوسروں سے ہرگز نہ کریں کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ کرتا تو ہمیں ناگوار ہوتا ۔ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ ایسے اخلاق سے پیش آئیں جیسا ہم دوسروں سے امید کرتے ہیں ۔ جب تک نوکری کریں افسروں کی فرمانبرداری اور پاس خاطر ملحوظ رکھیں ۔ نہ ہو سکے تو نوکری نہ کریں ۔

خُلقِ عظیم قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" آپ ایک بلند پایہ خلق پر قائم ہیں ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک صفت عظمت ہے جس سے اُس کا ایک نام العظیم ہے ۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کو اپنی صفتِ عظمت سے متصف کر کے عظیم فرمایا ۔ تاکہ ہم اخلاق کے من جملہ اقدار کو نظر انداز نہ کریں ۔

اخلاق اللہ ویسے تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ و مطہرہ کا ایک ایک لمحہ ایک ایک حرکت ایک ایک کلام خلقِ عظیم کا نمونہ اور اخلاقِ حسنہ کی مثال ہے ۔

لیکن یہاں صرف ایک مخصوص خُلق پر غور کرنا کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاق کو خلقِ عظیم فرمایا ، تو آپ اُمت کو اسی خلق کی اتباع کرنے کا حکم فرماتے کہ اے ایمان والو میرے اس

Marfat.com

خلقِ عظیم کی پیروی کرو، اور میرے وہ اخلاق پیدا کرو جس کی اللہ نے تعریف کی ہے۔ نہیں، بلکہ اِس اخلاقِ کریمانہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ آپ فرماتے ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلّق ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ کے اخلاق کی تعریف فرماتا اور خُلقِ عظیم کہتا ہے۔ اور آپ اُس خُلقِ عظیم کو ثابت فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اخلاقِ اعلیٰ کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ دیکھو۔ اللہ تعالیٰ ہر خطا اور غلطی سے مبرّا اور پاک ہے، اپنے خطاکار بندوں کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرماتا ہے۔ قوی و قادر ہے، کمزوروں اور بے سہاروں کی مدد فرماتا ہے۔ غنی ہے، فقیروں پر عطا کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو آپ بھی دنیا میں یہی اخلاق برتنے کی کوشش کریں۔ تاکہ عبد و معبود کے درمیان نسبتِ توفیق قائم ہو جائے اور باقی رہے۔

اخلاقِ محمدیؐ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کی تعلیم و نصیحت میں بھی کبھی سختی و تشدد سے کام نہ لیتے، بلکہ نہایت نرمی اور اصولِ حکمت سے تعلیم فرماتے، تاکہ تعلیم و نصیحت کی تلخی کسی کے دل میں احساسِ نفرت نہ پیدا کر دے۔ مثلاً کسی نا محرم پر (دیکھنے کے ارادے سے) نظر اُٹھانا بداخلاقی اور گناہ ہے۔ اسلام نے اس کو ناپسند فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم نے یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ اور یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ۔ الفاظ میں اپنی نگاہیں (نامحرمات کو دیکھنے سے) نیچی رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس انداز حکمت سے تعلیم فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

سرکش اونٹنی

حضور صلی اللہ علیہ کسی جہاد سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے۔ ایک جگہ لشکر نے پڑاؤ کیا۔ اور لوگ اپنی اپنی ضروریات میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالات کا معائنہ فرماتے ہوئے پڑاؤ کے باہر آبادی کے قریب تشریف لائے تو دیکھا چند عورتیں دف بجا کر گانا گا رہی ہیں۔ اور ایک صحابی

Marfat.com

درخت کی آڑ میں کھڑے ان عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب حضورؐ نزدیک تشریف لائے تو وہ گھبرا گئے۔ حضور نے پوچھا۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟۔ عرض کی۔ حضور میری اونٹنی سرکش ہے میں اُسے باندھنے کے لیے رسّی کی تلاش میں اِن عورتوں کے پاس آیا تھا کہ ان سے رسّی حاصل کروں۔ حضورؐ یہ سن کر واپس تشریف لے گئے۔ جب دوسری منزل پر قیام کیا اور وہ صحابی سامنے آئے حضورؐ نے دریافت فرمایا۔" کیا حال ہے تمھاری اونٹنی کا، اِسے تم نے باندھ دیا یا نہیں؟ وہ اس سوال سے ذرا شرمندہ ہوئے اور کچھ ہاں نہیں میں جواب دے کر اپنی جان چھڑائی۔ آگے پھر کسی مقام پر وہ صحابی سامنے آئے۔ حضورؐ نے پھر وہی سوال کیا۔ تمھاری اونٹنی کا کیا حال ہے؟ وہ کچھ زیادہ شرمندہ ہوئے اور کچھ جواب دیا۔ غرض مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد بھی جب کبھی وہ صحابیؓ سامنے آتے، حضورؐ سب سے پہلے اونٹنی کا سوال کرتے۔ اور ہر مرتبہ شرمندگی زیادہ ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ حضورؐ کے سامنے آنے سے کترانے لگے۔ جب جماعت کھڑی ہوجاتی تو آکر نماز میں شامل ہوجاتے۔ اور حضورؐ کے باہر آنے سے پہلے مسجد سے نکل جاتے تاکہ اونٹنی کی بابت سوال اور اُس کی شرمندگی سے بچ سکیں۔ اتفاقاً ایک دن حضورؐ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا وہ صحابیؓ نفل نماز میں مشغول ہیں۔ آپؐ وہیں ان کے قریب بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے یہ محسوس کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے قریب تشریف فرما ہیں تو انھوں نے قیام کو طول دینا شروع کیا۔ اور سوچا کہ میں جیسے ہی نماز ختم کروں گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اونٹنی کا سوال کریں گے لاؤ، میں نماز اتنی طویل کر دوں کہ حضورؐ تشریف لے جائیں۔ لیکن حضورؐ نے اُن کا ارادہ جان کر اپنے آپؐ سے فرمایا۔" خواہ کتنی ہی دیر ہو جائے مگر میں نماز ختم ہونے کا انتظار کروں گا اور اونٹنی کا حال پوچھ کر ہی جاؤں گا۔" یہ سن کر انھوں نے نماز مختصر کی اور بڑے الحاح و عاجزی کے ساتھ سوال کے جواب میں عرض کیا۔" یارسول اللہؐ! قسم ہے ربّ کعبہ کی کہ اب اونٹنی بالکل رام ہے۔ اور اب

Marfat.com

اُسے کسی رسّی کی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد حضورؐ نے اُن سے اونٹنی کا سوال نہیں کیا۔ اور نہ اُنھوں نے زندگی بھر کسی نامحرم کو نظر اُٹھا کر دیکھا۔ یہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ نصیحت۔

عادتِ دشنام

ہر متکلم کا اپنا ایک اندازِ کلام ہوتا ہے۔ بعض لوگ بچپن کی بے احتیاطی اور غلط تربیت کی بنا پر محض بیکار، فضول اور غیر حقیقی کلمات و الفاظ و جملے استعمال کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک ہے تکیہ کلام اور دوسرا دشنام جس طرح گفتگو میں تکیہ کلام کے کوئی معنی نہیں ہوتے اسی طرح کلام میں دشنام قطعی مہمل اور بے معنی ہے لیکن اس کے باوجود دونوں میں اثرات پائے جاتے ہیں۔ تکیہ کلام میں انبساطی اثر ہے اور دشنام میں انقباضی۔ جب کسی کو دشنام کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ بغیر دشنام کے گفتگو نہیں کرسکتا۔ اس کے سنجیدہ کلام میں بھی دشنام یقینی ہوتا ہے، جو اُنھیں گھر کی تربیت گاہ سے ملتا ہے۔ یہی حال ہمارے معاشرے میں موجودہ عالم نُما ملاؤں کا ہے کہ جب وہ ممبر پہ بیٹھتے ہیں تو اُن کو اپنے چاروں طرف ذلیل، ناکارہ اور بیہودہ لوگ ہی نظر آتے ہیں۔ وہ سب کو اپنے علاوہ قابلِ دشنام سمجھتے ہیں۔ اور جو سامنے آجائے اُسی کو کفر و شرک اور بدعت کی چندیوں (فتاوے) میں لپیٹ کر جہنم کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کو منھ سے لگا کر ایسے غیض و غضب کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اُن کی آواز لاؤڈ اسپیکر کی آواز سے کشتم کشتا کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ منھ سے کف جاری ہونے لگتا ہے اور سننے والوں کے کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔ آلۂ مکبر الصوت اُن کی اکھڑی ہوئی سانسوں کو طوفانی صداؤں میں تبدیل کر کے ان کی باطنی بے چینی، متلاطم اور ہیجانی جذبات کی رونمائی کرتا ہے۔ کیا موعظتِ حسنہ کا یہی صحیح طریقہ ہے؟ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اندازِ تقریر و کلام کی تعلیم فرمائی ہے؟ ۔۔۔ ہاں، صاحبانِ بصیرت جانتے اور دیکھتے ہیں کہ یہ علماء کس ناپاک بیماری میں مبتلا ہیں۔ ان کو شہوتِ کلام کا مرض لاحق ہے۔ انھیں گالی دینے کی عادت

Marfat.com

پڑھکی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بازاری بچے آپس میں ماں بہن کی گالی دے کر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور یہ کافر، مشرک، بے دین، ملعون، خبیث اور شیطان وغیرہ ناموں سے اپنے دہکتے ہوئے سینے کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ نفسیاتی مریض ہیں اور حکمائے روحانی کا جُبّہ پہن کر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ کاش اس سے پہلے وہ کسی طبیب روحانی سے اپنا علاج کراتے تو پوری قوم خطرہ ایمانی سے بچ جاتی۔

مسلمان اور کفر

اسلام کا ایک دائرہ ہے جو کفر کے مقابلے میں اپنی ایک حد متعین کرتا ہے۔ اور اس دائرے کا پھاٹک کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے جو اس پھاٹک سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے وہ مسلمان ہے اور اُس وقت تک مسلمان رہے گا جب تک اپنے علم و ارادہ کے ساتھ اعتقاداً اس دائرے سے خود باہر نہ ہو جائے۔ باقی اس کے کسی قول و فعل پر کفر و شرک کا اطلاق اُس قول و فعل کی مماثلت کی وجہ سے ہوگا جس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے کافروں کے قول و فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور یہ اُس کے لیے گناہ ہے خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو مگر کفر یقینی نہیں ہے۔ جب تک وہ اپنے کفر و شرک کا اسی طرح اعتقاد و اقرار نہ کرے جیسا توحید و رسالت کا کیا تھا۔ یعنی جب تک وہ اپنی زبان اور دل سے یہ نہ کہے کہ "میں مسلمان نہیں ہوں، عیسائی، یہودی یا آتش پرست وغیرہ ہوں"! اُس وقت تک وہ دائرۂ اسلام سے ہرگز خارج نہ ہوگا۔ ایک مسلمان جس طرح گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کر کے مسلمان رہ سکتا ہے اسی طرح کسی فعل کفر و شرک کا، جو گناہِ کبیرہ ہے، بغیر اعتقاد کے، ارتکاب کر کے مسلمان رہ سکتا ہے۔ اور اس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون مسلمان ہے اور کافر۔ کیونکہ لوحِ محفوظ پر بھی اگرچہ ھٰذا اشَقِیٌّ وَھٰذَا سَعِیْدٌ لکھا ہوا ہے، لیکن ان کے ساتھ اِنْ شِئْتُ کی شرط ایسی ہے جس کا علم سوا خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

دو میں سے ایک کافر

ایسی صورت میں اگر دو مسلمان ایک دوسرے کو کافر کہیں تو ان دونوں میں سے یقیناً ایک اللہ تعالےٰ کے نزدیک فعلِ کفر کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ یا تو وہ شخص جو کافر کہا گیا۔ ورنہ وہ شخص جس نے کافر کہا۔ کسی کے کافر کہنے یا کفر کا فتویٰ عائد کرنے سے کوئی مسلمان خدا کے نزدیک کافر نہ ہو گا۔ پس ایسے فتوے اور دشنام طرازی شہواتِ کلام میں داخل ہو کر مہمل اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اور جس طرح گالی کا اثر ہوتا ہے اُسی طرح اس سے ایک انقباضی کیفیت اور کراہت کے ساتھ نفرت کا ظہور ہو گا جو نفاق و افتراق پیدا کرے گا۔

ایمان کی کمزوری

بد خلقی اور بد کلامی ایمان کی کمزوری ہے۔ اپنے ایمان کو کمزوری سے بچانے کے لیے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچوں، عزیز و اقارب، نوکر چاکر اور ہمسایوں سے خوش خلقی، شستگی اور پاکیزہ کلامی سے پیش آؤ۔ اس سے تمہارا ایمان کامل ہو گا۔ اور کمالِ ایمان کی وجہ سے تمہیں مغفرت و نجات حاصل ہو گی۔

حالتِ نزع میں اخلاق کا اثر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے حضرت عبداللہ رضؓ جب وہ بیماری میں آخرِ حیات تک پہنچے تو بعض صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کی۔ چونکہ مریض کی عیادت حضورؐ کی عادتِ جلیلہ تھی، آپؐ اُن کے یہاں تشریف لائے اور کلمۂ طیبہ تلقین فرمایا۔ لیکن باوجود کوشش کے کلمہ زبان پر جاری نہ ہو سکا۔ (کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ابو جہل کے دستِ کفر میں بے زبان کنکریاں رسولؐ کے حکم پر کلمۂ طیبہ پڑھنے لگیں، لیکن مسلمان صحابیٔ رسولؐ کے فرمانے پر بھی کلمہ نہ پڑھ سکے۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہو گی، جس نے توفیقِ الٰہی کو منقطع کر دیا ہو گا۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو بلا کر حالات پوچھے۔ معلوم ہوا کہ وہ نماز، روزہ، حج و جہاد و زکوٰۃ کے پابند اور مہمانوں کی پذیرائی میں اچھے میزبان تھے۔ پھر حضورؐ نے اُن کی بیوی سے کہا۔ "ہمارا مطلب ان تعریفات سے نہیں، تم ہمیں وہ بات

Marfat.com

بتاؤ جس نے ان کی زبان کو کلمۂ طیبہ سے روک دیا ہے۔" (حضورؐ مظہرِ کامل صفات پروردگار تھے، شانِ ستاری کے ماتحت خود کسی کے عیب کو ظاہر فرمانا نہ چاہتے تھے) ان کی بیوی نے عرض کیا۔" یا رسول اللہ! اِن کی ماں ان سے ناراض ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو"۔ حضورؐ نے حضرت علی اور ایک دوسرے صحابی کو ان کی والدہ کے پاس بھیجا اور فرمایا۔" اگر یہاں آنے سے اُن کو تکلیف ہو، تو میں خود اُن کے پاس آجاؤں، ورنہ وہ تمھارے ساتھ یہاں چلی آئیں"۔ ملاحظہ فرمائیے۔ حضورؐ نے وارنٹ جاری نہیں کیا۔ حکم نہیں دیا کہ ان کو پکڑ کر لے آؤ۔ بلکہ اس درجہ حسین اخلاق کے ساتھ اُن کو طلب فرمایا کہ جس سے انکار ممکن ہی نہ تھا۔ اور وہ مومنہ بھی ہماری آجکل کی عورتوں کی طرح نہیں تھیں کہ میں ہرگز اس لڑکے کا منھ نہ دیکھوں گی، کبھی وہاں نہ جاؤں گی بلکہ وہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی مومنہ تھیں۔ فرمانِ طلب آتے ہی سنتے ہی عرض کیا۔ میں اور میرے ماں باپ قربان ہو جائیں ایسے محسن و شفیق رسولؐ پر، وہ کیوں تکلیف کریں میں خود حاضر ہوتی ہوں"۔ اور اسی وقت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضورؐ نے پوچھا۔" یہ تمھارا کون ہے؟" کہا۔" یہ میرا لڑکا ہے"۔ فرمایا" یہ حالتِ نزع میں ہے، کیا تم نے اِسے معاف کر دیا اور اس سے راضی ہو؟" اُس نے کہا۔" یہ اپنی بیوی کی وجہ سے مجھ سے بدسلوکی کرتا تھا، میں اس سے ناراض ہوں، کبھی معاف نہ کروں گی"۔ حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا۔" آگ جلاؤ اور عبداللہ کو زندہ اس میں ڈال کر جلا دو۔ یہ دنیا کی آگ ابھی جل کر بجھ جائے گی۔ یہ دوزخ کی آگ سے بہرحال بہتر ہے۔ جس میں ہمیشہ جلنا ہے"۔ پھر ان کی ماں سے پوچھا۔" کیا تم اپنی آنکھ سے دیکھ سکو گی کہ تمھارا لڑکا آگ میں جلتا ہے"۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہا۔" یا رسول اللہ نہیں۔ ایک ماں اپنے لڑکے کو آگ میں جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی ــــ یا رسول اللہ، آپؐ میری شفاعت کا وعدہ فرمائیں، میں آپؐ کی وجہ سے اِسے معاف کرتی ہوں۔ اور اس سے راضی ہوں"۔ اب حضورؐ نے اُن کو کلمۂ طیبہ کی تلقین

Marfat.com

فرمائی۔ لوگوں نے سنا وہ پڑھ رہے تھے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور اسی کلمہ کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اولیائے کرام کے اخلاقی اقدار

چونکہ اولیائے کرام کی قوتِ ایمان برتر اور اس کا تحفظ بدرجۂ اتم ملحوظ ہوتا ہے اس لیے اُن کے اخلاق کا دوسروں سے افضل و اعلیٰ ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ ہر ولی کے اخلاقِ حسنہ پاکیزہ، ہمدردی خلائق اتم اور دلداری بنی نوعِ انسان انتہا درجہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے خلاف کہیں نظر آئے تو خواہ وہ ساری دنیا میں مشہور اور لاکھوں انسانوں کا مرجع ہی کیوں نہ ہو اُس کو ولی اللہ سمجھنا مناسب نہیں۔ کیونکہ ہر انسان کے باطن کا ظہور اُس کے کردار سے ہوتا ہے اور اُس کا صحیح مقام اعمال سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر سالکِ راہِ طریقت کے لیے ایمان کے بعد اخلاقی اقدار کو بلند سے بلند تر کرنا روحانی معراج و ترقی کے لیے لازمی ہے۔ اور ان کو نظر انداز کرنا جہل و بے خبری اور سوءِ ادب کا مترادف۔ کیونکہ یہ حالت محرومی اور بے فیضی پر منتج ہوتی ہیں۔

خلاصہ

غرض ہمارے کردار اور اخلاق کا اثر ہمارے خاتمہ پر اور خاتمہ کا اثر نجاتِ آخرت پر پڑتا ہے۔ آئیے، ہم سب ایک دوسرے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

اے اللہ! ہمارے اخلاق و کردار کو حسنہ بنا دے۔ دنیا عزت اور آخرت میں جوارِ رحمت عطا فرما! یا الٰہ العالمین یہ حلقۂ ذکر ہے۔ اس حلقہ کی برکت سے ہماری اور ہمارے اخلاق کی ہر جگہ حفاظت فرما!

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۱۸

حیوۃً طیبۃً

(ہر مہینے کے دوسرے اتوار کو خواتین اور اخواتِ مصطفائی تشریف لاتی ہیں اور دوسرے کمرے میں پردے کے ساتھ اُن کو معلومات و نصائح پیش کیے جاتے ہیں۔ آج "حیوۃً طیبۃً" کے عنوان سے اُن کو تعلیم دی گئی جو اخوان کیلیے بھی اتنی ہی مفید ہے جتنی اخوات کے لیے۔ اس لیے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَّلَنَجْزِیَنَّھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. مَردوں اور خواتین میں سے جو بھی عمل صالح کرے بشرطیکہ وہ مومن ہو پس ہم اُس کو ایک طیب اور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اُن کے کاموں کی بہتر سے بہتر جزا دیں گے۔

عملِ صالح بقیدِ ایمان بعض اشخاص یہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام تو اچھا ہی ہے خواہ کافر مشرک کرے یا مسلمان و مومن، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک کافر یا مشرک جس نے زندگی بھر عمل صالح اور نیک کام کیے اور کبھی اُس سے بُرائی سرزد نہیں ہوئی

Marfat.com

وہ جہنم میں جائے اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے۔ اور ایک مسلمان جس نے اس کے مقابلے میں نیک کام کم کیے اور نسبتاً گناہوں میں زیادہ مبتلا رہا وہ بخش دیا جائے یا بقدرِ گناہ دوزخ میں رہ کر ہمیشہ کے لیے جنت میں چلا جائے ___ وہ کہتے ہیں یہ بات عقل سے بعید ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف پر حرف آتا ہے ___ سبحان اللہ! وہ اسے عقل سے بعید کہتے اور سمجھتے ہیں ___ حالانکہ ان کی عقل نے ابھی قریب سے اس پر غور ہی نہیں کیا ہے۔

بے بنیاد محل

آئیے، اور عقل کو صحیح راستے سے قریب لاکر اس سوال کا جواب دیجیے کہ۔ "اگر دلدل پر سونے کی اینٹوں سے .... محل تعمیر کر دیا جائے تو وہ قائم رہے گا یا دلدل میں دھنستا چلا جائے گا ___؟ عقل اس کا کیا جواب دیتی ہے؟ یقیناً وہ محل قائم نہ رہے گا۔ اور اُس کا بنانا ہی بے کار ہو جائے گا ___ یا پتھریلی اور ریگ زار بنجر زمین میں آپ ہل چلائیں اور اُس میں نہایت عمدہ گیہوں بو دیں اور اُسے خوب پانی سے سینچتے رہیں تو کیا اپنی فصل پر وہ آپ کی کوٹھیوں کو غلّہ سے بھر دے گا ___؟ ہرگز نہیں!

مسلم و غدّار رعایا

(یا فرض کیجیے، ایک حکومت میں دو آدمی بستے ہیں ایک اُن میں اپنے حاکمِ اعلیٰ کو حاکم اور اُس کے ملکی قانون کو قانون سمجھتا ہے۔ لیکن بعض غلط ارتکاب کی وجہ سے قانونی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے ___ دوسرا اگرچہ کوئی غلط ارتکاب یا قانون شکنی نہیں کرتا، لیکن حاکمِ اعلیٰ کو حاکم اور اُس کے ملکی قانون کو قانون تسلیم نہیں کرتا۔ اور غدّاری کے جرم میں گرفتار ہو کر عدالت میں پیش کیا جاتا ہے ___ جج پہلے ملزم سے سوال کرتا ہے۔ "تم کون ہو؟ اور تم نے کیا کیا ہے کہ گرفتار ہو کر یہاں آئے ہو؟" وہ جواب دیتا ہے۔ "میں ایک شہری ہوں، لیکن شومیِ اعمال سے اِن اِن خطاؤں کا مرتکب ہوا ہوں۔ میرے اوپر رحم کیجیے، آیندہ میں ملکی قوانین کی خلاف ورزی نہ کروں گا" ___ اور جب دوسرے ملزم سے یہی

Marfat.com

سوال کرتا ہے، تو وہ کہتا ہے ۔" میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے ۔ میں اس شہر کی آبادی کو کھانا کھلاتا رہا ہوں ۔ میں نے مخلوق کو فیض پہنچانے کے لیے اِتنے پُل، اتنے تالاب وچاہ ، اتنے عبادت خانے، اتنے کلب اور اتنے مدرسے بنوائے ہیں ۔ میں نے آج تک کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ کسی کا مال غصب نہیں کیا ۔ لیکن آپ کے سپاہی صرف اس بات پر مجھے پکڑ لائے ہیں کہ میں اس مُلک کے حاکمِ اعلیٰ کو حاکم اور ملکی قوانین کو قابلِ تسلیم نہیں مانتا ۔ میں آزاد منش انسان ہوں اور اپنے خود ساختہ قانون پر چلتا ہوں، مجھے کسی کی اطاعت و فرمانبرداری پسند نہیں ہے چونکہ میں خوش خصلت اور نیک کردار انسان ہوں اس لیے عدالت کو مجھے آزاد کر دینا چاہئیے"۔ اب آپ اُس جج کی جگہ بیٹھ کر عقلِ قانونی سے کام لیجیے، ان دونوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کیجیے اور سزا تجویز فرمائیے ۔ کیا کہتی ہے عقل آپ کی ؟ کیا آپ پہلے ملزم کو معمولی قانون شکنی کی سزا میں پھانسی دے دیں گے ؟ ہرگز نہیں ! اس کی سزا صرف جرمانہ یا چند روزہ قید ہوگی۔ اور کچھ روز جیل خانے میں رہ کر آزاد ہو جائے گا ۔ اور دوسرا ملزم ؟ ۔ کیا اُسے ان تمام نیکیوں کے عوض خلعت و انعام و اعزاز دیا جائے گا ؟ ۔ ہرگز نہیں، بلکہ غداری کی سزا صرف قتل یا پھانسی ہے ۔ اگر عدالت پہلے مجرم کو رحم کی درخواست پر معاف کر دے اور دوسرے ملزم کو عمر قید یا دہکتی ہوئی بھٹی (جہنم) میں جھونک دے تو کیا جج کے عدل و انصاف پر حرف آسکے گا ؟ عقل سے پوچھیئے، وہ ہرگز اس کے جواب سے عاری نہ ہوگی ۔)

پختہ بنیاد حیاتِ انسانی کی بنیاد اسلام و تسلیم ہے ۔ اور اس بنیاد میں ایمان و یقین سے پختگی آتی ہے ۔ اور جب ایسی پختہ بنیاد پر عملِ صالح کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے تو قیامت کے ہولناک زلزلے بھی اُسے اپنی جگہ پر ہلا تک نہیں سکتے ۔ اس لیے عملِ صالح کو ایمان کی شرط سے مشروط کیا گیا ۔ پس اگر ایمان کے ساتھ عملِ صالح کیا جائے گا تو حیاتِ طیبہ حاصل ہوگی ۔

Marfat.com

اور بغیر ایمان کے جو کچھ کیا جائے گا بے نتیجہ ہو گا اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

اسلام کفر اور ایمان

اسلام کے معنی حقیقت و صداقت کو تسلیم کرنا ہیں۔ جو خدا کو اپنا مالکِ حقیقی اور اُس کے احکام کو صحیح اور سچا قانون تسلیم کرتا ہے وہ مسلمان ہے۔ اور کفر کے معنی حق و حقیقت سے مُنہ پھیرنے، ناشکری اور انکار کرنے کے ہیں یعنی خدا کو اپنا مالک و خالق تسلیم کرنے سے انکار کرنا، یا اُس کے احکام سے منہ پھیرنا کفر ہے۔ اور مومن وہ ہے جو خود امن و سلامتی کے ساتھ رہے اور دوسروں کو امن و سلامتی میں رکھے۔ فتنہ و فساد کا مٹانے والا ہو۔

کافر کا عملِ صالح

اب غور یہ کرنا ہے کہ کافر اور مشرک جو عملِ صالح کرتا ہے تو اس میں اس کی نیت کیا ہوتی ہے؟ یقیناً اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ کوئی عملِ صالح خدا کے لیے اور خدا کے حکم پر نہیں بلکہ اپنے نظریہ پر کرتا ہے۔ اور اُس کا یہ نظریہ یا تو کسی الٰہ باطل سے متعلق ہو گا یا اپنے نفس (دنیاوی شہرت اور نام و نمود) کے لیے۔ اگر الٰہ باطل سے متعلق ہے تو قطعاً رائگاں ہے۔ کیونکہ الٰہ باطل نہ دنیا میں کوئی اجر دے سکتے ہیں نہ آخرت میں۔ اور اگر دنیا میں شہرت اور نام نمود یا لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا گیا ہے۔ تو اس کا اجر اُسے دنیا میں مل جائے گا، لوگ اس کی تعریف کریں گے، تاریخ کے صفحات میں اس کا نام نیکی کے ساتھ درج کیا جائے گا، مگر دوسری دنیا میں اُسے حیاتِ طیبہ حاصل نہ ہو گی۔ مرنے کے بعد اس کی قبر پر پھول چڑھائے جائیں گے مگر قبر کے اندر اُس کی روح پر خدا کی رحمت نازل نہ ہو گی۔

مومن کا عملِ صالح

مومن کا عمل صالح وہ ہے جس کے نتیجے میں اُسے حیاتِ طیبہ (پاکیزہ زندگی) حاصل ہو۔ اور پاکیزہ زندگی اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام اور مرتبہ ایمان حاصل کرنے کے بعد عمل صالح کرے۔ ضرور اور بالضرور اُسے پاکیزہ زندگی

Marfat.com

حاصل ہوگی۔ کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

ولایت کا پہلا درجہ

یہی حیاتِ طیبہ حاصل ہونے کے بعد ایک مسلمان کو ولایت کا پہلا درجہ ملتا ہے۔ کوئی اللہ کا ولی ایسا نہیں ہے جس نے حیاتِ طیبہ حاصل کیے بغیر ولایت پائی ہو۔ یہ سنت اللہ اور خدائی اصول و قواعد ہیں۔ اور سنت اللہ کبھی نہیں بدلتی۔ اس حیاتِ طیبہ میں مردوں اور خواتین کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ جیسا کہ آیتِ مبارکہ میں صاف صاف ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مردوں کو خواتین پر کلّی فضیلت نہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں کو خواتین پر خواہ مخواہ فضیلت ہے۔ اور عورتیں بہرحال ناقص العقل اور مردوں کی لونڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ خیال قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور محض غلط اور بے بنیاد ہی نہیں، بلکہ ظلم و سفاکی کا وہ خاردار بیج ہے جس سے معاشرے میں بدامنیوں اور رسوائیوں کے بڑے بڑے خاردار درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مردوں کی فضیلت کو واضح طور پر سمجھایا جائے کہ اگر فضیلت ہے تو کیا ہے؟ کیوں ہے اور کتنی ہے؟ اور اس کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اناث کا کیا مرتبہ ہے؟

عورت اللہ کے نزدیک

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت جلال ہے اور ایک جمال۔ مردوں میں صفتِ جلال کا عنصر غالب ہے اور خواتین میں صفتِ جمال کا اور الفاظ حدیث اَللّٰهُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ (اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔) سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں پر زیادہ مہربان ہے اور انھیں زیادہ پسند کرتا ہے۔ کیونکہ جلال کے لیے اپنی پسندیدگی کا اس طرح اظہار نہیں فرمایا ہے۔

Marfat.com

مردوں کو صرف اُن کے اتقار و عمل کی وجہ سے دوست رکھتا ہے۔ اگر خواتین اتقار و عمل اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی دوہری محبت کی حقدار ہو جاتی ہیں ایک عمل کی وجہ سے اور دوسری جمال کی وجہ سے۔ ایسی صورت میں کسی مرد کا یہ خیال کرنا کہ وہ محض مرد ہونے کے اعتبار سے عورت پر افضلیت رکھتا ہے کوری جہالت اور احمقانہ تفاخر کی دلیل ہے۔

خواتین کو مردوں پر فضیلت

اور یہی نہیں کہ خواتین محض جمال کی وجہ سے مردوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔ بلکہ کچھ اور صفات بھی ہیں جن سے انکی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ جیسے صبر، قناعت، حلم، وفاداری، نرم دلی، اولاد کی محبت اور ایثار و قربانی وغیرہ وہ اعلیٰ صفات ہیں جن میں آج تک مرد اُن سے سبقت نہیں لے جا سکا ہے۔

خواتین نبیہ نہیں تو فرعونہ بھی نہیں

بعض لوگ مضحکہ انگیز طریقہ پر اپنی فضیلت کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ آج تک کوئی عورت نبیہ نہیں ہوئی اِس اعتبار سے مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ خواتین کے لیے نبوت کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے جتنا نبیوں کی ماں ہونے کا۔ وہ نبیہ ہوں یا نہ ہوں نبیوں کی پیدا کرنے والی تو ہیں۔ بچے سے ماں کا مرتبہ بلند ہے۔ جیسا کہ فرمایا اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ قَدُوْمِ اُمَّھَاتِکُمْ۔ (جنت تمھاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے) اس کے علاوہ ہم کہیں گے جس طرح کوئی خاتون نبیہ نہیں ہوئی اسی طرح فرعونہ بھی نہیں ہوئی کیا یہ اعتبار قابلِ تسلیم نہ ہوگا۔ پس اِن تمام توجیہات سے عورت کو مرد پر فضیلت حاصل ہے۔ اور جو شخص اِن اعتبارات سے عورت کی فضیلت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ خود کسی فضیلت کا حقدار نہ ہوگا۔

مردوں کو خواتین پر فضیلت

ہاں دو اعتبارات ایسے ہیں جن سے مردوں کو خواتین پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ ایک خواتین کی

Marfat.com

حفاظت و ایثار، دوسرے طاقت اور شدّتِ عمل۔ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو جمیل، نازک اور حسّاس بنایا ہے۔ اگر ان صفات کی حفاظت نہ کی جائے تو رفتہ رفتہ اپنی مخالف صفات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ان کا محافظ بنایا تاکہ وہ اس دولتِ خداداد کی ایسی حفاظت کریں کہ ان کی یہ صفات بدلنے نہ پائیں۔ اور اس حفاظت کے عوض عورتوں کے لیے لازم قرار دیا کہ وہ تسلیم و رضا کے ساتھ مردوں کی حفاظت میں آجائیں اور ان کا احترام کریں اور اپنی تمام فضیلتوں کے باوجود ان کی فرمانبرداری کریں اور یہی مرد کا حق ہے عورتوں پر۔

خواتین کی حفاظت

حُسن، نزاکت اور حسّاسیت کا دارومدار جنسی تخیل پر ہوتا ہے۔ اس لیے خواتین کے تخیل کی حفاظت مردوں کے لیے اولین فریضہ ہے۔ وہ تمام امورات جن سے تخیل کی صفائی اور پاکیزگی پر ادنیٰ اثر پڑ سکتا ہو وہ خواتین کے لیے بھی اسی طرح ممنوع ہیں جس طرح مردوں کے لیے۔ مردوں کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تخیل کے ساتھ خواتین کے تخیل کی محافظت کریں۔ اور اس بات پر غور کرتے رہیں کہ جو چیزیں تخیل پر اثر انداز ہونے والی ہیں وہ سامنے نہ آئیں۔ اور ان چیزوں کو اسلام نے صاف صاف نمایاں کر دیا ہے جن سے تخیلات پر اثر پڑ سکتا ہے ــــ اگر کوئی مرد اپنی محفوظ خواتین کے تخیلات کی حفاظت نہ کر سکا تو گویا اُس نے اپنی مردانگی کا فرض انجام نہ دیا۔ اور اُن کی خواتین حفاظت سے نکل جانے کی وجہ سے اپنے جمال، نزاکت اور حسّاسیت پر قائم نہ رہ سکیں گی اور اس کا ذمہ دار مرد ہو گا۔

خواتین کے فرائض

جس طرح اللہ تعالیٰ نے خواتین پر خاص اکرام فرمایا اور بعض باتوں میں اُنھیں مردوں پر فضیلت دی ہے اُسی طرح اُن پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ مردوں کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنی زندگی کا جزو لازم سمجھیں (اور یہ بات اُن کی فضیلت کے منافی نہیں ہے) جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں کسی کی شرکت

Marfat.com

پسند نہیں فرماتا۔ اسی طرح وہ اپنے شوہر کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ بنائیں۔ کیونکہ ان کا نفس اور جملہ صفات ان کے شوہر کے لیے مخصوص ہیں کہ نہ غیر انھیں دیکھ سکے، نہ غیر انھیں سُن سکے، نہ غیر اُنھیں سونگھ سکے، نہ غیر اُنھیں چکھ سکے، نہ غیر اُنھیں چھو سکے ــ شوہر کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے وہ مرتبہ دیا کہ اگر سجدہ روا ہوتا تو عورتیں اپنے شوہروں کو سجدہ کرتیں۔

خاندان میں مرد اور خاتون کی حیثیت یہ جو کچھ کہا گیا اپنے اپنے مرتبے کے اعتبار سے تھا۔ لیکن دنیاوی تنظیم کی حیثیت سے ایک خاندان میں مرد اور خاتون برابر کے حصّہ دار ہیں۔ مرد اپنی بیرونی عقلِ معاش، تدبیر اور تجربات کے لحاظ سے گھر کا امام ہے اور بالو مقتدی۔ یا گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں مرد بادشاہ ہے اور خاتون ملکہ ــ اور جیسا کہ فرمایا سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهَا۔ (قوم کا سردار اس کا خادم ہوتا ہے) ان کا فرض یہ ہے کہ دونوں مل کر گھر کے باقی افراد کی پوری خدمت انجام دیں۔ یہ اپنی خدمت کے اعتبار سے اپنے خاندان کی بزرگی حاصل کر سکتے ہیں ــ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ باعزت وباکرامت ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے خواہ مرد ہو یا عورت، اگر مرد بیوی سے زیادہ پرہیز گار ہے تو وہ اللہ کے نزدیک فضیلت رکھتا ہے۔ اور اگر بیگم مرد سے زیادہ پرہیز گار ہے تو وہ خدا کے نزدیک مرد سے افضل ہو گی۔

پاکیزہ زندگی پس اس آیت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نیکی بھلائی اور عملِ صالح کرنے والوں کو حیاتِ طیبہ (پاکیزہ زندگی) عطا فرماتا ہے۔ لیکن پاکیزہ زندگی کیا اور کیسی ہوتی ہے؟ پاکیزہ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں میل کچیل، بُرائیاں، خرابیاں اور ناپاکیاں نہ ہوں ــ انسانی زندگی میں یہ وہ ناپاکیاں ہیں جن سے اُلجھنیں، دشواریاں، فساد، افتراق اور کشمکش واقع ہوتی ہیں ــ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا واحد حل وافر دولت ہے۔ کیونکہ جب

Marfat.com

انسان کے پاس زر و مال ہوتا ہے تو اُس کی زندگی کی ساری گتھیاں سُلجھ جاتی ہیں۔ جیسا غنی نے کہا ہے۔

اے زر تو خدا نۂ ولیکن بخدا   ستّار عیوب و قاضی الحاجاتی

(یعنی اے دولت تو خدا تو نہیں ہے، لیکن قسم خدا کی تو عیبوں کو چھپانے والی اور حاجتوں کو پورا کرنے والی ہے۔) لیکن یہ مضمون صرف شاعری اور دولت کی یہ صفتیں محض دھوکا اور فریب ہے۔ دولت نہ ستارِ عیوب ہے نہ قاضی الحاجات۔ اگر یہاں کوئی شخص اپنے عیوب پر دولت کا پردہ ڈال کر لوگوں کا منھ بند کر دے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے عیوب چھپ گئے ہیں اب کوئی اُن کو نہیں دیکھتا، یا قیامت میں چھپے رہ جائیں گے۔ اسی طرح بہت سی حاجتیں ایسی ہیں جو دولت سے پوری نہیں ہوتیں، جب تک خدا پوری نہ کرے، مثلاً شفاءِ مریض، اولاد، اطمینانِ قلب اور قربِ خداوندی۔ غرض کوئی روحانی حاجت دولت سے پوری نہیں ہوتی۔ ہم دولت سے عمدہ لباس اور اچھی غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن روحانی مسرّت اور قلبی سکون آج تک کسی کو بھی، بلکہ قارون کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ دولت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُتنی ہی اُس کی ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ اور جس قدر ہوس زیادہ ہوتی ہے اُتنا ہی سکون، اطمینان، قناعت اور فراغت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح دولت زندگی کیلیے عذابِ جان ہو جاتی ہے۔ یہی میل کچیل زندگی کو ناپاک اور گندہ کر دیتے ہیں۔

پاکیزہ زندگی میں دولت کا حصّہ

اس سے یہ سمجھنا کہ دولت زندگی کے لیے صرف وبالِ جان ہے اور اسلام نے اس سے بچا کر صرف مسکنت اور محتاجی اور مفلسی کی تعلیم دی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے ہم کو زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے سے نہیں روکا ہے۔ بلکہ دولت سے میل کچیل اور اُن اثرات کو دُور کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس سے بڑی سے بڑی دولت کسی پاکیزہ زندگی کو نقصان نہیں

Marfat.com

نہیں پہنچا سکتی۔ اور ایک مسلمان مؤمن وصالح اور پاکیزہ زندگی کا حامل رہتے ہوئے بھی دولت مند اور امیر کبیر ہو سکتا ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان خود کو شریعت کے ہاتھوں میں دیدے اور دولت بڑھاتا چلا جائے، زندگی میں کوئی اُلجھن پیدا نہ ہوگی۔ جہاں شریعت کی خلاف ورزی کی گئی وہیں سے حیاتِ طیبہ میں ناپاکی شروع ہو جائے گی۔

شرعی امارت شریعت ہم کو دولت حاصل کرنے، دولت جمع کرنے اور دولت خرچ کرنے کے پورے پورے قواعد و اصول بتاتی ہے۔ اگر اِن قواعد و اصول کی پابندی کی جائے تو کوئی دولت حیاتِ طیبہ کے منافی نہ ہوگی۔ اور یہ اصول و قواعد تین قسم پر ہیں۔ ایک دولت کو پاک وصاف کر کے جمع کرنا۔ دوسرے دولت کی مضر خاصیتوں سے خود کو بچانا۔ تیسرے صرف شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں پر خرچ کرنا۔

دَولت کی پاکی وہ دولت جو جائز طریقہ پر حاصل کی گئی ہو، زکوٰۃ کے وقت حساب لگا کر خلوص نیت سے زکوٰۃ ادا کی گئی ہو۔ اور جن جن لوگوں کا اس دولت میں حق ہے، اُن کا حق ادا کیا گیا ہو۔ بس وہ دولت بالکل پاک وصاف اور حیاتِ طیبہ کے لیے معاون و مددگار ہوگی۔ اور اگر دولت کے حصول میں کوئی ناجائز طریقہ استعمال کیا گیا ہو، یا زکوٰۃ خمس، صدقات وخیرات وغیرہ ادا کرنے میں کور کسر رکھی گئی ہو، یا کسی کا حق نہ ادا کیا گیا ہو، تو وہ دولت پاک نہ ہوگی اور حیاتِ طیبہ کو باقی نہ رکھ سکے گی۔

دَولت کے مضر خواص دَولت کی یقینی خاصیتوں میں حرص، حسد، بغض وکینہ، عداوت، غرور وتکبر اور نام ونمود کی خواہش ہے۔ اگر جائز دَولت جمع کی جائے تو لازم ہے کہ اُس کی اِن بُری خاصیتوں سے اپنے کو بچایا جائے۔ اگر یہ خاصیتیں، جو رذائلِ اخلاقی ہیں، غالب آئیں تو حیاتِ طیبہ حاصل نہ ہوگی۔ اسلام نے

Marfat.com

بڑی سختی کے ساتھ ان رذائل سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ اگر ان خواص رذیلہ سے نہ بچ سکے تو لازم ہے کہ وہ دولت کو خدا کے نام پر لٹا کر مسکین ہو جائے۔ نہ دولت رہے گی اور نہ اُس کے بُرے نتیجے حاصل ہوں گے۔ اور اگر ان خواص پر غالب آجائے تو پھر دولت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے جس قدر دولت جمع کرسکتا ہے، کرے۔ آزاد و مختار ہے۔

خرچ کے مواقع

جو دولت انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس میں ایک حصّہ خدا کا، ایک حصّہ بندگانِ خدا کا (جس میں اہل و عیال و اقربا اور قومی فوائدِ عامہ شامل ہیں) اور ایک حصّہ خود اپنے نفس کا ہے۔ اور یہ مضمون اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ سمجھایا جاچکا ہے ــــ اس طرح اگر کوئی شخص جائز دولت کو پاک و مطہر کرکے جمع کرتا ہے اور قانونِ شریعت کے مطابق خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کا امین، پسندیدہ اور مقبول بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے حیاتِ طیبہ عطا فرمائے گا اور یہ دُنیا اُس کے لیے نمونۂ جنت ہو جائے گی۔

پاکیزہ زندگی کی علامات

عملِ صالح کا نتیجہ احسان ہے اور احسان کا نتیجہ معیتِ خداوندی۔ جب اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے تو بندہ اللہ تعالےٰ کی مرضی پر قائم و راضی ہو جاتا ہے ــــ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ جب بندے کی مرضی اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو گئی تو دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے بندہ اپنی ہی مرضی کے مطابق دیکھتا ہے۔ اور جب ہر ایک کام اچھا بُرا سب اُسی کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے تو وہ کسی کام سے کبیدہ و رنجیدۂ خاطر نہیں ہوتا۔ بلکہ بلاؤں اور مصیبتوں کو بھی گویا اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی کامیابی تصوّر کرتا ہے۔ اور ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ یہی پاکیزہ زندگی کی علامت ہے۔ اُسے دُنیا کے ہر فعل میں، خواہ دوست سے ہو یا دشمن سے، خاص لطف اور مزا آتا ہے۔ ہر کام میں سُرور و مزا حاصل کرنا، مخلوقِ خدا کے ساتھ بے لوث اور للّٰہی محبت، سکون

Marfat.com

واطمینان، خوش باشی، فرحت نوازی، ذکرِ الٰہی میں ذوق، قناعت میں عزت وغیرہ پاکیزہ زندگی کی علامات ہیں۔

معیّتِ خداوندی

پاکیزہ زندگی کی سب سے بڑی علامت دُنیا میں معیّتِ خداوندی ہے بندہ ہمہ اوقات اللہ تعالیٰ کی معیت کو محسوس کرتا ہے۔ اور کسی وقت حضور سے غیاب میں نہیں آتا ہے ۔ ہجرت کے موقع پر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم غارِ ثور میں حضرت ابو بکر صدّیقؓ کے زانو پر سرِ مبارک رکھے آرام فرما تھے کہ کفّارِ مکّہ کے جاسوس غار کے دہانے پر آئے۔ حضرت صدّیقؓ نے اُن کو اس درجہ قریب محسوس کر کے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ دشمن یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اگر وہ جھک کر غار میں نظر ڈالیں تو ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ (حضرت صدیقؓ کو اپنی جان کا نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق خوف لاحق تھا کہ کہیں دشمن آپؐ کو گزند نہ پہنچائیں۔) جناب نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ (خوف اور رنج نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے) یہ الفاظ سننے سے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو وہ معیّت، سکینت اور اطمینانِ قلبی حاصل ہوگیا جو پہلے حاصل نہ تھا۔ دشمن اشتباہ میں مبتلا ہوگئے۔ مکڑی کا جالا اور فاختہ کے انڈوں کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ اس غار میں اِس رات کوئی شخص داخل نہیں ہوا ہے، ورنہ جالا ٹوٹ جاتا اور فاختہ اُڑ جاتی ۔ بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی معیّت وحفاظت میں لے لیتا ہے تو کوئی بھی اُسے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ خدا جس شخص کو یا جس چیز کو ظاہر کرنا چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے اور جسے چھپانا چاہتا ہے حکمت سے چھپا لیتا ہے۔ (آج یہ نئی نئی سائنسی ایجادات جو ظاہر ہو رہی ہیں اس سے پیشتر موجود تھیں، مگر یہ تقاضائے حکمتِ الٰہی پوشیدہ رہیں۔ اور اب وہ چاہتا ہے تو ظاہر ہوتی جا رہی ہیں۔) غرض معیتِ خداوندی جس دل میں آجائے اُسے سکینت حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب وہ بلا سے

Marfat.com

خوف نہ کھائے اور عطا سے سیر چشم رہے۔ سمجھ لو اُسے حیاتِ طیبہ حاصل ہے۔

حیاتِ طیبہ کی اُخروی خصوصیات

آپ نے دُنیاوی حیاتِ طیبہ کا اندازہ کیا جو عملِ صالح کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے۔ یہ زندگی یہاں ختم ہونے والی نہیں، بلکہ آخرت میں مزید ترقی کے ساتھ عطا کی جائے گی، جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ حَیٰوۃٌ بِلَا مَوْتٍ، وَغِنَاءٌ بِلَا فَقْرٍ، وَصِحَّۃٌ بِلَا سُقْمٍ، وَمُلْکٌ بِلَا ھَلَاکٍ، وَسَعَادَۃٌ بِلَا شَقَاوَۃٍ (یہ زندگی وہ زندگی ہے جس کو موت نہیں، اس کا غنا وہ ہے جس میں فقر نہیں، اس کی صحت وہ ہے جس میں کوئی بیماری نہیں۔ اس کی سلطنت وہ ہے جس کو کبھی زوال نہیں، اس کی سعادت وہ ہے جس میں شقاوت کی گنجایش نہیں) یہ اُس زندگی کے خصوصیات ہیں۔

دنیا میں جنّت

اگر آپ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کریں اور اس سے بھی بلند تر مقام حاصل کرنے کا ارادہ ہو تو چاہیئے کہ آپ کی فیض رسانی سورج کی کرنوں کی طرح ہر رطب و یابس کے لیے عام ہو جائے اور اس طرح کہ جو سامنے آئے منوّر و تاباں ہو جائے، آپ کی تواضع زمین کی طرح دوست اور دشمن سب کے لیے یکساں راحت رساں بن جائے۔ اس طرح کہ جو آپ کو آزار پہنچائے آپ سے اُس کو آرام ملے۔ آپ کی سخاوت سمندر کے ابرِ کرم کی طرح ہو کہ جو آپ کے سایے میں آئے آپ کے الطاف و کرم سے مالا مال ہو کر واپس جائے۔ اگر آپ کی زندگی اِن خصوصیات کی حامل ہو جائے تو دنیا آپ کے لیے جنّت ہے، بلکہ آپ بذاتِ خود جنت کا نمونہ ہیں۔

دوسروں سے تقابل

آپ دوسروں سے اپنا تقابل نہ کریں کہ لوگ ایسا نہیں کرتے آپ کیوں کریں؟ دوسروں کا کام دوسروں پر چھوڑیئے۔ وہ عوام میں ہیں، آپ خواص میں شامل ہو جائیے۔ دوسرے اپنا کام کرتے ہیں آپ اپنا کام کیجیے۔

Marfat.com

اگر آپ نے اپنی جگہ حیاتِ طیّبہ حاصل کر لی تو دوسروں کے لیے مثال ہو گی، وہ بھی آپ کی تقلید کریں گے اور معاشرہ سدھر جائے گا۔ یہی زندگی شہادت ہے۔ کیونکہ جس زندگی کو موت نہ ہو وہ شہادت ہو جاتی ہے۔ صرف مقتول ہی شہید نہیں ہوتے بلکہ جو بھی حیاتِ طیّبہ حاصل کر لے وہ شہید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو موت نہیں ہوتی۔ اور حیاتِ طیبہ اسی زندگی میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ وہ کلمات ہیں کہ اگر آپ ان کی حفاظت کریں تو نصیحت و تعلیم کے لیے کافی ہیں۔

در خانہ اگر کس است   یک حرف۔۔۔ بس است

اللہ تعالیٰ جملہ مسلمانان اور بنی نوعِ انسان کو حیاتِ طیبہ حاصل کرنے کی توفیقِ جزیل عطا فرمائے!

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۱۹

رُوحانی بیماری اور علاج

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

اموراتِ طبعی و نفسانی آپ صاحبان دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ شرِ نفس سے بچا۔! دعا کے ساتھ ضروری ہے کہ آپ خود بھی اس کی کوشش کریں جس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اگر آپ صرف دعا کریں اور خود کوشش نہ کریں، ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں تو توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوگی اور کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اس کیلیے لازم ہے کہ آپ امورات کو پہچانیں اور تمیز کر سکیں کہ اموراتِ طبعی کیا ہیں اور اموراتِ نفسانی کسے کہتے ہیں۔ تاکہ اموراتِ طبعی کو ردّ نہ کریں، اور نفسانی امورات کو غالب نہ ہونے دیں۔ اگر اموراتِ طبعی کو نفسانی سمجھ کر ترک کیا جائے یا اموراتِ نفسانی کو طبعی سمجھ کر اختیار کیا جائے تو برعکس نتیجہ برآمد ہوگا۔ اور کامیابی حاصل نہ ہو گی۔

اموراتِ طبعی وہ تمام امورات جو صحتِ حاصلہ کی بقا اور صحتِ زائلہ کے استرداد (واپسی) کے لیے ضروری ہیں وہ اموراتِ طبعی ہیں۔ صحتِ حاصلہ کی بقا کے لیے حوائجِ ضروریہ اور عبادات ہیں۔ اور صحتِ زائلہ کے استرداد کے لیے پرہیز اور

Marfat.com

معالجات۔ اور ان تمام اُمورات کو اپنے اپنے وقت، اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے اعتدال کے ساتھ اختیار کرنا اور انجام دینا ضروری ہے۔ اور جب تک ان چیزوں سے واقف نہ ہو نہ اختیار کر سکتا ہے اور نہ انجام دے سکتا ہے۔

امورات نفسانی یہ وہ تمام امورات ہیں جن کی بنیاد صرف حظ و لذّت یا دفع ناملائمات پر ہوتی ہے۔ اور وہ ضروریات میں سے نہیں ہوتے۔ یعنی اگر ان امورات کو ترک کر دیا جائے تو علمی اطلاعات، بقائے شخصی یا بقائے نوعی یا صحّت حاصلہ پر کوئی بُرا اثر واقع نہ ہو بلکہ اس کے اختیار کرنے سے نقصان کا احتمال ہو۔ کیونکہ وہ تمام امورات جو محض احتظاظ والتذاذ کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں، اور اُن میں کوئی مفید پہلو نہیں ہوتا وہ نقصان دہ اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ ان کو نفس کی شرارت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (خصوصاً جب کہ خلافِ قانونِ الٰہی ہوں، خواہ وہ انفرادی عادات ہوں یا اجتماعی رسم و رواج)

غذا مثلاً غذا کرنا، یہ ایک امر طبعی اور لازم حیات ہے۔ اور جب تک جسمانیت میں مادّیت باقی ہے بغیر اس کے چارہ نہیں۔ اسی لیے اپنے وقت پر بھوک اور پیاس کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ خواہش امر طبعی ہے۔ اگر ہم اس کو اعتدال کے ساتھ پورا نہ کریں گے تو صحت و طاقت کو بحال نہ رکھ سکیں گے۔ لیکن اگر اسی طبعی خواہش میں نفس بھی شامل ہو جائے اور غذا میں حظ و لذّت تلاش کرنے لگے۔ شیرینی، حلوا اور مرغن غذاؤں کی خواہش اعتدال سے بڑھ جائے تو یہ نفسانی خواہش ہو گی، جو طبیعت کے لیے غیر ضروری اور نقصان دہ ہو گی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شیرینی حلوے اور مرغّن غذاؤں کو اپنے لیے حرام کر لیا جائے۔ نہیں، بلکہ جب دیکھے کہ طبعی خواہش میں سادہ غذاؤں کی وجہ سے

Marfat.com

کمی واقع ہو رہی ہے تو خواہش کو بحال کرنے کے لیے یہ لذیذ غذائیں بحدّ اعتدال استعمال کرنا ضروری علاج میں شامل ہو گا۔ اسی لیے اسلام میں کبھی کبھی ایک دوسرے کی دعوت کے بہانے ایسی غذاؤں کا انتظام احسن سمجھا گیا ہے لیکن ایسی غذاؤں کو روزانہ کے معمول میں شامل کرنا اور ہر وقت لذیذ اور عمدہ غذاؤں کی دُھن میں رہنا بے کار، بے سود بلکہ جسمانی صحت کے ساتھ روحانی تندرستی کے لیے بھی مضر ہے۔ (ہاں، اگر کسی کا مزاج ساز گار ہو اور نفس قیدِ امارگی سے نکل چکا ہو تو معمولاً بھی ان کا استعمال مضر نہ ہو گا جیسا کہ مقدس ہستیاں بہ تقاضائے طبیعت خوشبو، سرد پانی، لذیذ غذا، خوش طبعی و مزاح اور دیگر مالوفاتِ بشری کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ ان کے نفس کو اپنے نفس کی طرح جان کر گرفت کرنا یا حرف لانا حق شناسی سے بعید ہے۔

شریعت کی کسوٹی

شریعت ہمارے امورات پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔ شریعت نے جو کچھ مباح، جائز اور احسن بتا دیا ہے اُن کو اپنے اوپر حرام کرنا شریعت پر اپنا اختیار جمانا ہے۔ ہمیں، جو جائز ہے اور جس حد تک جائز ہے اُسے جائز رکھنا ضروری ہے۔ اور اس شریعت کا کامل نمونہ ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے واضح طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم شریعتِ غرّائے محمدؐی کا پاس و لحاظ رکھیں تو ہمارے لیے کافی ہے۔ یعنی تمام اموراتِ طبعی بشری کو شریعت کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ جائز ہو تو اعتدال کے ساتھ کام میں لائیں۔ ورنہ ترک کر دیں۔

حفاظت از شرِ نفس

شرِ نفس سے بچنے کی آسان صورت یہ ہے کہ حرام، ناجائز و مشتبہات سے اور ان چیزوں سے جو کسی فرض، واجب یا سنت سے ٹکر کھائے یا غفلت و نافرمانی کی طرف لے جائے اُسے فوراً ترک کر دیں۔ کیونکہ یہ خواہشات یقیناً شرارتِ نفس اور التباسِ شیطانی ہوتی ہیں۔ باقی وہ تمام چیزیں جو مباح اور جائز ہیں

Marfat.com

اور وہ کسی طرح ہمارے لیے مفید ہوں تو فائدے کی نیت سے ضرور استعمال کریں خواہ اس میں وقتی حظ و لذت بھی ہو۔ کیونکہ اس کی لذت بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اُسے نعمت سمجھ کر اور خدا کا نام لے کر کام میں لائیں اور شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کیا کیا نعمتیں پیدا کی ہیں۔ اس طرح ہم انھیں استعمال کر کے انبساطِ طبیعت کے ساتھ ساتھ خدا کی نعمتوں کی قدر بھی کرتے ہیں، اور یہ عبادت میں داخل ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس میں اسراف کو دخل نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ کسی جائز چیز کا استعمال حدِ اعتدال میں ممنوع نہیں ہے۔

نعمائے الٰہی میں دوسروں کی شرکت

اللہ تعالیٰ کی جملہ نعمتیں عام ہیں اور ہر بندے کا حق ہے کہ انھیں حاصل کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی نعمت کے حصول کی توفیق دی ہے تو آپ تنہا اُس سے لطف اندوز نہ ہوں، بلکہ اپنے ساتھ کسی بندے کو بھی شامل کر لیں۔ یا سائل و محتاج کو بھی حصہ پہنچا دیں تو اللہ تعالیٰ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور نعمت زیادہ کرتا ہے۔

غذائے جسمانی و رُوحانی

جس طرح ہمارا جسم اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہماری روح (یعنی باطن) بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے اور اسے بھی غذا کی ضرورت ہے۔ ظاہری جسم کے لیے ظاہری غذا کی اور باطن روح کے لیے باطنی اور روحانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسم کو ظاہری غذا نہ ملے تو جسم کمزور ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر روح کو باطنی (یعنی نوری) غذا نہ ملے تو روح کمزور ہو جاتی ہے۔ جسم کی غذا عمدہ لذیذ مرغن اور مقوی غذائیں ہیں، جن میں پورے حیاتین موجود ہوں۔ اور رُوح کی غذا ذکر، عبادات، تلاوت، حسنِ خلق، نیکیاں اور خدمتِ خلق ہے، جو خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اِن چیزوں کی نورانیت سے روح کو

Marfat.com

آسایش اور تقویت پہنچتی ہے۔ اگر ان چیزوں سے دُور رہیں تو روح مضمحل اور کمزور، اور نفس قوی ہو جاتا ہے۔ جس طرح ظاہری غذا کو خاص طریقوں سے بنایا اور حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح اذکار اور عبادات وغیرہ کو بھی خاص طریقوں اور خاص لوگوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جس طرح ظاہری غذا بے تجربہ لوگوں سے ناقص ملتی ہے، اسی طرح باطنی غذا بھی اگر ناقص لوگوں سے حاصل کی جائے تو ناقص ہوگی اور رُوح کو پوری تقویت نہ پہنچا سکے گی جب ذکر و اذکار کے طریقے کامل لوگوں سے حاصل کیے جاتے ہیں، تو ان میں روح کے لیے اتنی غذائی طاقت ہوتی ہے کہ فوراً روح ترقی کرنے لگتی ہے۔ اور اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کا عملی تجربہ کیا ہے۔

ظاہری اور باطنی غذا کے اوقات

جس طرح ظاہری غذا میں بعض وقتی اور بعض ہمہ وقتی ہوتی ہیں. جیسے کھانا تین یا چار وقت اور سانس لینا ہمہ وقت ہوتا ہے، اسی طرح روحانی غذا بھی بعض موقّتی اور بعض غیر موقّتی ہوتی ہے۔ روح کی موقّتی غذاؤں میں پنج وقتی نماز، سال میں ایک مہینہ کا روزہ، بشرط استطاعت عمر میں ایک مرتبہ حج، اور سال پورا ہونے پر زکوٰۃ، موقّتی روحانی غذائیں ہیں، جن سے رُوح کو صحت طاقت اور فرحت و ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہمہ وقتی غذاؤں میں پاک اعتقاد پر قائم رہنا اور پیر کے بتائے ہوئے اذکار ہیں۔ (یاد رہے کہ پیر کوئی ذکر ایسا نہیں بتاتا جو پہلے سے سنا، یا کتابوں میں پڑھا نہ ہو، لیکن پیر کے بتائے ہوئے اسم اور طریقِ عمل میں زیادہ نورانیت حاصل ہوتی ہے۔ اور کتابوں سے یا ناقص لوگوں سے لینے میں نورانیت حاصل نہیں ہوتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ ـ اس کی یہ وجہ ہے کہ مثلاً اسم "اللہ" کی کامل نورانیت تو اسم "اللہ" میں موجود ہوتی ہے۔ مگر ہماری روحانی استعداد اس لائق نہیں ہوتی کہ اسم "اللہ"

Marfat.com

کی مطلق نورانیت سے پوری غذائیت حاصل کر سکیں۔ لیکن جب پیر اسم "اللہ" کا ذکر بتاتا ہے تو اُس میں خود پیر کا وہ نور شامل ہو جاتا ہے جو اُس نے اپنے پیر سے، اور پیروں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر کے ریاضت و محنت کر کے استشعاع کے قابل بنا لیا ہے۔ اور چونکہ وہ نور ہماری استعدادِ روحانی سے قریب تر ہوتا ہے اس لیے ہماری روح اس سے پوری پوری غذائیت حاصل کرتی ہے۔) اگر یہ روحانی غذائیں حاصل نہ ہوں تو کوئی انسانی روح صحت مند اور خوش باش نہیں رہ سکتی۔ بیمار ہو جاتی ہے۔ اُس کا باطنی اور رُوحانی اندازِ حیات بدل جاتا ہے، اُس کا طرزِ تفکر صحیح نہیں رہتا اور وہ نعمائے روحانی کے قابل نہیں رہ جاتی۔ اگر اسی زندگی میں کسی طبیب روحانی سے اُس کا علاج نہ کرایا گیا تو یہی روحانی بیماریاں عذاب بن جاتی ہیں۔

رُوح کی بیماریاں

جب انسان بیمار ہو جاتا ہے تو اُس کا منہ ایسا بدمزہ ہو جاتا ہے کہ لذیذ سے لذیذ اور عمدہ سے عمدہ غذا بھی اُسے اچھی نہیں لگتی۔ اور وہ ان مزیدار غذاؤں سے منہ پھیر[illegible] ہے۔ اسی طرح جب انسان کی رُوح بیمار ہو جاتی ہے تو اُسے روحانی اور نورانی غذائیں (نماز، روزہ، ذکر، مراقبہ اور تفکر وغیرہ) اچھی نہیں لگتیں۔ اگر ان چیزوں سے روح کو لذت اور مزا حاصل نہ ہو اور انسان ان روحانی کاموں کی طرف رجوع نہ ہو سکے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ رُوح بیمار ہے اور اُس کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے۔ جس طرح ایک جسمانی صحت مند انسان کھانا نہیں چھوڑ سکتا، بلکہ وقت پر کھانے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی صحت مند انسان کسی حالت میں نماز روزہ اور نیکی کے کاموں سے نہیں رُک سکتا۔ رُوح اپنی غذا کے لیے اس درجہ بیتاب ہو جاتی ہے کہ انسان بغیر اسے پورا کیے باز نہیں رہتا۔ پس یہ جاننے کے لیے کہ روح بیمار ہے یا تندرست، یہی سب سے بڑی علامت ہے کہ

Marfat.com

اگر انسان کو روحانی کاموں میں لذّت اور مزا حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے اپنے وقت پر یا معمولاً ادا کرتا ہے تو اس کی رُوح تندرست ہے۔ اور اگر اس کی روح ان نیک کاموں سے اکتاتی اور بھاگتی ہے تو یقیناً بیمار ہے۔

رُوحانی علاج

اب یہ تشخیص کرنا کہ روح کو کون سی بیماری لاحق ہے اور اس کا کیا علاج ہوگا ہمارا کام نہیں، بلکہ روحانی طبیب کا کام ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی روحانی 'طبیبِ حاذق' کو تلاش کریں' جو روحانی بیماریوں کے علاج کا ماہر ہو۔ پھر خود کو اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ سیاہ کرے یا سفید۔ اور اُس کے بتائے ہوئے علاج اور پرہیز پہ ایماندارانہ طریقہ سے عمل کریں۔ رُوح ان بیماریوں سے شفایاب ہو جائے گی۔ اُسے رُوحانی غذاؤں میں ذوق ولذّت اور مزا آنے لگے گا۔ اور جیسے جیسے روحانی غذا بڑھتی جائے گی رُوح تندرست اور طاقت وَر ہو جائے گی اور روحانی کاموں کی انجام دہی کی طرف متوجہ ہو گی۔

رُوحانی طبیب

اوّلاً کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ روحانیّات کا طبیبِ حاذق کون ہے اور کس کو اس علاج میں کامل دست رس حاصل ہے۔ کیونکہ یہ روحانی قابلیّات اور شفا بخشی کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس جاننے اور معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اُس کے ظاہر حال پر نظر ڈالیں کہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور اُس کی موجودگی میں طالب کا دل نرم، ذاکر اور روح متاثر ہوتی ہے یا نہیں؟ پھر اُس کے زیرِ علاج مریضوں (مریدوں) کا بغور مطالعہ کریں، اُن کے حالات دریافت کریں اور دیکھیں کہ اُن میں اکثریّت شفا پانے والوں کی ہے یا نہیں؟ یعنی جتنے لوگ اپنی روحانی بیماریوں کا علاج کرانے اس کی خدمت میں آئے ان میں زیادہ لوگوں کو شفا ہوئی یا نہیں؟ اور جن لوگوں کو

Marfat.com

شفا حاصل نہیں ہوئی اس میں ان مریضوں کی کوتاہی کو دخل ہے یا طبیب روحانی کی نا اہلیت کو ۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے ۔ اور اس کی بھی اس زمانے میں ضرورت پیش آگئی ہے، جس میں نا اہل لوگوں نے طبیب روحانی کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ پہلے زمانے میں لوگ آنکھ بند کر کے آتے اور غلامی میں نام لکھا کر روحانی شفا حاصل کرتے اور معراجِ کمال کو پہنچ جاتے تھے۔

پیر کا کام، ہمارا کام اور خدا کا کام

بعض روحانی مریض، طبیب حاذق کی خدمت میں آتے ہی، اور بیعت میں داخل ہوتے ہی یہ امید کرتے ہیں کہ بس ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب جو کچھ کرنا ہے وہ پیر خود ہی کرے گا۔ یہ نفس یا شیطان کا بہت بڑا مکر و فریب ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ بس بیعت کی اور ولایت کا مرتبہ مل گیا۔ یا جنتی ہو گئے ۔ بیعت کے بعد یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ پیر کا کیا کام ہے؟ ہمارا کیا کام ہے؟ اور خدا کا کیا کام ہے؟ یاد رہے اگر ہم اپنا کام کریں گے تو پیر اپنا کام کرے گا۔ پیر اپنا کام کرے گا و ... تعالیٰ بھی اپنے وعدے کے موافق اپنا کام کرے گا۔ اور ہمارے اوپر فضل و کرم فرمائے گا ۔ پس پیر کا یہ کام ہے کہ وہ مرید کی روحانی تشخیص فرمانے کے بعد اُس کو علاج کا صحیح، سیدھا اور یقینی راستہ، محبت شفقت اور عنایت کے ساتھ بتلا دے اور مرید کو اُس پر چلا دے۔ اس کے بعد مرید کا کام ہے کہ جو کچھ پیر نے تعلیم و ہدایت فرمائی ہے اُسے اچھی طرح سمجھ کر عمل میں لائے اور اُس میں اپنی رائے کو مطلق دخل نہ دے۔ حتی الوسع پیر کی صحبت و مجلس میں رہ کر اُس کے ارشادات سے روحانی غذا حاصل کرتا رہے۔ اگر یہ دونوں کام صحیح طور پر انجام دیے گئے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے قرب کی طرف ہدایت فرمائے گا۔ اور جذب خاص سے اپنی بارگاہ میں کھینچ لے گا۔

Marfat.com

پیر کی تعلیم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پیر کی تعلیم وہدایت مرید کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور وہ اُسے اپنے خلاف سمجھ کر بدظن ہوتا یا عمل میں کوتاہی کرتا ہے۔ یہ اُس کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، ہمارے ہاتھ پاؤں میں، یا کسی جگہ زہر باد یا سرطان ہو اور ڈاکٹر اچھی طرح تشخیص کرنے کے بعد مشورہ دے کہ ہاتھ یا پاؤں کٹوا دو۔ تو اس وقت ہم کیا کریں گے؟ یقیناً ہمیں ہاتھ پاؤں کٹوانے کے لیے فوراً تیار ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ایک عضو علیحدہ کر کے ہم اپنی جان بچا لیں گے۔ اور اگر ہم نے اُس ایک عضو کی محبت میں ڈاکٹر کے حکم پر عمل نہ کیا تو یقیناً مر جائیں گے۔ پس ایک عضو کٹوا دینا اچھا ہے یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا۔ کوئی عقل مند انسان ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کو تیار نہ ہو گا۔ اسی طرح پیر بھی کبھی ایسی محنت ومشقت کا حکم فرماتا ہے جو نفس پر گراں گزرتی ہے۔ کبھی ترکِ وطن، اعزا کی جُدائی اخراجِ دولت یا ترکِ انزوا اور سماجی خدمات کا حکم فرماتا ہے۔ تو اس مرید کے لیے یہی صحیح علاج ہوتا ہے۔ اگر مرید نے پیر کے حکم کی کما حقہٗ فرمانبرداری نہ کی تو اُس کی روح کو ہرگز شفا حاصل نہ ہو گی۔ پیر جو اپنے مرید کے لیے ظلّ اللہ، جانشینِ رسولؐ اور تربیت میں ماں باپ سے بڑھ کر مہربان اور شفیق ہوتا ہے۔ بلا وجہ اپنے مرید کو محنت ومشقت یا نقصان و تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اسی میں مرید کی بھلائی اور اُس کی بیمار رُوح کی شفا ہے، وہ اپنی محبت وشفقت کو بالائے طاق رکھ کر، اور اپنے دل کو سخت کر کے مرید پر بوجھ ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اُسے شفا حاصل ہو جائے گی۔ آپ نہیں دیکھتے کہ جب کوئی ضدّی بچّہ، بیماری میں، دوا پینے کے لیے تیّار نہیں ہوتا تو ماں باپ زبردستی اُس کا منھ چیر کر دوا پلا دیتے ہیں ـــ؟ ـــ کیا انھیں اپنے بچّے سے دشمنی ہوتی ہے؟ نہیں، اُن کی یہ سختی و درشتی ہی اُن کی حد درجہ محبّت کی علامت ہے۔

Marfat.com

پس مرید کو چاہیئے کہ پیر کی سختی، تاکید اور فرمان روائی میں اُس کی اُس محبت کا اندازہ کرے جس سے مجبور کر اُسے سختی کرنی پڑی۔ دراصل اُس نے خود سختی کرنے میں بڑی تکلیف اُٹھائی ہے۔ اُسے کیا غرض تھی کہ اُس نے تمھارے لیے اپنا دل سخت کیا ـــــ کیا تم اِسے نہیں سمجھ سکتے؟

پیر کی شفقت و محبت

اگر تم اندازہ کرنا چاہتے ہو کہ پیر کے دل میں تمھاری کس درجہ شفقت وعنایت و محبّت ہے تو غور سے دیکھو ہر سختی کے بعد اُس کی محبت اور توجہ دو گنی چوگنی بڑھ جائے گی۔ جس قدر تم پیر کی فرمانبرداری میں محنت اور تکلیف اٹھاؤ گے وہ اُس سے زیادہ تمھارے آرام اور آسایش کی فکر کرے گا۔ جتنا تم نقصان اُٹھاؤ گے اس سے زیادہ تمھارے فائدے کی کوشش کرے گا۔ اگر کوئی پیر ایسا نہیں ہے تو وہ ہرگز روحانی طبیب کہے جانے کا مستحق نہیں۔ اور نہ دین و دنیا میں اُس سے کسی فائدے کی امید کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ

اگر تمھیں ذکر اذکار، عبادات و ریاضات اور نیک کاموں کی طرف رغبت نہیں ہے ان میں تم کو کوئی لطف، ذوق اور مزا نہیں آتا تو سمجھ لو کہ تمھاری روح بیمار ہے۔ تم فوراً اس کے علاج کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور کسی روحانی طبیب حاذق کے دستِ بیعت میں اس طرح خود کو سپرد کر دو جس طرح شیر خوار بچہ اپنی ماں کی گود میں ہوتا ہے۔ اگر تم نے اتنا کیا تو تم اس کے نتائج خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے ہمارے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ بنی نوع انسان کو عموماً اور مسلمانانِ عہدِ حاضرہ کو خصوصاً روحانی بیماریوں سے شفائے کلی عطا فرمائے اور اخوان کے مراتب و درجات کو بلندی بخشے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۲۰

مجازی اور حقیقی محور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ۔ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا ط
اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

مذہب مذہب کے لغوی معنی راستے کے ہیں۔ یعنی جن دو طرفہ حدود کے اندر انسان قدم اُٹھاتا ہے وہ مذہب ہے۔ اور اصطلاحی معنی میں ایسے طور و طریق کو مذہب کہتے ہیں جو انسان اپنی معاشی یا روحانی زندگی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان نے اپنی ضروریات کے مطابق اپنی زندگی کے طور و طریق اختیار کیے اور اُنھیں دین یا مذہب کا نام دے کر اس کی پیروی کو لازمی قرار دیا ہے۔ چونکہ انسان فطرۃً مدنی الطبع ہے۔ اس لیے وہ بغیر اصول و طریق کے پُر امن زندگی نہیں گزار سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان بغیر دین یا مذہب کے اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔ پس وہ لوگ صریح اور کھلے ہوئے دھوکے میں مبتلا ہیں، جو خود کو بے دین یا لامذہب سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول اور طریقے اختیار کیے ہیں وہی اُن کا دین یا مذہب ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود ساختہ مذہب کے پیرو ہیں۔

Marfat.com

مذہب کے اقسام دین یا مذہب کی دو قسمیں ہیں - ایک یہ کہ انسان نے اپنی زندگی کے لیے خود ہی کچھ قوانین بنا لیے ہوں - اور دوسرے یہ کہ انسان کے پیدا کرنے والے خدا نے جس طرح انسان کو پیدا کیا اُسی طرح اُس کی زندگی کے لیے وہ اصول اور قوانین بھی اُسے بتائے جو امن و سلامتی کی طرف اُس کی رہنمائی کرتے ہیں - ایسے اصول و قوانین کو دینِ الٰہی کہتے ہیں. جیسے دین اسلام — انسانی زندگی کو ایک ایسے پُرامن اور معیاری راستے پر لگا دینا جو اُس کے معراجِ کمال کا نمونہ اور اُس کی اشرفیتِ تامّہ کا ثبوت بن جائے. اسی امن و سلامتی کے راستے کو اسلام کہتے ہیں.

دعوتِ تفکّر اِس آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے امن و سلامتی، اور شرافتِ انسانی کا وہ نایاب و نادر طریقہ تعلیم فرمایا گیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانونِ حکومت یا دستور قومیت میں نہیں پائی جاتی — ہم اِن آیات کے ترجمہ کے ساتھ امن و سلامتی اور شرافتِ انسانی کے ان قوانین کی کھلی ہوئی تشریح کر کے جملہ اقوامِ عالم کو دعوتِ تفکر دیتے ہیں — اور دعویٰ کرتے ہیں کہ امن و سلامتی کے یہ طور طریق کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ اُس ذاتِ احد و مطلق کے مقرر کردہ ہیں جو تمام عالمِ خلقی اور عالمِ امری کا خالق و پروردگار اور اشرف المخلوقات کا معبودِ حقیقی اور مقصودِ عینی ہے.

قبلہ اللہ تبارک و تعالیٰ کس حُسنِ کلام کے ساتھ انسان کو امن و سلامتی کے راستے کی ہدایت فرماتا ہے — وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ - ہر قوم، ہر قبیلہ، ہر نوع، ہر جنس، بلکہ ہر ہر فرد کے لیے ایک سمت، ایک نصب العین، یا ایک قبلہ نظری و عملی - یا ایک "رُخ" ہوتا ہے. هُوَ مُوَلِّيهَا جس طرف وہ اپنا منہ کرتا، یعنی مائل و متوجہ ہوتا ہے — مگر اے صاحبانِ ایمان فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ، تم تو نیکیوں اور بھلائیوں ہی طرف آگے بڑھتے جاؤ. تمھاری سمت

Marfat.com

تمہارا قبلہ اور تمہارا النصب العین صرف نیکیاں اور بھلائیاں ہیں ۔ تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو (یعنی نیکی کرنے والوں سے آگے بڑھو۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اللہ کے نزدیک وہی زیادہ شریف اور زیادہ قابلِ عزت ہے جو زیادہ پرہیزگار اور زیادہ بھلائیاں کرنے والا ہے۔)

جمعیت اِن نیکیوں میں سبقت کرنے کا نتیجہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا: اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا۔ تم دنیا کے کسی خطے، کسی حصے یا کسی ملک میں رہو اللہ تعالیٰ تمہاری جمعیت کو برقرار رکھے گا ۔ یہ بات پورے غور کے ساتھ سمجھ لینے کی ہے کہ قومی طاقت و وقار اس کی جمعیت و وحدت عمل پر منحصر ہے ۔ اور جمعیت کو اللہ تعالیٰ نے نیکیوں پر منحصر فرمایا ہے ۔ اس لیے جو قوم نیکیوں اور بھلائیوں میں آگے بڑھتی رہے گی وہ جمعیت کی حامل ہوگی ۔ اور جو جمعیت کی حامل ہوگی اُسے اللہ تعالیٰ قوت، غلبہ اور نصرت عطا فرمائے گا۔
یہاں یہ بات بھی اچھی طرح جان لینے کی ہے کہ قوت، غلبہ اور نصرت مادی اسباب و آلات اور تعداد افواج پر موقوف نہیں ہے ۔ یہی دینِ اسلام ہے جس نے اپنے ابتدائی زمانہ میں روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ رومی اور ایرانی تربیت یافتہ افواج اور آلاتِ حرب و ضرب کثیر کے باوجود نہتے اور فاقہ مست مسلمان کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور سرِ تسلیم جھکانے پر مجبور ہو گئے ۔ وہ کون سی طاقت تھی؟ ۔ وہ نیکیوں اور بھلائیوں میں سبقت کرنے کے نتیجے میں حاصل شدہ جمعیت تھی جس کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو فتح و نصرت اور غلبہ عطا فرمایا تھا ۔ اور مغلوب قوم کو بھی اسلام لانے کے بعد غلامی نہیں بلکہ عزت و شرف اور مجد و رفعت سے نوازا ۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اس میں شک و شبہ نہیں ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ جو چاہے اور جہاں چاہے کر سکتا ہے ۔

Marfat.com

اقوام کا نصب العین دنیا میں جتنی قومیں اور جتنے قبیلے ہیں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی خاص رُخ یا النصب العین ہے اور وہ اپنے اسی رُخ کی طرف میلان رکھتے ہیں مثلاً — کمیونزم عقیدے والوں کا نمایاں رُخ یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے صرف اقتدارِ اعلیٰ کا کام کریں اور مذہبی تصوّر کے قریب نہ جائیں، کیونکہ خدا کا اعتقاد انسانی دماغ کی پیداوار ہے اور کوئی خدا نہیں ہے۔ اور وہ اپنے اس تصوّر کے ماتحت انسانی فلاح وبہبود اور قومی سلامتی جو مذہب سے حاصل ہوتی ہے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ برخلاف اس کے خود اپنے بنائے ہوئے مذہب کو جسے وہ لامذہبیت سے تعبیر کرتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں۔ خواہ اُس کے ظاہری فوائد اور نظر آنے والی خوبیاں کسی حد تک بھی عارضی اور مہمل کیوں نہ ہوں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی قیمت پر اپنے اس رُخ سے پلٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں — هُوَ مُوَلِّيهَا — وہ تو بس اسی طرف جھکے جائیں گے — اسی طرح اس سے بیشتر کتنی اقوام اپنے خود ساختہ قوانین کے ماتحت کفر ولامذہبیت میں مبتلا تھیں ناپید ہو گئیں۔ مگر خدائی قانون کو سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ آج اگر کوئی بڑے سے بڑا مدعیِ لامذہبیت اپنے دعوے میں سچا ہے، تو آئے، اور اپنے بنائے ہوئے قانون کو خدائی قانون کے مقابلہ میں بلند وبرتر ثابت کرے۔

اسلام کی امن پسندی اسلام کی امن پسندی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا کہ وہ اپنے اصول وقواعد وقوانین کو منوانے اور اپنے نظریاتِ توحید ورسالت کو تسلیم کرانے میں بھی سلامتی اور امن کا طریقہ استعمال کرتا ہے۔ اور اپنی اخلاقی، اور کرداری بلندی کے اظہار کے ذریعہ اپنی صداقت وحقانیت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اگر کوئی اُس کے معتقدات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ سختی اور تشدد مذہبِ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ برخلاف کمیونزم کے کہ وہ اپنے فرضی اعتقادات اور بنیادی اصول و

Marfat.com

تواتین کو زبردستی منوانے میں جارحانہ کارروائیوں اور تشدد آمیز چالاکیوں سے بھی گریز نہیں کرتا۔

جنسِ معصوم

اسی طرح بعض اُن اقوام کو لیجیے جنھوں نے اپنے قومی ارتقا اور ترقی پسندی کی آڑ لے کر خواتین کے معاملہ میں حد درجہ افراط سے کام لیا ہے، اور اس معصوم جنس کو آزادی کا فریب دے کر، اُسے عصمت کے مامون و محفوظ قلعہ سے باہر نکال کر اور اُس کے سر سے شرم و حیا کی چادر چھین کر اپنی ہوس رانی کے دوش بدوش لے آئی ہیں۔ اُن کے لیے انسانیت کا یہ حیوانی رُخ ہی شرافت کا وہ معیار ہے جس سے واپس لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں سے بعض وہ قومیں بھی ہیں جو آزادیِ نسواں کے ساتھ بلند کرداری اور عفت شعاری کی حامل ہیں۔ لیکن وہ دعویٰ تو کیا خیال بھی نہیں کر سکتیں کہ اُن کی آنے والی نسل اِن اسباب ترغیب کی فراوانی کے باوجود اسی بلند کرداری اور عفت شعاری پر قائم رہیں گی جو آج اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ پھر بھی وہ اپنے زاویۂ نگاہ سے پلٹنا تو درکنار اُن لوگوں کی بات تک سننا گوارا نہیں کرتے جو اُن کے نظریات کی حامی نہیں ہیں۔

انسانیت کی توہین

اسی طرح بعض وہ اقوام جن کا رُخ دنیاوی مال و متاع، زر پرستی اور سرمایہ داری ہے، وہ اسی کو اپنی شرافتِ انسانی کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ دولت کمانے اور سرمایہ جمع کرنے میں انسانیت کو پامال کرنے اور مزدور کو نقصان پہنچا دینے سے بھی عار و گریز نہیں کرتے، بلکہ دولت تک پہنچنے کے لیے بے سہارا غریبوں کی لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھنا چالاکی اور سیاست سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام میں فساد پھیلانا اور کسی انسان کے ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچ جانا انسانیت کی زبردست توہین ہے۔

اسلام کی امن پسندی کا ثبوت

غرض دنیا بھر کی جملہ اقوام پر نظر ڈالیے، سوائے اسلام کے اور کسی نے امن و سلامتی کا وہ راستہ نہیں بتایا جو

Marfat.com

انسانیت کی معراجِ کمال ہو اور جس پر چل کر آزادی، مساوات اور شرافتِ انسانی کو ثابت کیا جا سکتا ہو ـــ آؤ، اگر اسلام کی امن پسندی، رواداری اور بلند کرداری کی مثال دیکھنی ہو تو علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ اور حسین علیہ السلام کے کردار میں دیکھو کہ ـــ علی کرم اللہ وجہہٗ ایک کافر دشمن کے سینے پر سوار ہیں اور قریب ہے کہ علیؓ کا خنجر دشمن کے سینے میں پیوست ہو جائے، دشمن حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور آپ اُس کے سینے سے اس لیے اُتر آتے ہیں کہ اس کے بعد اُسے قتل کرنا خدا کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی توہین کے انتقام پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہے دُنیا میں اس امن پسندی اور رواداری کی کوئی اور مثال ـــ اسی طرح امام حسین علیہ السلام تین دن کے بھوکے پیاسے رہ کر اتمام حجّت کرتے ہیں، اور خاندانی شجاعت و بہادری کا نمونہ پیش کرنے کے لیے تلوار اُٹھاتے اور ظالموں کے چھکّے چھڑا دینے کے بعد مشیّتِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ کیا دنیا ایسا کوئی اور واقعہ، جس سے رضا و تسلیم کا اس درجہ اظہار ہو، پیش کر سکتی ہے۔

زندگیوں کا محور کبیر داس جو ایک ہندوستانی مفکر اور اصولِ اسلام کا ترجمان گزرا ہے اپنے ایک دوہے میں سلامتی کا عجیب طریقہ بتاتا ہے۔

وہ کہتا ہے :-

چلتی چاکی دیکھ کے دیو کبیرا روئے ـــ دو پاٹن بیچ آن کے ثابت رہیو نہ کوئے
چاکی چاکی سب کہیں مانی کہے نہ کوئے ـــ مانی سے جو لگ رہیو سو بال نہ بیکا ہوئے

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسانی زندگی، وہ خواہ کسی نوعیت کی ہو، ہر وقت کسی نہ کسی چکّی کے دو پاٹوں میں ہو کر گزر رہی ہے ـــ کبیر داس کہتے ہیں کہ جب میں چلتی چکّی دیکھی اور اُن دانوں کی مصیبت کا اندازہ کیا جو اُس کے دو پاٹوں کے بیچ میں آ کر پس جاتے ہیں۔ تو میری

Marfat.com

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیونکہ یہی انسانی زندگی کی مثال ہے۔ زمین اور آسمان چکی کے دو پاٹ ہیں جن میں ہر انسان آلام و حوادث کا شکار ہے۔ یہاں چشم زدن میں کسی بڑے سے بڑے واقعہ کا ظہور پذیر ہو جانا ہر وقت کے ہمارے مشاہدات ہیں۔ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ اتفاقات پر کسی کا اختیار نہیں۔ لیکن کبیر داس کہتے ہیں، چکی چکی تو سب چلاتے ہیں، یعنی دنیا کے مصائب و آلام کی سب شکایت کرتے ہیں، مگر۔ یہ کوئی نہیں کہتا، یعنی جس محور یا کیلی پر زمین و آسمان کی گردش منحصر ہے، اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ دیکھو، جو دانہ کیلی سے لپٹ کر بیٹھ جاتا ہے اُس کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا چاہے ہزار مرتبہ اُس پر چکّی چلے۔ پس عقلمند انسان وہ ہے جو اپنی کیلی کو پہچانے اور اُس سے لپٹ کر بیٹھ جائے۔ ہر قوم، ہر قبیلہ ہر گروہ اور ہر جماعت کے لیے ایک ایک انفرادی کیلی ہوتی ہے۔ لیکن اجتماعیتِ انسانی کی سب سے بڑی اور حقیقی کیلی وہی ہے جس کو اسلام نے "هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کہا ہے۔ اور جس کے حکم و مشیئت کے ادنیٰ اشارے پر حیرت انگیز واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

انفرادی و مجازی محور جب ایک انسانی بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اس عالم تغیرات میں سردی گرمی، خواب و بیداری، انبساط و انقباض، انجذاب و اندفاع، رات و دن، صبح و شام، پاکی و ناپاکی اور بیماری و تندرستی وغیرہ دو پاٹوں کی گردش میں مبتلا ہو جاتا ہے اس وقت بچّے کو اِن دو پاٹوں کی چکّی سے محفوظ اور سلامت رکھنے والی مجازی کیلی اُس کی ماں ہوتی ہے جو اگر نیکیوں میں سبقت رکھتے ہوئے اپنے فرائض پورے طور سے انجام دیتی اور بچّہ کے رکھ رکھاؤ میں، اپنے آرام و راحت کو قربان کر دیتی ہے تو بچّہ اِن دو پاٹوں کی چکیوں سے مامون و محفوظ رہ کر پرورش پا جاتا ہے اور اگر کسی وجہ سے غفلت برتتی، یا بچّہ اُس سے دُور ہو جاتا ہے تو بالضرور حوادث میں مبتلا ہو کر رنج و تکلیف اُٹھاتا یا ختم ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ماں

بچہ غیر شعوری طور پر ہر وقت اپنی ماں کے پاس رہنے میں آرام و راحت محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ ماں کے پاس رہنا اُس کے اختیار میں نہیں ہے، لیکن قدرت نے ماں کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ خود بچے سے دُور رہنا گوارا نہیں کرتی۔ خود تکلیف اُٹھاتی ہے مگر بچے کو تکلیف نہیں ہونے دیتی۔ تمام ایسی غذاؤں اور اُن باتوں سے پرہیز کرتی ہے جو بچے کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اب جو بچہ اس مجازی کیلی سے لپٹ کر رہتا ہے وہ مامون و محفوظ اور سلامت رہتا ہے۔ اور اگر کسی بچے کو یہ کیلی ہاتھ نہیں آتی تو سوائے اُس حقیقی کیلی کے اور کوئی اُس کا محافظ نہیں ہوتا۔ اور اُس کا سلامت رہنا قدرتی امورات پر محمول کیا جاتا ہے

باپ اور استاد

اس شیر خوارگی کے زمانے کے بعد لڑکپن کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس وقت ایک لڑکے کی معصوم اور سادہ طبیعت کے لیے ضد و حلم، سرکشی و فرمانبرداری، علم و جہل اور صحبتِ نیک و بد کے دو پاٹ ہوتے ہیں جن سے محفوظ رکھنے کی کیلی پہلے باپ اور بعد میں استاد ہوتا ہے۔ اگر بچہ اپنے باپ اور اُستاد سے لپٹ کر نہ رہا اور ان کے قریب رہنے کی بجائے ان سے دُور بھاگتا رہا تو تباہی اور بربادی سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔ ان میں سے ظاہری صحت و تندرستی، مزاج و عادات، اطوار و کردار وغیرہ کی درستگی باپ کے فرائض میں ہیں۔ اسکولوں، مدرسوں اور درسگاہوں وغیرہ کے عادات و اطوار اور تخیلی و روحانی صحت مندی کی ذمہ داری استاد کے سر عائد ہوتی ہے۔ اگر باپ فرض ناشناس ہو تو لڑکا اپنے گھر اور اپنے خاندان کے لیے اچھا عنصر ثابت نہیں ہوتا۔ اور اگر استاد فرض ناشناس ہو تو لڑکا ایک اچھا شہری بننے کی بجائے قوم کے لیے خطرناک دشمن بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ہونہار لڑکوں کو چاہیے کہ وہ گھر میں اپنے باپ اور باہر اپنے استاد کے قریب سے قریب تر رہنے کی کوشش کریں۔ یہی اُن کی وہ کیلی ہے جو دو پاٹوں کی گردش سے بچانے اور برائیوں دُور رکھنے

Marfat.com

کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

زوج وزوجہ اس کے بعد جوانی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اچھی بُری آرزوئیں خواہشوں، رحمانی اور شیطانی طاقتوں کے دو پاٹ ہوتے ہیں جو اُسے پیس ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس وقت گھر کے اندر، مرد کے لیے اُس کی بیوی اور ایک خاتون کے لیے اس کا شوہر مجازی کیلی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی کسی غیر کا تصور بھی کرے اور خیالاً بھی دُور ہو جائے تو جوانی کی طوفانی چکّی میں پسنے سے نہیں بچ سکتا۔ قرآن کریم میں بھی ایک کو دوسرے کا محافظ اس طرح فرمایا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ وہ تمھارا لباس یعنی محافظ ہیں اور تم اُن کے لباس ہو۔ پس جوانوں کو چاہیے کہ خود کو طوفانی چکّی میں پسنے سے بچائیں اور ایک دوسرے کی حفاظت کریں۔

پیرِ کامل اسی طرح ایک ارتقا پسند انسان اور طالب مولیٰ کے لیے اُس کے نفسانی اور رُوحانی تقاضے چکّی کے دو پاٹ ہیں جن کے درمیان وہ ضیق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس چکّی سے حفاظت کرنے والی کیلی وہ پیرِ کامل ہے جو طالب مولیٰ کو نفسانی اور شیطانی تباہ کاریوں سے بچا کر سر منزلِ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اگر کسی کو پیرِ کامل نہ مل سکے یا وہ پیر کی روحانی قربت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو تو نفس کی مکّاریوں اور شیطان کی چالبازیوں سے بچ جانا بہت مشکل ہے۔ الّا ماشاء اللہ! اگر تم اپنی زندگی میں جسمانی اور مادی پستی سے بچ کر رُوحانی ارتقاء حاصل کرنا چاہتے ہو تو پیرِ کامل کی تلاش کرو۔ اور اگر پیرِ کامل مِل جائے تو اُس سے ربطِ روحانی حاصل کرنے کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاؤ۔ جب تم کسی مردِ کامل کی پناہ میں آجاؤ گے تو خود ہی محسوس کر سکو گے کہ تمھاری روحانیت کا امن وسکون واطمینان تمھیں حاصل ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ لو کہ تم نے راستہ غلط نہیں کیا ہے۔ تم ٹھیک راستے پر آگئے ہو اور ان شاء اللہ اپنی منزل پر پہنچ

Marfat.com

جاؤ گے۔ اور اگر تمھاری روحانیت کو امن و سکون و اطمینان حاصل نہ ہو تو سمجھ لو کہ ابھی صحیح راستہ یا رہبر تمھارے ہاتھ نہیں آیا ہے۔ اٹھو اور اپنا راستہ تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ مَنْ طَلَبَ شَیْئاً وَّجَدَ وَجَدَ جس نے کسی چیز کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور کوشش کی، اُس نے اُسے پا لیا۔

اجتماعی و حقیقی محور

یہ مختصر بیان اُن مجازی کیلیوں کا تھا جو عالم ظاہر میں اللہ تعالےٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ لیکن اگر ہم اِن مجازی کیلیوں اور ان کی کارفرمائیوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں تو ماں کے دل میں مامتا اور والہانہ فریفتگی پیدا کرنے والا وہی اللہ تبارک و تعالیٰ ہے، وہی باپ اور اُستاد کو ایک لڑکے پر شفیق اور مہربان بناتا ہے۔ وہی زن و شوہر کے درمیان ملابست و مودّت ودلیعت فرماتا ہے اور وہی ایک طالب کو پیرِ کامل تک پہنچاتا اور وہی پیرِ کامل کو مطلوب تک پہنچنے کا وسیلہ بناتا ہے۔۔۔ عالم ظاہر میں سن اور وقت کے اعتبار سے اسباب ظاہر بدلتے رہتے ہیں۔ اور مجازی کیلیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لیکن حقیقی محور یا کیلی جس پر امن و سلامتی کا دار و مدار یقینی ہے وہ وہی ذات واحد القہّار ہے جس نے اُن اقوامِ عالم کی آج تک حفاظت فرمائی جو اُس کے قریب رہیں۔ اور وہ تمام اقوامِ عالم جو اُس سے دُور ہوئیں اپنے اپنے زمانے ہی میں اس طرح برباد اور نیست و نابود ہو گئیں کہ آج اُن کا نام و نشان تک (سوائے تاریخ کے) باقی نہیں ہے۔

نیک نامی

اس آیتِ مبارکہ میں انسان کو ایک ایسی کیلی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو دین اور دنیا دونوں عالم میں اُس کی حفاظت کرتی ہے وہ خیرات، صدقات اور نیکیوں میں آگے ہی بڑھتے جانا ہے۔ آپ غور کریں، اس دنیا میں آج تک جتنے مخیر حضرات اور نیکی و بھلائی کرنے والے گزرے ہیں اُن کا نام آج بھی زندہ ہے۔ ہم کس عزت د

Marfat.com

احترام سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ یہی اُن کی روحانی جنّت اور آرام و راحت کی دلیل ہے۔
برخلاف اُن لوگوں کے جنھوں نے بھلائی سے گریز کیا۔ وہ یا تو اس طرح معدوم ہو گئے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ یا مرنے کے بعد عذابِ الٰہی میں اس طرح مبتلا ہیں کہ دنیا میں بھی اُن کو بُرائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور جو اُن کا نام لیتا ہے نفرت کا اظہار کرتا ہے

اپنے ساتھ نیکی نیکیوں اور بھلائیوں میں سب سے پہلی نیکی اور بھلائی وہ ہے جو ہم اپنے ساتھ کریں ـــ یاد رہے کہ عمدہ کھانا، اچھے لباس اور شاندار کوٹھیاں نفس کے لیے حقیقی بھلائی نہیں ہیں۔ بلکہ نفس کی حقیقی بھلائی وہ ہے جس سے یہ اپنی دوسری زندگی میں آرام و راحت پائے۔ نفس کی ان تمام بھلائیوں میں سب سے پہلی اعتقادی نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ ہم خدا کی وحدانیت اور رسُول کی رسالت پر ایمان لائیں۔ پھر اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اُس کے رسولوں پر، قیامت پر اور اندازۂ خیر و شر کے من جانب اللہ ہونے پر ایمان لائیں۔ پھر سب سے پہلی عملی نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی پابندی کریں۔

بندوں کے ساتھ نیکی اس کے بعد اور دوسری بھلائیاں ہیں جو اپنے خاندان و اعزّا و ہمسایہ و ہم وطن، ہم قوم اور بنی نوعِ انسان بلکہ جملہ مخلوقات کے متعلق ہیں۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے نفس کی ظاہری و باطنی بھلائیوں کا انتظام نہ کر لے اس کی کوئی بھلائی قابلِ قدر نہ ہو گی۔ کیونکہ جو اپنی مدد آپ نہ کر سکے وہ دوسروں کی کیا مدد کر سکے گا۔ جو خود دکھڑا نہ ہو سکے وہ دوسروں کو کیا سہارا دے گا۔ جو آپ اپنی عزت کا محافظ نہ ہو وہ دوسروں کی کیا عزت کر سکے گا؟ پہلے گھر کا اندھیرا دور کرو، پھر مسجد میں چراغ جلانے جاؤ۔

Marfat.com

تاویل قبلہ آگے ارشادِ باری تعالےٰ ہے "وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف رکھو۔ مسجدِ حرام پاکیزگی و نورانیت کا منبع اور اتقاد پرہیزگاری کا مرکز ہے۔ تعلیم یہ کی جاتی ہے کہ ہر جگہ ہر وقت اپنے آپ کو پاکیزگی و نورانیت اور اتقاد پرہیزگاری کی حالت میں قائم رکھو۔ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ "کیونکہ اسی حالت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق بات کہا گیا ہے۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اُس سے خبردار ہے۔

خالص عبادت آگے پھر وہی آیت دُہرائی جاتی ہے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ تم جہاں سے خروج کرو (جس طرف بھی متوجہ ہو) اپنا منہ مسجدِ حرام ہی کی طرف رکھو۔ مسجدِ حرام کی طرف منہ رکھنے کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خواہ کسی مقام پر رہو، یا وہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ تمھارے ہر ایک کام میں ایک پُرخلوص عبادت کی نیت ہونی چاہیے۔ اور یہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب تم ہر کام کو خدا کے لیے کرو۔ یعنی ہر کام میں دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اُس کے کرنے کے لیے ہے یا نہیں، اگر خدا کا حکم پاؤ تو اس کو انجام دو، وہی کام اللہ تعالےٰ کے حکم کی بجا آوری کے اعتبار سے خالص عبادت ہوگا اور تم اپنی نیتِ عبادت کی وجہ سے اپنے منہ کو گویا مسجد حرام کی طرف ہی رکھوگے جیسے عبادتِ نمازمیں۔

ہدایت یافتگی وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔ اور تم جہاں کہیں بھی رہو اپنے منہ کو اسی کی طرف رکھو۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ۔ تاکہ لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک حجت قائم ہو جائے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ان میں سے ظلم کرنے والے ہیں۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ پس تم ان ظالموں سے نہ ڈرو، بلکہ

Marfat.com

مجھ سے ڈرو وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ تاکہ میری نعمتیں تمھارے اوپر اُتاری جائیں وَلَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔ اور شاید کہ تم ہدایت پانے والوں میں ہو جاؤ۔

بعثتِ رسول

کَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا۔ جیسا کہ ہم نے تم ہی میں سے تمھارے پاس رسول بھیجا، جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائے۔ وَ یُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ اور تمھیں مزکّی بنائے۔ اور تمھیں کتاب یعنی علمِ ظاہر اور حکمت یعنی علمِ باطن تعلیم فرمائے وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ اور وہ باتیں تم کو سکھائے جو تم نہ جانتے ہو۔

یادِ الٰہی

فَاذْکُرُوْنِیْۤ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ۔ پس تم کو چاہیے کہ سب ملکر میرا ذکر کرو۔ مجھے یاد کرو اور میں تمھیں یاد کروں۔ اور تم اجتماعی حیثیت سے میرا شکر ادا کرو۔ اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہم جملہ بنی نوعِ انسان کو اپنی طرف متوجہ فرمائے اور نیکیوں میں استباق کی توفیق عطا کرے۔ اور ہم اخوانِ طریقت کو اخلاقِ حسنہ کے مرکز پر اس طرح قائم رکھے کہ ہم ملّتِ واحدہ ہو کر زندگی گزاریں۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۲۱

اختلاف و افتراق

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ قَالَ۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ رَؤُفُ الرَّحِیْمُ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ مَهْدِیِّیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

تعریفِ اختلاف و افتراق اختلاف کے معنی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرنا ہے، جس کا مطلب موافقت نہ کرنا ہوتا ہے۔ اور افتراق کے معنی ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہوں مگر ایک دوسرے سے دُور نہ ہوں۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے دُور ہوں، مگر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے نہ ہوں ۔ اس لیے اختلاف اور افتراق کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھنا صحت پر مبنی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اختلاف ہو لیکن افتراق نہ ہو، یا افتراق ہو اور اختلاف نہ ہو۔ اس طرح ان کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں:۔

اختلاف بلا افتراق یہ وہ علمی اور اجتہادی اختلاف ہے جس میں مسائل، موضوعات، نظریات یا عملیات کا اختلاف ہوتا ہے، لیکن افتراق سے

Marfat.com

خالی ہوتا ہے۔ یعنی باوجودیکہ چند باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن، نفرت وکشیدگی، دل آزاری ودشمنی نہیں ہوتی۔ جیسے اسلام کے فقہی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، جعفری اور حنبلی میں اجتہادی مسائل کا اختلاف ہے، لیکن افتراق کا کوئی اثر ان میں نہیں پایا جاتا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست، بہی خواہ اور معاون ہیں۔ ایک دوسرے سے روحانی ربط رکھتے ہیں۔ اور ان کے اختلافات نے مسائل کی حقیقتوں کو سمجھنے میں اور اعتقاد وعمل کے لیے راستہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ اس لیے یہ اختلاف نہایت مبارک اور مستحسن ہے۔ کیونکہ علمی ترقی کے لیے اختلاف اشد ضروری ہے۔ بغیر اختلاف کے کمالِ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ (میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے) اور کتنے لطف کی بات ہے کہ اس حدیث کے معنی میں بھی دو گروہ کے درمیان اختلافِ مستحسن واقع ہوگیا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس حدیث میں "اختلاف" کے معنی اختلاف علمی ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس اختلاف کے معنی اختلافِ عملی (ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا) ہے۔ "یعنی اُمت کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہیں گے تو اسلام کی تبلیغ ہوگی، اور اس اعتبار سے یہ اختلاف رحمت ہو جائے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک معنی سے دوسرے معنی کی تردید کریں جبکہ ایک کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے معنی بحالہ باقی رہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن پاک لفظ "اختلاف" کو بہتر معنی میں یوں ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (یقیناً رات اور دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں سمجھ دار لوگوں کے لیے۔ پس یہ اختلاف جو بلا افتراق ہے صرف مستحسن ہی نہیں، بلکہ ضروریاتِ علمی وحصول رحمت کے وسائل میں سے ہے۔

Marfat.com

افتراق بلا اختلاف

افتراق یعنی ایک دوسرے سے جدا ہو جانا خواہ اختلاف کے ساتھ ہو، یا بلا اختلاف ہر صورت سے قبیح اور انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مضر اور قابلِ نفرت و لعنت ہے، کیونکہ یہ اتحاد و اتفاقِ قومی کا ہادم و منافی ہے۔ اسلام میں قطعاً اس کی گنجائش نہیں، جو لوگ ان معانی سے آگاہ نہیں ہیں اور علمی اختلافات کو رحمت بنانے کی بجائے افتراق کے نتیجوں میں کھینچ لاتے ہیں۔ درحقیقت قرآن حکیم کے حکم کے مطابق اپنا رشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع کر لیتے ہیں جیساکہ فرمایا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُہُمْ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔ (یقیناً جن لوگوں نے دین میں افتراق پیدا کیا اور گروہ گروہ ہو گئے آپ کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اُن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ وہ خود اُن کو بتا دے گا جو کچھ وہ لوگ کر رہے ہیں۔) ملاحظہ فرمائیے اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا ارشاد نہیں فرمایا۔ بلکہ "فرّقوا" فرمایا ہے اور اسی سے ہمارے وہ معانی واضح ہو جاتے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اور نہایت غور طلب ہیں۔ یہ افتراق قرنِ اولیٰ میں نہ تھا، ثانیہ کی پیداوار ہے اور اب قرنِ ثالثہ میں اس درجہ غالب ہے کہ علوم کی رحمتیں اور برکتیں پوشیدہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

اختلاف مع الافتراق

جب یہ واضح ہو گیا کہ افتراق بہر صورت غیر مستحسن ہے تو اختلاف مع الافتراق کے متعلق کچھ کہنا ہی بے سود ہے۔ چنانچہ، یہ بہر صورت باعثِ فتنہ و فساد اور قوم و ملت کی تباہی کا باعث ہے۔ اس کا کوئی پہلو کسی تاویل سے مستحسن یا مستحب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ برخلاف اختلاف بلا افتراق کے کہ وہ کسی طرح رحمت سے خالی نہیں۔

اختلاف سے حصولِ رحمت

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اختلاف بلا افتراق باعثِ رحمت ہے، تو رحمت حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرنا ہوگا کہ ہم اختلاف سے

Marfat.com

کیونکر زیادہ رحمت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اختلاف کو افتراق سے کیونکر بچا سکتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہم کو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ اختلافات کہاں کہاں رونما ہوتے ہیں۔ کیونکہ مقام کے مطابق ہی وہ طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں جو نتائج رحمت سے ہمکنار کرنے والے ہیں۔

اختلاف کے اقسام

ویسے جب یہ اختلاف باعثِ رحمت ہے اور رحمت ہر جگہ عام، تو یہ اختلاف بھی ہر جگہ عام طور سے پایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ماں بیٹی، باپ بیٹا، اُستاد شاگرد، شوہر و زوجہ، رہرو اور رہنما، پیر اور مرید، رسول اور امتی، نیز خدا اور بندے کے درمیان واقع ہوسکتا ہے۔ اور انھیں اعتبارات کے لحاظ سے زائد از زائد رحمت و استعانت کا متقاضی ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم جملہ اختلافات کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بزرگوں کا اختلاف چھوٹوں کے ساتھ۔ دوسرے چھوٹوں کا اختلاف بزرگوں کے ساتھ۔ تیسرے برابر والوں کا اختلاف۔

بزرگوں کا اختلاف چھوٹوں کے ساتھ

یہ اختلاف نہایت وقیع اور قابلِ عزت و احترام ہوتا ہے، کیونکہ یہ بزرگوں کی محبت، شفقت اور عنایت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہ بزرگ خدا جانے اپنے جگر کا کتنا خون، دل کے جذبات اور روح کی سرشاریاں قربان کرکے اپنے چھوٹوں کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ اور اس اختلاف میں اُن کو کتنی کوششوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی شفقتوں اور محبتوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اختلاف نہ کریں، لیکن پیش بینی، تربیت و تعلیم، ہدایت و ارشاد یا فرض شناسی کے ماتحت اپنے دل پر جبر و اکراہ برداشت کرتے اور اپنے اختلاف کے ذریعہ سے چھوٹوں کو رحمتیں عطا کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ بزرگ اپنے چھوٹوں سے اختلاف نہ کریں تو وہ زندگی کی تمام نعمتوں اور رحمتوں سے محروم رہ جائیں۔ اس اختلاف میں جس طرح

Marfat.com

بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے تمام تر اختلافات کے دوران اپنی شفقتوں کو نہ روک لیں، اسی طرح چھوٹوں پر سب سے بڑا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اختلاف کو دشمنی اور ظلم پر محمول نہ کریں. اور ان بزرگوں کے احترام و آداب کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اس اختلاف سے افتراق کا ہرگز اثر نہ لیں اور اُن سے دُور ہوتے یا دور رہنے کی کوشش نہ کریں۔ اُن کے اختلاف کو سمجھیں اور دیکھیں کہ وہ اس سے کیا کیا رحمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اور جو کچھ حاصل کر سکیں کرتے ہیں اور ہرگز یہ نہ دیکھیں کہ بزرگوں کا اختلاف اُن کے نظریات، موضوعات اور اعمال کے سامنے دیوار حائل بن گیا ہے۔ وہ اِن سب چیزوں کو رحمت پر قربان کر دیں۔ بلند و بالا نتیجہ برآمد ہو گا۔

چھوٹوں کا اختلاف بزرگوں کے ساتھ

یہ اختلاف ہمیشہ پست معمولی اور اکثر ضد، نا سمجھی اور ناتجربہ کاری پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ اختلاف کریں گے وہ بزرگوں کے مقابلے میں ناتجربہ کاری پر محمول ہو گا۔ وہ اختلاف کریں لیکن صرف سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی حد تک، جب تک حصولِ علم اور افہام و تفہیم کا مقصد زیر نظر ہو اختلاف کو سامنے لائیں۔ ورنہ فوراً اختلاف ترک کر دیں۔ اگر بلاوجہ اختلاف قائم رہا تو چھوٹوں کے لیے ہرگز مفید نہ ہو گا۔ اس اختلاف میں بھی جس طرح چھوٹوں کا فرض ہے کہ وہ آداب بزرگانہ اور احترام کو ملحوظ رکھیں۔ اسی طرح بزرگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ چھوٹوں کے اختلاف کو نرمی، خوشدلی اور احسن طریقہ پر دُور کرنے کی کوشش کریں اور یہ لحاظ رکھیں کہ چھوٹوں کی اُبھرتی ہوئی طبیعت کچل کر نہ رہ جائے۔ بلکہ جب چھوٹے کوئی اختلاف سامنے لائیں تو اُسے بہ نظر استحسان رحمت بنا کر اُنھیں واپس لوٹا دیں۔

برابر والوں کا اختلاف

یہ اختلاف عمومی ہے اور کثرت سے رونما ہوتا ہے! اور برابر والوں کا حق بھی ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے

Marfat.com

اختلاف کریں۔ جیسا بھائی بھائی، دوست دوست، ہم پیشہ ہم پیشہ یا شوہر و زوجہ کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ اختلاف زندگی میں جس قدر عام ہے اتنا ہی ضروری بھی ہے۔ بغیر اس اختلاف کے دونوں کی درمیانی حقیقتیں واضح نہیں ہوتیں۔ اس اختلاف کے دوران اس بات کا لحاظ و خیال اشد ضروری اور نہایت اہم ہے کہ اس اختلاف کا اثر اخوت، دوستی، محبت، مودت و موانست کو ہلکا سا جھٹکا بھی نہ لگنے پائے جس وقت بھی اس بات کا احتمال ہو کہ اس درمیانی رشتہ کو ادنیٰ سی جنبش بھی پہنچ جائے گی فوراً بڑے سے بڑا اختلاف دور کر دیں اور اس کو دور کرنے میں جو کچھ بڑی سے بڑی قربانی کی ضرورت ہو ہرگز دریغ نہ کریں ـــ ورنہ اختلاف افتراق بن جائے گا اور رحمت کی بجائے لعنت حاصل ہو گی۔

اختلاف مع الافتراق کے اقسام

باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے عقل و تمیز دی، ہوش و حواس دیے، نیک و بد سمجھنے کی قابلیت دی، پھر اولادِ آدمؑ کے درمیان یہ غلط اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ بعض مفکرین نے اس کی وجوہات میں زر، زمین اور زن کو اصل سبب قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بیرونی اسباب (اگر ہم تلاش کریں تو) اصل سبب نہیں ہیں، بلکہ اصل سبب خود ہمارے اندر موجود ہوتا ہے اگر ہمارے باطن میں وہ اسبابِ اصلی موجود نہ ہوں تو یہ بیرونی اسباب ہم پر غالب نہیں آ سکتے اور وہ بھی تین اسباب ہیں۔ ایک نفسانیت، دوسرے عصبیت، تیسرے جہالت اور ان کو اچھی طرح سمجھ کر دل نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ اختلاف ہلاکت، تباہی اور جہنم تک پہنچائے بغیر نہ رہے گا۔

اختلاف بہ نفسانیت

اس اختلاف کی بنیاد نفسانیت پر ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی نفسانی خواہشات (حظ و لذت، لالچ، بالادستی و منافع) کی وجہ سے

اختلاف کرے۔ جب یہ نفسانیت ہمارے باطن میں غالب ہوتی ہے تو بیرونی اسباب زر، زمین اور زن اس کے دجوہِ اظہار اور معاون و مددگار ہو جاتے ہیں۔ اگر نفسانیت غالب نہ ہو تو یہ بیرونی اسباب اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس لیے اس اختلاف کو دُور کرنے یا اصلاح کرنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح ضروری ہے جب تک نفس کی اصلاح نہ ہوگی یہ اختلاف دُور نہ ہوگا۔ کیونکہ نفس سے ہی خود خواہی اور اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔

نفسانیت کی ایک مثال

گزشتہ ایّام کی ایک برجستہ مثال پر غور فرمائیے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اسلام کی تلقین کی تو اس نے پوچھا۔ "اس وقت مجھے بادشاہت، دولت، حکومت بلکہ خدائی تک حاصل ہے۔ اگر میں تمھارے خدا پر ایمان لاؤں تو اس سے بڑھ کر مجھے کیا ملے گا؟" موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "تمھیں ایسی زندگی ملے گی جسے موت کا خوف نہ ہوگا۔ تم جب تک چاہو گے زندہ رہو گے اور جب تک خدا سے موت طلب نہ کروگے، موت نہ آئے گی۔ دوسرے وہ صحت ملے گی جسے بیماری اور ضعیفی کا کھٹکا نہ ہوگا۔ جب تک زندہ رہو گے جوان، صحت مند اور طاقت ور رہو گے۔ تیسرے تمھاری یہ سلطنت ترقی کے ساتھ لازوال ہو جائے گی، اور کوئی دشمن تم پر غالب نہ آسکے گا۔ یہ وہ تین باتیں ہیں جو تمھاری خدائی میں تم کو حاصل نہیں ہیں۔ بولو، کیا کہتے ہو؟ کیا یہ تینوں باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ تم اپنی فرضی اور جھوٹی خدائی کو اس پر قربان کردو؟" فرعون نے غور کیا کہ تین باتیں معمولی نہیں، بلکہ واقعی یہ وہ باتیں ہیں جو مجھے اپنی خدائی میں حاصل نہیں ہیں۔ اُس کی عقل کا تقاضا تھا کہ فوراً موسیٰ کی تلقین کو تسلیم کرلے، اور خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آئے۔ مگر اُس کے نفس نے وسوسہ ڈالا کہ جلدی کیا ہے، اس پر اور غور کرلو۔ لوگوں سے مشورہ کرو۔ یہی کرنا ہے تو سوچ سمجھ کر کرلینا ____ نفس شیطان اور بدی کا یہ سب سے بڑا گڑھ ہے

Marfat.com

کہ وہ نیک کام کو پہلے التوا میں ڈالتا ہے اور اس کے بعد اُسے نیکی سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے بزرگوں کا قول ہے ع در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست ۔

حضرت آسیہؑ کا مشورہ

فرعون نے مہلت مانگی اور کہا کل اس کا جواب دوں گا ۔ رات کو حضرت آسیہ سلام اللہ علیہا سے فرعون نے کہا موسیٰؑ ایسا کہتے ہیں، تمھاری کیا رائے ہے ۔ ؟ وہ اللہ کی مسلمہ اور مومنہ بندی جو اللہ تعالیٰ کی چار نیک اور محبوب بندیوں (حضرت آسیہؑ، حضرت مریمؑ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ) میں سے ایک تھیں جواب دیا ۔ "اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے ۔ تمھیں اپنی خدائی میں تو یہ باتیں میسر نہیں ۔ تم فوراً موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آؤ اور یہ دولتیں حاصل کرو ۔"

ہامان کا مشورہ

لیکن جب صبح فرعون نے ہامان سے مشورہ کیا، تو ہامان بولا ۔ " یہ آپ کیا سوچتے ہیں ؟ ساری مخلوق آپ کو خدا کہتی، اور آپ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے ۔ اگر آپ موسیٰؑ کی پیغمبری اور اُس کے خدا پر ایمان لائے تو آپ کی خدائی کہاں جائے گی ۔ اور لوگ آپ کے متعلق کیا خیال کریں گے ؟ اور پھر کیا اعتبار ہے کہ موسیٰ جن تین باتوں پر لالچ دے رہے ہیں وہ اسی طرح واقع ہوں گی ۔" ہامان کے اس تازیانے نے فرعون کی نفسانیت پہ کاری ضرب لگائی ۔ اور فرعون نے انکار کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کا نفس اُسے دریائے نیل کے پانی میں ڈبو کر جہنم کی آگ میں جا پہنچا ۔ اگر فرعون اپنی نفسانیت سے مغلوب نہ ہوتا تو بجائے ہامان کا اعتبار کرنے کے اپنی بیوی آسیہ کا اعتبار کرتا اور دونوں جہان میں سرخرو ہونا ۔ اسی طرح نفسانیت وہ باطنی سبب ہے جو زر، زمین اور زن کے بیرونی اسباب سے مل کر انسان کو اس اختلاف میں ڈال کر تباہ و برباد کرتا ہے ۔

اختلاف بہ عصبیت

عصبیت، یعنی تعصب وہ خاص جذبہ ہے جو کسی کی طرفداری اور

Marfat.com

اثر پذیری کے ماتحت پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ اپنے نفس کی ہو یا رشتۂ اخوت و محبت یا مسائل کی طرف میلان ورجحان کی۔ اور جب تک انسان اس سے اچھی طرح واقف ہو کر اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے، اور عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت اختیار نہ کرے اس سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ اور عمومیت کے ساتھ عوام کی اکثریت کسی نہ کسی عصبیت میں ضرور مبتلا ہوتی ہے اگر کوئی فرد اور تمام تعصبات سے خود کو بچانے میں کامیاب بھی ہوتا ہے تو آخر میں علمی اور مذہبی عصبیت اُس کے دامن سے چمٹی رہ جاتی ہے۔ اور کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ علماء کا یہ اختلاف زیادہ تر اسی عصبیت پر مبنی ہوتا ہے ۔ وہ جو کچھ خود جانتے ہیں یا اُن کو وراثت میں ملا ہے اُس کے مقابلے میں دوسروں کی معلومات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور آخر تک اپنی معلومات کی طرفداری میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف رہتے ہیں، خواہ وہ نامکمل اور قابلِ اصلاح کیوں نہ ہو، اور اسی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کو قیامت میں معلوم ہو جائے گا کہ اُن کی یہ عصبیت کس درجہ خطرناک تھی ۔ اسی عصبیت نے کفار مکہ کو اسلام قبول کرنے سے روکا اور آج بھی علماء کی اکثریت اسی عصبیت میں مبتلا ہے اور عوام کو مبتلا۔ اس عصبیت کا دار ومدار اپنی معلومات پر ناجائز اعتبار کرنا ہے ۔ ایسا آدمی یقین کلی رکھتا ہے کہ بس جو کچھ اس نے معلوم کیا ہے وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ جس قدر معلومات ہیں سب غلط اور ناجائز ہیں حالانکہ علم وہ بے پایاں اور ناقابلِ تسخیر سمندر ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا تیراک بھی دعوائے اعتمادی نہیں کر سکتا اور آخر میں " واللہ اَعلمُ بالصواب " کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی تحقیق حرفِ آخر ہے اور اس کے بعد اور کوئی مرتبہ منکشف نہ ہو گا۔ اس لیے جو لوگ اپنی معلومات پر بھروسہ کر کے دامِ عصبیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ دو طرح سے اپنا نقصان کرتے ہیں، ایک یہ کہ اُن کے علوم کے لیے ترقی کا راستہ رُک جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ

Marfat.com

دوسروں کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ باتیں انتہائی غور طلب ہیں تاکہ سوچ سمجھ کر علم سے کام لیا جائے اور اُسے حجابِ اکبر بنانے سے روکا جائے۔ شریعتِ محمدیؐ میں کسی نوع کی عصبیت خواہ وہ کفر و اسلام کے درمیان ہی کیوں نہ ہو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ عصبیت کا تقاضا شدت ہے اور شدت سے جبر و اکراہ و تکلف پیدا ہوتا ہے۔ اور ان میں سے کوئی چیز مستحسن نہیں ہے۔

رسولؐ کا فیصلہ یہودی کے حق میں

ایک یہودی اور ایک مسلمان کسی متنازعہ فیہ مسئلہ میں اُلجھے ہوئے تھے۔ یہودی اُس مسلمان کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، کیونکہ وہ صداقت پر تھا، اور یقین رکھتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی رد رعایت یا طرفداری کے بغیر انصاف فرمائیں گے۔ لیکن مسلمان جو ناحق پر تھا۔ اور حضورؐ کی حق پسندی پر بھی یقین رکھتا تھا۔ پہلے تو ہچکچایا۔ مگر چارہ نہ تھا۔ مجبور ہو کر خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے دونوں کا بیان سماعت فرمانے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔

حضرت عمرؓ کا انصاف

وہ مسلمان جب دربارِ رسالتؐ سے اپنے خلاف فیصلہ سن کر باہر آیا، یہودی سے بولا "میں اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، آؤ چلو حضرت عمرؓ کے پاس چلیں وہ جو فیصلہ کریں گے میں اُسے مان لوں گا۔ اُسے امید تھی کہ حضرت عمرؓ جو ایک جلالی مزاج اور اسلام کے شیدائی ہیں ضرور میری طرفداری فرمائیں گے اور ہرگز یہودی کے حق میں فیصلہ نہ دیں گے۔ دونوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور مقدمہ پیش کیا۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے دونوں کا بیان سنا۔ آخر میں یہودی نے عرض کیا "پہلے یہ شخص مجھ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو فیصلہ کریں گے میں اُسے منظور کروں گا۔ لیکن جب انھوں نے میرے حق میں فیصلہ فرمایا تو اس نے تسلیم نہ کیا اور آپ کے پاس لے آیا کہ

Marfat.com

آپ جو فیصلہ کریں گے اُسے مان لے گا" ـــ یہ سنتے ہی ـــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکان کے اندر تشریف لے گئے ۔ اور فوراً تلوار لے کر واپس آئے اور اُس مسلمان کا سر اُڑا دیا ۔ یہودی بے حد متعجب ہوا ، اور کہا ـــ " یا عمرؓ ! یہ قتل کا تو مستحق نہ تھا آپ نے اسے کیوں قتل کر دیا ۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا " جو مسلمان ہو کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے اُس کی سزا سوائے قتل کے اور کچھ نہیں ہے ۔" وہ یہودی اس انصاف و صداقت اور بے تعصبی سے اتنا متاثر ہوا کہ ایمان لے آیا ۔

عصبیت کے اثرات عصبیت انسان کو حق کی حمایت سے روک دیتی ہے ۔ حقیقت و صداقت کا گلا گھونٹ دیتی ہے ۔ بیجا حمایت ، تشدد ، ظلم اور جور پر اکساتی ہے ، فساد ، نفاق اور افتراق پیدا کرتی ہے ۔ اس عصبی اختلاف میں بھی جب زر ، زمین یا زن کی شمولیت ہو جائے تو اس میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اختلاف بہ جہالت جہالت ایک عذابِ الٰہی ہے ، جس پر نازل ہوتا ہے اُس کی دنیا جہنم بن جاتی ہے ـــ عقل تجربہ پر موقوف ہے اور تجربہ علم پر منحصر ہے ۔ اس لیے بے علم آدمی عقل سے عاری ہوتا ہے ـــ حضرت عبداللہ انصاریؒ ایک جلیل القدر عارف باللہ اور انتہائی سوز و گداز کے مالک تھے ـــ (پیغمبروں میں حضرت داؤد علیہ السلام ائمہ میں امام زین العابدینؒ اور اولیاء میں حضرت عبداللہ انصاری بڑے سوز و گداز سے مناجات کرتے تھے) ایک دن مناجات میں عرض کرتے ہیں ۔ " اے پروردگار جس کو تو نے عقل دی اُسے کیا چیز نہ دی ۔ اور جسے عقل نہ دی اُسے کیا چیز دی ؟" یعنی ساری کائنات میں انسان کے لیے اگر کچھ ہے تو بس عقل ہی ہے ۔ جسے عقل نہیں اُس کے پاس کچھ نہیں ۔

جہالت کی نشانی جہالت کی خاص نشانی یہ ہے کہ جن باتوں کو کسی قدر جانتا ہے ،

Marfat.com

سمجھتا ہے کہ دوسروں سے اچھا جانتا ہوں۔ اور جو بالکل نہیں جانتا اُسے یقین کرتا ہے کہ میں جانتا ہوں۔ اگر اُسے باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ اس بات کو تم نہیں جانتے ہو، جاننے کی کوشش کرو ــ تو ہرگز تسلیم نہ کرے گا۔ برابر یہی کہتا رہے گا "مجھے سیکھنے کی ضرورت نہیں میں اسے خود ہی جانتا ہوں ــ اور جو لوگ آدھی عقل والے ہیں جب اُن سے کہا جائے کہ تم یہ بات نہیں جانتے تو وہ تسلیم کرتا ہے اور اُس کے سیکھنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے ــ اور کامل عقل والا ضروری علوم کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں اتنا جانتا ہوں، اور اس سے زیادہ کی کوشش کرتا ہے۔

جہالت سے گریز

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک حواری کے ساتھ جا رہے تھے۔ دفعتہً تیز دوڑنے لگے۔ حواری بھی اُن کے پیچھے دوڑنے لگا۔ لیکن جب دُور تک وہ نہ رُکے اور برابر دوڑتے رہے، تو حواری کو بڑا تعجب ہوا۔ سوچنے لگا، بظاہر کوئی خاص سبب نہیں معلوم ہوتا اور آپ دوڑتے ہی چلے جا رہے ہیں تو آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "حضرت آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کس چیز سے بھاگ رہے ہیں۔ کوئی خوفناک چیز ہمارے قریب نہیں ہے" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "جہالت سے بڑھ کر اور کون سی چیز خوفناک ہوگی! میں جہالت سے بھاگ رہا ہوں۔ اور اگر چوتھے آسمان تک بھاگتا چلا جاؤں اور جہالت سے بچ جاؤں تو میرے پاؤں نہ رکیں گے"۔ ایک حواری کو نصیحت کرنے اور سمجھانے کیلئے انھوں نے یہ دل نشین پیرایہ اختیار کیا۔

جاہل کی صحبت

اللہ تعالیٰ جب کسی کو دنیا میں عذاب دیتا ہے تو اُس کے ساتھ جاہل کو لگا دیتا ہے۔ اور وہ قہر الٰہی بن کر اُس سے چمٹ کر ــ کبھی آپ کا جوتا تنگ ہوا ہے اور آپ اُس تنگ جوتے کے ساتھ طویل سفر پر مجبور ہوئے ہیں۔؟ ــ بس یہی عالم جاہل کی قربت کا ہوتا ہے۔ اور اُس کا ایک ایک قدم عذاب جان بن کر رہ جاتا ہے۔

Marfat.com

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نخست موعظۂ پیرِ مے فروش این بود — کہ از معاشرِ ناجنس احتراز کنید

اور سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ع

یارِ بد بدتر بود از مارِ بد

جاہل خود تو غرقِ دریائے جہالت ہوتا ہی ہے، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ اسی لیے بزرگوں اور عاقلوں نے نصیحت کی ہے کہ اولیاء اور علماء کی صحبت اختیار کریں۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو اچھے اخلاق والوں میں نشست و برخاست رکھیں۔ اور جاہلوں سے دُور رہیں۔

اسلام دیگر ادیان کا ناسخ نہیں بلکہ متمّم اور مکمّل ہے

بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اسلام دیگر ادیان کا ناسخ ہے لیکن اگر دین سے مراد وہ دین ہے جو خدا کی طرف سے ہم کو عطا کیا گیا ہے تو اسلام ہرگز اس کی تنسیخ نہیں کرتا، بلکہ اس کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا طور پر صحیح ہے کہ اسلام کسی دین کا ناسخ نہیں بلکہ متمّم اور مکمّل ہے۔ اور یہ اسلام جن ادیانِ باطلہ کی تنسیخ کرتا ہے وہ خدا کی طرف سے نہ ہونے کی وجہ سے دین ہی نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں سے جو بھی اسلام کے سامنے آتا ہے خود منسوخ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام کو دیگر ادیان سے اور قرآنِ کریم کو دیگر کتبِ حقّہ سے اختلاف ہو تو ہو۔ مگر افتراق نہیں ہے۔ البتہ ادیانِ باطلہ اسلام سے یقینی اختلاف و فراق رکھتے ہیں۔ اس لیے ردادلری کی رُو سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن آیا۔

سائنس اور مذہب کا اختلاف

مذہب کو سائنس کے ساتھ ہرگز، علمی تعصّب کی وجہ سے اختلاف نہیں۔ اگر عصبی اختلاف ہوتا تو اسلام علم سائنس حاصل کرنے کی کلّی اجازت نہ دیتا۔ برخلاف اس کے سائنس کو تعصبِ علمی کی بنا پر اسلام سے

Marfat.com

اختلاف ہے اس لیے سائنسدان مذہبی علوم حاصل کرنے اور مذہبی نظریات کو تسلیم کرنے کے لیے ابھی تک آمادہ نہیں ہو سکے ہیں ۔ اور سائنسدانوں کا یہ علمی اور عصبی اختلاف صرف مذہب سے نہیں، بلکہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے یہی عصبی اختلاف رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک دوسرے کے انکشافات کی تحقیر و تضحیک کرتے اور جب شدت اختیار کرتے تو ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ اُن کی اسی عصبیتِ علمی نے حق و حقانیت کا راستہ اُن پر مسدود کر دیا ہے ۔ لیکن ایک دن آئے گا، اور بالضرور وہ دن آئے گا جب سائنسدان اسلام کو مانیں گے اور اپنی اس طویل عصبیت پر افسوس کریں گے ۔ ابھی راستے میں ہیں جس چیز کو ان کی عقلِ ظاہر تسلیم کرتی ہے اُسے مانتے ہیں ۔ اور اسلام چونکہ از سرتا پا روحانیت ہے اور روحانیت عقلِ ظاہر سے معقول اور حسِ ظاہر سے محسوس نہیں اس لیے علومِ مذہبی کو تسلیم کرنے کے لیے عقل و حس کے علاوہ قلبِ سلیم اور احساسِ محبت کی ضرورت ہے ۔ جس وقت وہ عقلِ سلیم سے قلب و محبت کی طرف رجوع ہوئے اسلام کا دروازہ اُن کے لیے کھل جائے گا ۔

خلاصہ جملہ اختلافاتِ غیر مستحسن کے اصلی اسباب نفسانیت، عصبیت اور جہالت ہیں اگر انسان اِن تینوں پر قابو پائے اور فتح حاصل ہو تو فرشتوں سے برتر ہو جاتا ہے۔ اور یہی انسان کی اشرفیت کا مقام ہے ۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ !

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

Marfat.com

دَور ۲
ساغر ۲۲

اتّحاد و اتّفاق

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَفٰی۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

قرآن:- وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑو سب مل کر اور الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

اتّحاد و اتّفاق کی تعریف اس سے پہلے اختلاف و افتراق کے معنی سمجھائے گئے تھے، اس وقت اتّفاق و اتّحاد پر غور کیجیے۔ یہ دونوں الفاظ اپنے معطوفات کے ساتھ ایک دوسرے کے بالکل مقابل کے الفاظ ہیں۔ اور دونوں کے معنی یکساں اور ٹھیک ٹھیک برعکس ہیں۔ جس طرح اختلاف کے معنی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہونا ہے۔ اسی طرح اتّفاق کے معنی ایک دوسرے کی موافقت یعنی ایک ہی طرف منھ کر کے کھڑے ہونا۔ اور جس طرح افتراق کے معنی الگ الگ ہونے کے ہیں اسی طرح اتّحاد کے معنی مل کر ایک ہو جانا ہے۔ اور جس طرح یہ ممکن ہے کہ اختلاف ہو لیکن افتراق نہ ہو یا افتراق ہو لیکن اختلاف نہ ہو اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ اتّفاق ہو لیکن اتّحاد نہ ہو یا اتّحاد ہو لیکن اتّفاق نہ ہو۔ جیسے ضدّین کہ انھیں متحد کیا جا سکتا ہے لیکن متّفق نہیں کیا جا سکتا۔ یا موافقین کہ انھیں متفرّق کیا جا سکتا ہے

Marfat.com

لیکن ایک دوسرے سے مختلف نہیں کیا جا سکتا۔ یا جیسے لوہے اور چاندی کے بُرادے کو ملا کر ایک شیشی میں رکھ دیں تو دونوں کے ذرّات ایک دوسرے سے متحد تو ہوں گے مگر متفق نہ ہوں گے اور مقناطیس کی سلاخ اُن میں ہلائی جائے گی تو لوہے کے ذرّات مختلف ہونے کی وجہ سے چاندی کے ذرّات سے الگ ہو کر مقناطیس سے چمٹ جائیں گے۔ اور چاندی کے ذرّات الگ ہو جائیں گے۔ یا جیسے پانی کے ذرّات کو بھاپ بنا کر فضا میں منتشر و متفرق کر دیا جائے لیکن انھیں مختلف نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ہمیں اتحاد و اتفاق کو معناً مترادف نہ سمجھنا چاہیئے۔

اللہ کی رسّی قرآن کی اس آیت میں "حبل اللہ" سے مراد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ساری اُمّت صرف رسول کی محبّت اور قرآن کی فرمانبرداری کے رشتے میں منسلک ہو کر ہی ملّتِ واحدہ بنی ہے اور اس کا تمام تر اتحاد و اتفاق اور واحدیّت صرف رسول کے نام پر ہے۔ جن لوگوں کے دل محبتِ رسول کے رشتے میں بندھے ہوئے نہیں ہیں اُن میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت کا پایا جانا مشکل ہے۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ متحد و متفق نہیں ہیں اور نفاق و افتراق میں مبتلا ہیں انھیں رسولؐ کی محبّت کا دامن ہاتھ نہیں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی رسّی کو مضبوط پکڑنے یعنی اسی محبت میں بندھ جانے کا حکم دیتا ہے اور افتراق یعنی کٹ کر الگ ہو جانے کی ممانعت فرماتا ہے۔

جمعیت اسی آیتِ مبارکہ میں لفظ "جمیعاً" بھی ہے (یعنی سب کے سب) یہ جمعیت اور کلیت کے معنی دے رہا ہے۔ جمعیت و کلیّت میں جو طاقت ہے وہ انفرادیت اور جزئیّت میں نہیں ہے۔ جمعیت کی طاقت کو واضح کرنے کے لیے حدیث میں یَدُ اللہِ عَلَی الجَمَاعَۃِ آیا ہے (یعنی جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے) ید اللہ کے معنی دستِ قدرت یعنی طاقتِ الٰہیہ۔ جب افراد مل کر ایک جماعت بن جاتے ہیں تو اس جماعت کو خدائی طاقت

Marfat.com

حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جس جماعۃ کو خدائی طاقت حاصل ہو اُس پر کون غالب آسکتا ہے۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔ اور مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک رسولؐ کا دامن مضبوط نہ پکڑ لے ـــــ اس طرح جو قوم کمزوری، پس ماندگی اور مغلوبیت میں مبتلا ہے، سمجھنا چاہیے کہ خدا کی طاقت اُسے حاصل نہیں ہے۔ اور خدائی طاقت اس لیے حاصل نہیں ہے کہ اُس نے اللہ کی رسی کو پکڑ کر جمعیت حاصل نہیں کی ہے۔ پس اجتماعی خرابیوں کے تمام تر ذمّہ دار اس کے افراد ہوتے ہیں جو نفسانیت، عصبیت اور جہالت میں مبتلا ہو کر پوری قوم کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔

بوڑھے کی نصیحت ایک ضعیف العمر بوڑھا انسان جو دس لڑکوں کا باپ تھا، جب نزع کے قریب پہنچا تو اپنے لڑکوں کو بلا کر حکم دیا کہ ہر ایک، ایک ایک نازک شاخ درخت لائے۔ جب وہ لکڑیاں لائے تو حکم دیا کہ ان کو ایک رسّی سے کس کر باندھ دو۔ لکڑیاں باندھ دی گئیں تو ایک ایک کو حکم دیا توڑ دو! کوئی بھی ان میں سے نہ توڑ سکا۔ اور سب نے اقرار کیا کہ ہم اسے نہیں توڑ سکتے۔ پھر حکم دیا، اب رسّی کو کھول دو۔ جب لکڑیاں کھول دی گئیں تو انھیں حکم دیا۔ اب تم ایک ایک لکڑی کو لے کر توڑ دو۔ ہر ایک نے ایک ایک لکڑی لے کر توڑ دی۔ باپ نے پوچھا "کیا بات ہے"، تم بھی دس ہو اور لکڑیاں بھی دس ہیں۔ تم دس آدمی دس لکڑیوں کو پہلے کیوں نہ توڑ سکے تھے۔ اور اب کیسے تم دس آدمیوں نے دس لکڑیوں کو توڑ دیا۔ دیکھو، پہلے دس لکڑیاں مل کر ایک طاقت بن گئی تھیں اور تم انھیں نہیں توڑ سکے تھے۔ لیکن جب اُنھیں الگ الگ کر دیا تو کتنی آسانی سے تم نے دسوں لکڑیوں کو توڑ ڈالا۔ اسی طرح میرے بچو، اگر تم دس بھائی آپس میں متحد اور متفق ہو کر زندگی گزارو گے تو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ اور اگر تم ایک دوسرے سے الگ

Marfat.com

ہو گئے تو آسانی کے ساتھ توڑ دیے جاؤ گے اور تمہارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اُس ضعیف آدمی نے خود یہ سبق کہاں سے سیکھا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو اتحاد کی تعلیم و تربیت فرمائی ہے۔

اَوس و خزرج جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لائے، اُس وقت مدینہ منورہ میں یہودی اور نصرانی قومیں آباد تھیں۔ یہودیوں میں دو قبیلے اَوس و خزرج جو آپس میں دشمنی رکھتے تھے مشہور تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور نقصان پہنچاتے رہتے تھے۔ لیکن جب اِن دونوں قبیلوں کے آدمی مسلمان ہو گئے تو اسلامی تعلیمات کے مطابق آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے لگے۔ اِدھر منافقوں اور غیر مسلموں نے سوچنا شروع کیا کہ اِن مسلمانوں کے درمیان کیونکر نفاق افتراق اور فتنہ و فساد پیدا کریں۔ اُن میں سے کسی شاعر نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ کیونکہ اس وقت کی شاعری ایسے ہی تخریبی امورات انجام دینے کے کام آتی تھی۔ اُس شاعر نے ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں اَوس و خزرج کی پرانی دشمنی اور اُن کے جدال و قتال کا ذکر کیا۔ وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر ایسے اشعار پڑھتا جس میں اَوس کی تعریف اور خزرج کی ہجو ہوتی۔ اور دوسری جگہ ایسے اشعار سناتا جس میں خزرج کی تعریف اور اَوس کی ہجو ہوتی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ نومسلم اوسی اور خزرجی آپس میں برافروختہ ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اتر آئے۔ قریب تھا کہ ایک دوسرے پر حملہ کر دیں کہ حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو خبر ہوئی کہ اوس و خزرج سے تعلق رکھنے والے مسلمان آمادۂ پیکار ہو گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنتے ہی کہ مسلمان آمادۂ فساد ہیں اسی طرح کمبلی اوڑھے ہوئے تشریف لائے اور تیز تیز چلنے لگے، اس طرح کہ کمبلی کا ایک کونا زمین سے چھو رہا تھا۔ لوگوں نے جو حضورؐ کو

Marfat.com

اِس حالت میں دیکھا، حیرت کے ساتھ ہمراہ ہوگئے۔ کیونکہ انھوں نے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح بلا تکلف اور بے اہتمام و انتظام جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں تشریف لے جانا چاہتے تو پہلے مناسب طریقہ پر تیار ہو جاتے اور آئینے میں اپنا عکس جمال ملاحظہ فرماتے۔ اگر آئینہ نہ ہوتا تو کنوئیں پر کھڑے ہو کر پانی میں عکس مبارک دیکھتے۔ لیکن آج اس طرح بغیر آراستگی کے حضورؐ کو دیکھ کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا اور بہت آدمی آپ کے ساتھ اُس مقام پر پہنچے جہاں یہ دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے ہی والے تھے۔ حضورؐ نے پہنچتے ہی بلند آواز میں فرمایا "مسلمانو، تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ ابھی میں تمھارے درمیان موجود ہوں اور تم ایک دوسرے کو دشمنی کی نظر سے دیکھتے ہو۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ تمھارے پُرانے قضیے قصے ختم ہو گئے اور تم مسلمان ہو کر آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ہو۔ تمھیں کس نے بہکا دیا؟ تم شیطان کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ کی رسّی کو ہاتھوں سے نہ چھوڑو۔ آؤ ایک دوسرے کے گلے مل کر ایک ہو جاؤ۔ تم سب بھائی بھائی ہو۔ برادری کا حق ادا کرو، اللہ تعالیٰ تمھیں طاقت اور غلبہ عطا فرمائے گا۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی آواز میں یہ دل نشین ہو جانے والی تقریر سُن کر دونوں مؤدّب ہو گئے، دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنی اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

توحید نظر اور توحید عمل توحید کے معنی ایک کرنا، ایک ہونا اور ایک رکھنا ہے۔ موحّد اُسے کہتے ہیں جو سب کو ملا کر ایک کر دے، سب کے ساتھ مل کر ایک ہو جائے اور ہمیشہ ایک کو ایک رکھے دو نہ ہو جانے دے۔ اور اسلام نے سب سے پہلا سبق توحید کا دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان وحدتِ نظر (یعنی ایک اعتقاد ایک خیال اور ایک تفکر) یا وحدتِ عمل (یعنی ایک ساتھ اور یکساں کام کرنے) کی طرف راغب ہو تو موحّد

Marfat.com

کیے جانے کا مستحق نہ ہوگا۔ اسلام نے مسلمانوں میں وحدتِ نظر قائم کرنے کیلیے "کلمۂ توحید" اور "ایمانِ مفصل" کی تعلیم دی۔ اور وحدتِ عمل کے لیے چار ارکانِ اسلام (نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ) مقرر کرکے، مرکزیت کے پیشِ نظر زمین کے چپے چپے پر مسجدیں بنائیں۔ اور اُن کو خدا کے گھر سے نسبت دے کر مکانیت میں اُن کا مرتبہ بلند فرمایا۔ اور ان کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے بتا دیا کہ جس کی زندگی مسجد سے متعلق ہے وہ دنیا ہی میں جنت کا مکین ہے۔ کہیں فرمایا کہ جنتی کی پہچان یہ ہے کہ اس کا تصور، تخیل اور توہم ہمہ اوقات مسجد کے طواف میں مصروف و مشغول رہتا ہے۔

مسجد کا احترام مسجد درحقیقت ایک ایسا مؤسسہ ہے جس پر ہر کلمہ گو یکساں حق حاصل ہے۔ لیکن مسجد پر وہی اپنا حق ثابت کرسکتا ہے جو مسجد کی اہمیت اور اُس کے احترام سے آگاہ اور واقف ہو۔ ہم اپنے زمانے کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں جو مسجد کے احترام اور اُس کی رفعت سے قطعاً آگاہ نہیں ہیں۔۔۔ جب وہ کسی کمشنر یا اعلیٰ افسر کے بنگلے پر جاتے ہیں تو وہاں نہ اُن کی آہٹ پیدا ہوتی ہے، نہ کھانسی اور چھینک آتی ہے۔ نہ تھوک واقع ہوتا ہے، نہ بلند آواز سے کلام کرتے ہیں۔۔۔ لیکن وہی جب مسجد میں آتے ہیں تو ہر بات کیلیے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔۔۔ ہر بات پر اعتراض، بلند آواز سے کلام، بحث و مباحثہ، دنیا کی فضول باتیں، ایک دوسرے کی غیبت، سیاسی جوڑ توڑ، گروہ بندیوں اور فرقہ پردازیوں میں مصروف اور منہمک رہتے ہیں۔ کیا یہی مسجد کا احترام ہے؟ کیا وہ اپنے کو خدا کے گھر میں اور خود کو خدا کے حضور میں حاضر سمجھتے ہیں؟ معاذ اللہ! وہ خدا کے گھر میں آکر بھی خدا سے کس قدر دور ہوتے ہیں۔۔۔ یاد رہے، اگر ہم یہاں کسی معزز کی توہین کرتے ہیں تو وہ ہتکِ عزت کا دعوےٰ کر دیتا ہے۔۔۔ اسی طرح، اگر ہم مسجد کی توہین کریں گے تو قیامت میں یہ مسجدیں متشکل و متصور ہو کر خدا کے حضور ہمارے اوپر اپنی عزت کا دعویٰ کریں گی اور ہم وہاں ان کے سامنے کس قدر شرمندہ ہوں گے۔

Marfat.com

مساجد میں وحدتِ عمل مساجد میں نماز باجماعت کا طریقہ مقرر کر کے ہمیں وحدتِ عمل کی تعلیم دی گئی ہے ۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس جماعت سے نماز پڑھ لی تو ہمارے وحدتِ عمل کا کام پورا ہو گیا ۔ نہیں ، نماز جماعت تو ہمیں وحدتِ عمل کا طریقہ بتانے کیلیے ایک مثال پیش کرتی ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح ہم ایک امام کی اقتدا میں متحد و متفق ہو کر وحدتِ عمل اختیار کرتے ہیں اسی طرح اپنی زندگی کے ہر کام میں ایک پیشرو یا امیر و رہنما بنا کر سب سب اُس کے ساتھ وحدتِ عمل اختیار کریں ۔ اور اس کی اس درجہ اہمیت ظاہر کی گئی کہ جس طرح دو یا تین یا زیادہ آدمیوں میں ایک امام اور باقی فرد یا افراد مقتدی ہوتے ہیں اسی طرح اگر تین آدمی سفر کریں تو ایک کو اپنا امیرِ سفر بنائیں اور دو اُس کے حکم کے ماتحت سفر پورا کریں ۔ غرض ہر کام میں وحدتِ عمل ، یہ اسلام کی سنہری تعلیم ہے ۔ جب کسی مسلمان کو دیکھیں کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے ، اور ہم آسانی سے اُس کی نیکی میں شریک ہو سکتے ہیں تو فوراً شریک ہو جائیں ۔ ہماری شرکت سے اس نیک کام کی اعانت اور ترقی ہو گی ۔ اگر ہم کسی نیک کام میں ، طاقت ، قدرت ، فرصت ، استطاعت اور وقت و دولت رکھتے ہوئے ، شرکت سے گریز کریں گے تو گناہگار ہوں گے کیونکہ اللہ تعالےٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہو گی ۔ جیسا کہ فرمایا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں اعانت کرو ۔) ہاں ، اگر کوئی عذر ہے اور ہم اس نیکی میں کسی وجہ سے شرکت نہیں کر سکتے ہیں تو زبان سے جو کچھ ہو سکے اس کی اعانت کریں ۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں نیکی اور بھلائی کو نیکی اور بھلائی سمجھیں ۔ یہ بھی ایک خیالی شرکت ہو گی ۔ اور اگر بالکل مجبور ہوں ، اور کچھ بھی نہ کر سکیں اور عذر معقول ہو تو اللہ تعالےٰ عذر کو قبول فرماتا ہے ، اُس پر کوئی گناہ نہ ہو گا ۔

حبل اللہ اس جمعیت کی رسّی کو اللہ تعالےٰ نے " حبل اللہ " یعنی اپنی رسّی کیوں کہا ؟ اسلام کی رسّی ، شریعت کی رسّی یا اتحاد و اتفاق کی رسّی کہا جا سکتا تھا اور اس کے بھی یہی

Marfat.com

معنی ہوتے ــــ اس رسّی کو حبل اللہ اس لیے کہا کہ اس کا دوسرا سرا خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ جو جماعت اس رسّی کو اخلاص واتحاد واتفاق سے پکڑ لیتی ہے اُسے طاقت یداللّٰہی حاصل ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ کنوئیں میں گر جائیں اور کوئی اُن کو نکالنے کو رسّی کنوئیں میں ڈال دے تو وہی لوگ اس کنوئیں سے نکلنے میں کامیاب ہوں گے جنھوں نے اس رسّی کو مضبوط پکڑ لیا ہوگا۔ اسی طرح نفاق وافتراق معاشرتی زندگی کا جس میں ایک دوسرے سے کٹ کر زندگی بسر کرنے والی ہستیاں منھ کے بل گر پڑتی ہیں اور اُن کی زندگی دشوار ہو جاتی ہے کمزوریاں، مایوسیاں اور کس مپرسیاں ان کو گھیر لیتی ہیں۔ اب جب تک وہ اتحاد واتفاق کے ساتھ اسی رسّی کو نہ پکڑ لیں، زندگی کے وسیع میدان میں واپس نہیں آسکتے۔

رحمتِ خداوندی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں دو قسم کی ہیں، ایک وہ ہیں جو صفتِ رحمٰنیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ہر مخلوق کو خواہ وہ کسی فرد، جنس، فصل اور نوع کی قسم سے ہوں پہنچتی ہیں۔ اور اس میں کافر و مومن کی بھی کوئی تفریق نہیں ہے ــــ دوسری وہ رحمتیں ہیں جو صفتِ رحیمیت سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ صرف مومن اور صالح بندوں کیلیے بطریقِ جزائے عمل یہاں بھی ملتی ہیں اور قیامت میں بھی ملیں گی۔ یہ دونوں قسم کی رحمتیں ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہوتی ہیں اور ہر مخلوق پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنی متعلقہ رحمت کو پکڑ لے۔ نہیں پکڑے گا تو وہ رحمت اُس کے اوپر سے ہو کر گزر جائے گی۔ پکڑ لے گا تو رحمت و برکت سے مالا مال ہو جائے گا۔ "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" میں ان دونوں صفتوں کا ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر سورۂ فاتحہ میں بھی اِن دونوں کا ساتھ ذکر کیا گیا۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اسم رحمٰن میں اجتماعیت کلّی ہے اور اور رحیم میں اجتماعیتِ جزوی۔ یعنی صرف صالح مسلمانوں کے لیے۔ صفت رحمٰنیت ہی اس وقت

Marfat.com

رحمت حاصل ہوتی ہے جب اجتماعیت کلی میں شامل ہو جائے۔ اور صفتِ رحیمیت سے اُس وقت رحمت حاصل ہوتی ہے جب مسلمانوں کی جمعیت میں شامل ہو جائے۔ انفرادی طور پر صفتِ رحمانیت سے بعض رحمت حاصل ہو تو ہو، صفتِ رحیمیت سے کوئی رحمت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ مسلمان جمعیت کے ساتھ حبل اللہ کو مضبوط پکڑ لیں۔ جب یہ اللہ کی رسّی میں مضبوط بندھ جائیں گے تو "حزب اللہ" بن جائیں گے، اور غالب رہیں گے جیسا کہ فرمایا اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔

قرآن اور سنت اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمی خصوصیت کے ساتھ قرآن اور سنت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اگر مسلمان متحد و متفق ہو کر قرآن و سنت کے ذریعہ اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں نیچا نہیں دکھا سکتی۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کے دلوں میں بنی نوعِ انسان کے لیے عمومی محبت اور اخوان المسلمین کے ساتھ خصوصی محبت کا جذبہ پرورش پا چکا ہو۔

خلیفۃ اللہ فی الارض اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ خلیفہ اُسے کہتے ہیں جو مالک کے حکم، تبعیت اور اطاعت کے ذریعہ اپنے مالک کا پورا کام انجام دے سکے۔ جو کچھ مالک کر سکتا ہے وہ بھی کر سکے، جو کچھ مالک دے سکتا ہے وہ بھی دے سکے۔ لیکن عام بنی آدم اس عہدۂ خلافت تک نہیں پہنچتے۔ اور ہم نفاق اور افتراق کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ وہ طاقتیں جو ہماری منت کشِ احسان تھیں ہم پر غالب آ کر خلافت کی مدعی ہیں اور ہم اس قابل نہیں رہ گئے کہ اپنے جدِ آدمؑ کی خلافت کو سنبھال سکتے۔ اب اگر ہماری آنکھ کھل جائے اور ہم اندازہ کر سکیں کہ ہمیں اس وراثتِ آدمؑ کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہے، جو توحیدِ نظری اور توحیدِ عملی پر موقوف ہے، اور اس

Marfat.com

میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم وہی خلافتِ ارضی حاصل کرلیں گے جو اللہ تعالٰی نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ اور اگر دنیا میں ہم نے خلافتِ آدمؑ حاصل کرلی تو عقبیٰ میں بھی میراثِ آدم یعنی جنّت پر ہمارا حق ثابت ہو جائے گا۔

جمعیّتِ اعتقادی وہ بنیادی اعتقادات جو کلمہ طیبہ اور ایمانِ مفصل سے ان میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔ سب کے نزدیک ایک خدا، ایک رسول ایک کعبہ اور ایک اصول مسلّم ہے۔ جو کچھ اختلاف ہوتا ہے فروع میں ہوتا ہے۔ اور فروع کا اختلاف اصول و بنیاد پر ہرگز اثر انداز نہیں۔ اس لیے بنیادی امور میں سب مسلمان ایک ہو جائیں، سب کو ایک کرلیں اور ہمیشہ ایک رکھیں۔

جمعیّتِ عملی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ عمل کے لیے بنیادی ارکان ہیں۔ جملہ مسلمان ان سب کی ادائگی میں متحد و متفق رہیں۔ مسجدوں کو لغویات اور فضولیات سے پاک و صاف کرکے اپنی اجتماعیت کا مرکز بنادیں، جماعت سے نماز ادا کریں، متحد الایمان اور متفق الخیال ہوکر زکوٰۃ ادا کریں۔ متفقہ طور سے روزے رکھیں، اور بشرطِ استطاعت مجتمعاً حج کے لیے سفر اختیار کریں۔ اگر یہ جمعیّت آج بھی مسلمان حاصل کرلیں تو گئی ہوئی خلافت واپس لوٹ سکتی ہے۔ اور اللہ تعالٰی ہمیں دنیا اور دین دونوں جگہ سُرخرو فرماتا ہے۔

جمعیّتِ باطنی یہ تمام جمعیتیں جن کا ذکر کیا گیا ہماری باطنی جمعیّت پر منحصر ہے۔ جب تک ہمارے باطن کی جملہ طاقتیں جمعیت اختیار نہ کریں کوئی جمعیت حاصل نہیں ہوتی۔ اور باطنی جمعیت حاصل کرنے کا طریقہ صرف روحانی رہنماؤں سے حاصل کرنا ممکن ہے۔

جمعیّت کے آداب اکثر آپ کے سامنے آدابِ اسلام کو بیان کیا گیا ہے، اُن ہی آداب کو جمعیت میں بھی ملحوظِ خاطر رکھیں۔ نفسانیت، خودغرضی

Marfat.com

جاہ طلبی، منافع اندوزی وغیرہ کو جمعیت کے قریب نہ آنے دیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔ اگر اب بھی ہم نے متحد و متفق ہونے کا ارادہ نہ کیا تو دنیوی طاقت کے ساتھ ہماری روحانیت بھی غارت ہو جائے گی اور آخرت میں کفِ افسوس ملنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اللہ تبارک تعالیٰ جملہ مسلمانانِ عالم کو متحد و متفق ہو کر "اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑنے کی توفیق عطا فرمائے! اور زائل شدہ قوت و طاقت از سرِ نو ہمیں عطا کرے۔

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

Marfat.com

دور ۲
سائنس ۲۳

محبت اور عفو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

محبت کی تعریف محبت اُس جذب و کشش کا نام ہے جو دو متناسب اشیاء یا افراد کو ایک دوسرے سے متحد اور ایک کر دینے کے لیے درمیان رکاوٹوں سے جدوجہد کرتی ہے۔ جیسے لوہا اور مقناطیس باہم متناسب ہیں۔ مقناطیس کی جذب و کشش جو لوہے کے درمیانی فاصلہ کو دُور کر کے اپنے قریب کھینچ لیتی ہے، محبت کی پوری مثال ہے جس سے ہم محبت کی جذب و کشش کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔

متناسبین ایسی دو چیزوں کو متناسبین کہتے ہیں جن کے ظاہر و باطن یا خواص و اثرات میں یکسانیت پائی جائے۔ جیسے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور کلمہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں ظاہر، باطن، خواص اور اثرات کی پوری پوری یکسانیت موجود ہے۔ مثلاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی ظاہری مناسبت میں ــــ ل۔ا۔ا۔ل۔ا۔ہ۔ا۔ل۔ل۔ا۔ا۔ل۔ل۔ا۔ہ = ۱۵ حروف ہیں۔ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں بھی ــــ م۔ح۔م۔م۔د۔ر۔ر۔س۔و۔ل۔ا۔ل۔ل۔ا۔ہ = ۱۵ حروف ہیں۔ پہلے کلمہ میں سب حروف بے نقطہ ہیں تو دوسرے کلمہ میں بھی تمام حروف بے نقطہ ہیں ــــ باطنی مناسبت

Marfat.com

میں جو معنوی نسبت توحید کو رسالت سے ہے وہی نسبت کلمۂ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے ہے۔ اثرات و خواص کی مناسبت یہ کہ جس طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ شرک کی ظلمت سے نکال کر توحید کی نورانی فضا میں پہنچا دیتا ہے اسی طرح کلمۂ رسالت (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ) کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشن دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح ان دونوں کلموں میں ظاہر، باطن اور خواص و اثرات کی یکساں مناسبت پائی جاتی ہے۔

متناسبین میں جذب و کشش لازمی ہے

اگر دو چیزیں آپس میں متناسب ہوتی ہیں تو اُن کی مناسبت ایک دوسرے کی قربت کی متقاضی ہوتی ہے اور یہی تقاضائے قربت جذب و انجذاب کا وہ اولین مرتبہ ہے جو درمیان کے بُعد و فاصلہ کو دُور کرنے کے لیے حرکت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ جذب و کشش جس درجہ آگے بڑھتی ہے نسبت کی ترقی کے مراتب ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔

محبت کے مراتب

محبت کے پانچ مراتب ہیں۔ مناسبت، انسیت، محبت، عشق اور فنا۔ یہ پانچوں مراتب یکے بعد دیگرے بالترتیب واقع ہوتے ہیں ایک ساتھ یا خلافِ ترتیب واقع نہیں ہوتے۔ مثلاً دو متناسب اشیاء میں مناسبت تو لازم ہوگی، لیکن باقی مراتب کا بالفعل پایا جانا لازم نہ ہوگا جب تک پہلے مرتبے سے ترقی کر کے دوسرے مرتبے پر نہ پہنچ جائیں ـــ محبت کی ترقی کے اسباب میں ناکامی کو بہت بڑا دخل ہے۔ یعنی انسان محبت کے جس مرتبے پر کامیاب ہو جاتا ہے (وصل حاصل کرتا ہے) ہمیشہ اسی مرتبے پر رہتا ہے آگے ترقی نہیں کر سکتا۔ یعنی اگر مرتبۂ انسیت میں کامیاب ہو گیا تو ہمیشہ اس کا وہی مقام رہے گا اور وہ محبت، عشق اور فنا تک نہ پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر انسیت میں ناکام رہا تو محبت تک پہنچے گا۔ محبت ناکام ہوگی تو عشق ہوگا اور عشق ناکام ہوگا تو فنائیت حاصل ہوگی۔ اور

Marfat.com

فنا روہ کمالِ محبت ہے جو وصالِ حقیقی تک پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ ایسا وصال ہے جسے کبھی بُعد و فراق نہیں۔ وہ محبوب میں فنا ہو اُس کی بقا حاصل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت

اللہ تعالیٰ کی محبّت دو قسم پر ہے ایک بالواسطہ اور دوسری بلاواسطہ۔ مخلوقاتِ عالم میں سے ہر مخلوق کو اللہ تعالےٰ کی محبّت ہے۔ اس لیے ہر مخلوق فطری اور طبعی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ یہ تسبیح کرنا اللہ تعالیٰ کی محبّت کی دلیل ہے۔ اس فطری تسبیح میں اجرامِ فلکی، عناصر، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان، جنّات، ملائکہ اور ارواح میں کوئی فرق نہیں سب یکساں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالےٰ سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک بھی مخلوق کی محبّت بلاواسطہ نہیں۔ چونکہ ان کی تخلیق ہی بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ، نورِ محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی ہے اس لیے ان کی محبت بھی بالواسطہ نورِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلم ہوگی۔ اللہ تعالےٰ کی بلاواسطہ محبّت صرف ایک ذات نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق بلاواسطہ اللہ تعالےٰ کے نور سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے کلام پاک میں اپنی محبت اور رسولؐ کی اتباع کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا۔

اتباع، اطاعت، محبّت اور عبادت

اتباع کے معنی پیروی کرنا، اطاعت کے معنی حکم ماننا اور عبادت کے معنی پرستش کرنا ہے اگرچہ بظاہر ان الفاظ کے معنی میں اختلاف ہے، لیکن حقیقۃً کوئی اختلاف نہیں ہے، صرف محلِ استعمال کے اعتبار سے اختلاف واقع ہوا ہے۔ کیونکہ یہ معنی جب اللہ تعالےٰ سے متعلق ہوتے

Marfat.com

ہیں تو عبادت کہلاتے ہیں۔ رسولؐ سے متعلق ہوتے ہیں تو اطاعت و اتباع کہلاتے ہیں۔ اور مرشد و رہنما سے متعلق ہوتے ہیں تو پیروی و فرمانبرداری کہلاتے ہیں۔ اور ان تمام معانی کا دار و مدار یا امیدِ نفع پر ہوتا ہے یا محبت پر۔ یہ معانی جب امید نفع پر قائم ہوتے ہیں تو محبت نہیں ہوتی اور جب محبت پر قائم ہوتے ہیں تو نفع کا خیال مفقود ہو جاتا ہے۔

اطاعت بہ امید نفع یہ وہ اطاعت ہے جو کسی فائدہ، نفع یا آرام کے مقصد پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسی اطاعت، عبادت اور اتباع صرف بہ اعتبارِ ظاہر معنی پیدا کرتی ہے۔ ورنہ حقیقتاً وہ ملازمت، مزدوری یا تجارت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی عبادت و اطاعت کا مرتبہ اس اطاعت و عبادت سے کمتر ہے جو محبت پر واقع ہو۔ ایسی عبادات کا صلہ دس دنیا میں اور ستر آخرت میں جو دیا جاتا ہے وہ انعام و اکرام و افضال کی صورت میں نہیں بلکہ اُجرت و مزد کی صورت میں ہوتا ہے۔

اطاعت بہ ذوقِ محبت یہ وہ اطاعت ہے جو کسی امید پر نہیں بلکہ صرف مُطاعِ حقیقی کو خوش کرنے اور اپنے جذبۂ اطاعت کو تسکین دینے کی غرض سے عمل میں آتی ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی وہ عبادت ہے جو ہر مخلوق کو فطرةً حاصل ہے جس کی بنا پر وہ اللہ کا ذکر اور اُس کی تسبیح کرتی ہے۔ لیکن یہ انسان جب اس عالمِ ہوا و ہوس میں تمناؤں اور آرزوؤں کا مقید ہو جاتا ہے تو لالچ خواہش اور امید ذوقِ محبت پر غالب آجاتی ہے، اور "عبادت و اطاعت" مزدوری یا تجارت بن کر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ نہ ہونے کے اعتبار سے یہ مزدوری بھی غنیمت ہے لیکن "اطاعت بہ ذوقِ محبت" کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اگر انسان خلوص حاصل کرے اور اپنی اطاعت و عبادت کو تمناؤں اور آرزوؤں سے پاک و صاف کر لے تو ذوقِ محبت میں کشش و انجذاب حاصل کرتا ہے جو اُسے مقامِ عرفان اور قرب

Marfat.com

خداوندی میں پہنچا دیتا ہے۔

محبّت و عرفان

محبت کو عرفان تک پہنچنے کے لیے چار مراحل پیش آتے ہیں۔ پہلا مقام محبّتِ علمی کا ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو محبوب کے صفاتِ حسن و جمال کے علم پر منحصر ہوتی ہے۔ دوسرے محبّتِ سمعی، اس میں محبوب کی آواز کانوں سے سنی جاتی ہے۔ تیسرے محبّتِ عینی، اس میں محبوب کا حسن و جمال نگاہِ بصارت یا نورِ بصیرت سے دیکھا جاتا ہے۔ اور چوتھے محبّت حقیقی جس میں قربِ محبوب حاصل ہوتا ہے۔ یہی مقامِ عرفان ہے جہاں محبوب کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

انسان اور معرفت

معرفتِ الٰہی کے لیے صرف انسان کو مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میدان میں کوئی بھی اس کا ہمسر اور شریک نہیں — معرفت اس عبدیت کا نتیجہ ہے جو خالص محبّت کی بنیاد پر واقع ہوتی ہے۔ اگرچہ عبادت میں جنّات، تحمید و تقدیس میں ملائکہ اور تسبیح میں کل موجودات مشترک ہیں۔ انسان ہر مرحلہ میں مذکورہ موجوداتِ نوری، ناری امری و خلقی سب کے ساتھ ہے، لیکن مقامِ معرفت بلا شرکتِ غیرے صرف انسان کا حصّہ ہے اسی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اگر یہ خصوصیت اس کو حاصل نہ ہو تو وہ اشرف کی بجائے ارذلِ موجودات ہوگا۔

محبّت و عبادت

محبّت کے لیے عبادت لازم ہے۔ جہاں محبّت ہوگی جذبۂ عبادت خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کو خوش اور راضی رکھے۔ اور محبوب صرف فرمانبرداری سے خوش ہوتا ہے۔ پس جس درجے کی محبت ہوتی ہے اُسی درجے کا جذبۂ عبادت ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی شدید ترین محبّت کو اپنے ہی لیے مخصوص کیا ہے۔ کیونکہ وہ غیور ہے

Marfat.com

اور اپنے ساتھ اپنا دوسرا ہمسر یا شریک پسند نہیں کرتا۔ اور چونکہ لازمۂ عبادت اظہارِ مذلّت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کسی مسلمان عارف کو کسی مرحلے میں ذلیل نہیں ہونے دیتا، بلکہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (تم ہی سب سے اعلیٰ و برتر ہو) فرما کر اپنے محبوں کی شان بڑھا دیتا ہے۔

تخلیق کائنات کی اصل بنیاد

چونکہ اللہ تعالےٰ نے کائنات کو بربنائے محبت معرفت پیدا کیا ہے، اس لیے ہر شے کی اصل بنیاد "محبت" ہے۔ جو چیز اپنی اصل محبت پر قائم ہے زندہ اور باقی ہے اور جو چیز اپنی بنیاد سے ہٹ گئی وہ ہلاکت اور خسران میں پڑ گئی۔ محبت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ عبادت و فرمانبرداری بجا لائے۔ عبادت و فرمانبرداری کا نتیجہ قربِ معبود ہے۔ اور یہی مقام قرب "مقام معرفت" ہے۔ یعنی انسان اس درجہ قریب ہو جاتا ہے کہ ذات و صفات کو بحد امکان پہچان لیتا ہے۔ اور یہی معرفت انسان کا مقصدِ تخلیق ہے۔

محبت میں زود رنجی اور درگزاشت

محبت دل سے تعلق رکھتی ہے۔ اور دل وہ آئینہ ہے جو عداوت اور محبت دونوں حالتوں میں مکدّر ہو سکتا ہے۔ عداوت میں نقصان یا تکلیف دہی کدورت کا باعث ہوتی ہے۔ اور محبت میں کبھی "حسنات" بھی گمان کی وجہ سے کدورت کا باعث ہوتے ہیں۔ اور جب یہ کدورت رفع ہوتی ہے تو محبت کئی درجہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے شارعِ اسلام نے ان کدورتوں کو تین دن سے زیادہ باقی رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ امام حسن اور امام حسین سلام اللہ علیہما بچپن کے زمانے میں ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور بول چال بند ہو گئی۔ تیسرے دن امام حسن علیہ السلام تشریف لائے اور خندہ پیشانی کے ساتھ حسین علیہ السلام کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا۔ "آج تیسرا دن ہے، کیا تمھیں یاد نہیں

Marfat.com

کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دلوں کی کدورت کو تین دن سے زیادہ باقی نہ رکھو۔ کیونکہ تین دن کے بعد کدورت ایمان کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے۔" حضرت حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ "جی ہاں' یہ بھی فرمایا تھا کہ جو شخص رفع کدورت میں پیش قدمی کرے گا وہ پہلے جنت میں جائے گا۔ اسی لیے میں رُکا رہا کہ آپ پیش قدمی فرمائیں اور مجھ سے پہلے جنت میں جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ تین دن سے زیادہ اس کدورت کو باقی نہ رکھیں گے۔" یہ ہے اسلامی اُخوت کی وہ مثال کہ دلوں کی کدورتیں بھی محبت اور ایثار کے جذبے سے خالی نہ تھیں۔

اسلامی محبت اسلام میں محبت ایسی ہے جیسی بدن میں جان۔ اگر بدن سے جان نکال لی جائے تو بدن مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اسلام سے محبت نکال لی جائے تو اسلام جسدِ بے جان ہو جائے گا۔ خدا کے ساتھ محبت، رسول کے ساتھ محبت، کتاب کے ساتھ محبت، فرشتوں کے ساتھ محبت، نیکی اور بھلائی کے ساتھ محبت، امت کے جملہ افراد کے ساتھ محبت، بنی نوعِ انسان کے ساتھ محبت، ہر جاندار کے ساتھ محبت بلکہ جملہ مخلوقاتِ عالم کے ساتھ محبت اسلام کی خاص تعلیم ہے۔ آپس کی محبت کے لیے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آپس میں جسمِ واحد کی مثال ہیں۔ اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ اگر کسی فردِ مسلم کے دل میں اس محبت کا فقدان ہو تو گویا وہ جسم سے کٹا ہوا عضو ہے جو گل سڑ کر خاک میں مل جائے گا۔

اظہارِ محبت اگرچہ محبت وہ نمایاں جذبہ ہے جس کو اظہار کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے اظہارِ محبت کو نیکی اور محاسن فرمایا ہے۔ بغیر اظہارِ محبت کے حسنِ اخلاق ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے

Marfat.com

عزیز، رشتہ دار، ہمسایہ، اہلِ محلہ، اہلِ مسجد، اہلِ وطن اور اہلِ اسلام کے ساتھ پُرخلوص محبت کا اظہار کیا جائے۔ سلام، مصافحہ، معانقہ اور پرسان حالی میں پیش قدمی کی جائے۔ دُکھ درد میں ہمدردی، راحت و مسرت میں تہنیت و تبریک قائم رکھی جائے۔ ایثار و قربانی پیش کرنے میں سبقت حاصل کی جائے۔ یہ وہ محاسن ہیں جن کو اسلام نے دُنیا میں سب سے پہلے اپنا اصول بنایا۔ اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرمائی۔

تاسیس خانقاہ ایک امیرِ شہر شکار کے لیے جنگل میں تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر اُس نے دیکھا ایک فقیر خرقہ پوش مشرق کی طرف سے آیا، اور دوسرا مغرب کی طرف سے آیا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو پہلے دونوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، پھر مصافحہ کیا، پھر دونوں بغل گیر ہو گئے، اور نہایت محبت و احترام اور خندہ پیشانی کے ساتھ قریب قریب بیٹھ گئے۔ دونوں نے اپنا اپنا کھانا نکالا۔ بڑی محبت کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اور پھر اسی طرح معانقہ، مصافحہ اور سلام کر کے رخصت ہوئے اور مخالف سمت چلنے لگے۔ امیر کو ان دونوں کا یہ اندازِ ملاقات بہت پسند آیا اُس نے سوچا یہ دونوں قریبی رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں، لیکن مخالف سمت سے آنا اور ایسی محبت و اخوت کا اظہار کر کے پھر مخالف سمت چلے جانا حیرت انگیز ہے۔ ایک خادم کے ذریعہ دونوں کو بلا کر پوچھا "آپ دونوں کے درمیان کیا رشتہ ہے اور کتنے عرصہ کے بعد آپس میں ملے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "ہم دونوں میں کوئی نسبی رشتہ داری نہیں، بلکہ صرف روحانی رشتہ ہے۔ یہ بھی فقیر ہیں میں بھی فقیر ہوں، یہی ہمارا رشتہ ہے۔" پھر پوچھا "تم دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہو؟" جواب دیا۔ "نہیں، ہم دونوں پہلی مرتبہ ملے ہیں، ہمارا جاننا پہچاننا دوسری طرح کا ہے، ہم ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھ کر پہچان لیتے ہیں۔ ہم دنیا میں کہیں رہیں ہماری روحیں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور جب سامنے آتی ہیں تو بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ

Marfat.com

ہم کون ہیں؟" امیرِ شہر کو اُن کی یہ اچھوتی محبت اور لطیف انداز ملاقات بہت پسند آیا۔ اُس نے پوچھا "تمھارا کوئی اجتماعی مرکز بھی ہے؟" انھوں نے جواب دیا۔ "نہیں، ہم سیّاح ہیں، ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں؟" آخر امیر نے یہ سوچ کر کہ ایسے با اخلاق سیّاحوں کے لیے ہر جگہ ایک ایسا مرکز ہونا چاہیئے جہاں یہ چلتے پھرتے مسافر قیام کریں اور ایک دوسرے کی ملاقات اور محبّت سے لطف اندوز ہوں، جگہ جگہ خانقاہیں بنوادیں اور یہ فقرا وہاں ٹھہرنے لگے۔

محبّت کی نگاہ عام نگاہوں سے ماورا ہوتی ہے

محبت کے لیے چشم پوشی اور درگزر لازم ہے۔ جب تک محبّت نکتہ چینی سے محفوظ نہ ہو محبّت کا قیام مشکل ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص میں عیوب اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو درگزر نہ کیا جائے تو یہی قاطعِ محبّت بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "بے عیب بھائی تلاش نہ کرو، ورنہ بغیر بھائی کے رہ جاؤ گے"۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ محبّت اور بھائی چارے میں عیوب اور کمزوریوں پر نظر نہ ڈالو۔ اگر کوئی کمزور بات سامنے آئے تو اُس سے اپنی نظر ہٹا کر اُس کے محاسن کی طرف پھیر دو، بس محبّت اور اخوت قائم رہے گی اور تم بھائی سے محروم نہ رہ جاؤ گے۔

دوستی کی نگاہ عیب بیں نہیں ہوتی

ایک مرید نے رخصت ہونے کے وقت حضرت ابراہیم ادہم قدس سرہٗ سے عرض کیا "خدمت کے دوران اگر مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو تو آپ معاف فرمائیں"۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا "میں نے کبھی عیب جوئی کی نگاہ سے تم کو نہیں دیکھا۔ ہمیشہ دوستی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ دوست کی نگاہ دوست میں صرف خوبیاں دیکھتی ہے۔ اور دوست کی خوبیوں میں اس درجہ محو ہوتی ہے کہ بُرائیوں کی طرف نظر اُٹھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور اگر فرصت ملے بھی تو عیب جُو نگاہ کہاں کہ دوست میں عیوب تلاش کرے۔

Marfat.com

جذبۂ عفو عفو ایک بڑی صفت خداوندی ہے جس بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صفت تفویض کی جاتی ہے وہ ایک ایسا پھول بن جاتا ہے جس میں کانٹا کہیں نام کو نہیں ہوتا اُس کی زندگی سراپا احسان بن جاتی ہے اور وہ اہلِ بصیرت کے نزدیک رُوح اور جان کی طرح عزیز ہو جاتا ہے۔ اس جذبہ کا مالک عذر خواہی کا منتظر نہیں رہتا بلکہ جو خطا جس وقت سامنے آتی ہے پس پشت ڈالتا ہے اور شرمندگی کا موقع تک نہیں آنے دیتا۔

عفو و کرم کی مثال حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام خوان میں کھانا لا رہا تھا، اتفاقاً پاؤں میں لغزش ہوئی، خوان ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، کھانا ضایع ہوا اور کچھ برتن ٹوٹ گئے۔

امام جعفر صادقؓ نے نگاہِ ترحم سے غلام کو دیکھا، غلام اپنی جگہ خوفزدہ تھا، اُس لرزتی ہوئی آواز سے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ؁ (غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے وہ محسنین ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے) حضرت امامؓ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو معاف کیا، بلکہ اُسی وقت کچھ رقم اُسے دی اور آزاد کر دیا۔ یہ خصوصی عفو و کرم صوفیائے کرام اور سالکینِ راہِ طریقت کا عظیم حصہ ہے۔ اور بغیر عفو و کرم سلوک آسان نہیں ہوتا۔ پس جو چاہتے ہیں کہ میرا دل اللہ کا گھر بن جائے وہ عفو و محبت کو اپنا شعار بنائیں کل مخلوق کو عیال اللہ اور مسلمانوں کو ایک جسمِ واحد سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت کرے گا اور محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔

اللہ کی محبت رسولؐ کے ساتھ محبت ایک فعل خداوندی ہے وہ اپنی مخلوق سے بے حد و بے نہایت محبت فرماتا ہے۔ اور چونکہ اولِ مخلوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اور بلا واسطہ آپؐ سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ محبت ہے جب اللہ حبیب ہے، تو رسولؐ محبوب اور رسولؐ حبیب ہیں تو اللہ محبوب ہوتا ہے۔

تقاضائے محبت محبت کا انوکھا، عجیب اور خاص تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ بھی حبیب کو ملتا ہے وہ محبوب کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ اور یہ تقاضا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے درمیان بہرحال اور بہر نوع کارفرما ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: انسان خواہ کسی مذہب و اصول کے ماتحت خدا تک پہنچے وہ قبول نہیں کرتا اور

Marfat.com

اپنے محبوب کی طرف رجوع کر کے فرماتا ہے وہاں جاؤ اور ان پر ایمان لاؤ، اُن کی اطاعت کرو، وہاں مقبول ہوئے تو یہاں بھی مقبول ہو گے۔ تم اُن سے محبت کرو گے تو میں تم سے محبت کروں گا۔ اور ملاحظہ فرمائیے جب رسول کے حضور میں پہنچے تو آپ فرماتے ہیں خدا پر ایمان لاؤ، اُس کی عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری بجا لاؤ۔ یہ ہے تقاضائے محبت کہ جو خدا کے پاس جاتا ہے وہ اُسے رسول کے پاس بھیج دیتا ہے اور جو رسول تک پہنچتا ہے وہ اُسے خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔

اللہ کی محبت بندوں کے ساتھ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ باقی جملہ مخلوق سے اللہ تعالیٰ کو بالواسطہ محبت ہے اور یہ واسطہ دو طریقے پر ہے۔ ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، کیونکہ ہر مخلوق اُن کے نور سے پیدا ہوئی ہے اس لیے آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق سے محبت فرماتا اور رحمانیت کے سایے میں لے لیتا ہے۔ اور دوسرا واسطہ نیک اعمال کا ہے جب کوئی بندہ توبہ کرتا اور پاکیزگی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ جو برے اور بھلے کے درمیان بلا رورعایت عدل و انصاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ جو زندگی کی مشکلات پر شکایت سے بچ کر صبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔ جو منع و عطا پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ۔ جو عبادت فرمانبرداری اور اخوت و محبت میں حقِ احسان ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ غرض اِن اعمال کے واسطے سے اللہ تعالیٰ بندوں سے محبت فرماتا ہے۔ لیکن یہ قسم محبت بھی رسول کے واسطے اور اتباع پر منحصر ہے۔ اگر رسول کا واسطہ درمیان میں نہ ہو اور اپنے اپنے طریق پر یہ اعمال اختیار کیے جائیں تو محنت بیکار اور سعی لاحاصل ہو جاتی ہے۔

وَصَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

Marfat.com

دور ۲
ساغر ۲۴

فضائلِ انسانی اور معراجِ انسانیت

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی کَفٰی وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصۡطَفٰی

مجاہدہ کی نسبت صحبت کی فضیلت اہل اللہ کی صحبت میں ایک ساعت مجاہدہ کے کئی چلّوں سے افضل ہے۔ کیونکہ صحبت میں نفس کی حصّہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کو کامل بزرگوں کی صحبت میسّر نہ ہو تو حدیثِ نفس سے بچنے کے لیے درود شریف یا ذکر نفی و اثبات میں مشغول رہنا چاہیئے۔ کیونکہ حدیثِ نفس ہی غفلت و انتشار کا باعث ہوتی ہے۔

ذکر کے اثرات اگر سالکانِ راہ کو صحبتِ شیخ میسّر نہ ہو تو وہ اُس کے بتائے ہوئے طریقہ سے ذکر کو جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ ذکر اُن کے قوئ و احساسات پر غالب آ جائے اور اُن کا باطن "مذکور" کے سوا تمام کیفیاتِ ماخوذہ حسّی و علمی سے خالی ہو جائے اور ذہن و حافظہ پر وہ ..... نسیان مسلّط ہو جائے کہ اگر بتکلّف بھی کوئی چیز یاد دلائی جائے تو نہ یاد آئے اور نہ پہچان سکے۔

ذکر سے نتائج حاصل کرنے کی شرائط جب تک چار شرطیں پوری نہ ہوں ذکر سے نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاقیات۔ اگر ان شرائطِ صحیحہ کے ساتھ ذکر دوام حاصل کیا جائے تو اس کے اثرات و نتائج اس طرح حاصل ہوتے ہیں جیسے زمین سے پانی کا چشمہ اُبلتا ہے۔

Marfat.com

طریقت کی انتہا فنا پر ہے
جب ذکر کے اثرات سے دوست و دشمن، یار و اغیار کا شعور تک باقی نہیں رہ جاتا تو اس حالت کو فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں مقاماتِ طریقت، جن کو اصطلاحِ تصوف میں مقامِ نفی یا سیر الی اللہ کہتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔

مقامِ اثبات یا بقا و ولایت
فنا کے بعد مقامِ بقا میں سیر شروع ہوتی ہے جس کو سیر فی اللہ بھی کہتے ہیں یہی مقامِ اثبات، ولایت کا اعلیٰ مرتبہ اور موطنِ حقیقت۔ اسی طریقت و حقیقت پر جو مقاماتِ فنا و بقا ہیں ولایت کا نام صادق آتا ہے۔

نفسِ مطمئنہ
حصولِ ولایت کے بعد نفس "مطمئنہ" ہو جاتا ہے۔ اور انکارِ حقیقت سے جسے کفر کہتے ہیں، نکل کر تصدیقِ حقیقت میں مطمئن اور مقامِ راضیۃً مرضیۃ پر پہنچ کر مسرور ہو جاتا ہے۔

مقامِ رضا
مقامِ رضا کے دو مرتبے ہیں۔ ایک رضائے بندگی اور دوسرا رضائے عاشقی۔ رضائے بندگی میں بندہ اپنے مولا کی رضا پر صبر کے ساتھ راضی ہوتا ہے۔ اور رضائے عاشقی میں محبوب کی رضا پر ذوق اور لذت کے ساتھ راضی ہوتا ہے۔ چونکہ یہ محبوب کے ہر فعل سے لذت اٹھاتا ہے اس لیے یہ مرتبہ بدرجہا افضل و برتر ہوتا ہے۔

فقیر
فقیر وہ ہے جس کے پاس اپنی ملکیت میں کوئی چیز نہ ہو۔ اور غنی ... وہ ہے جو ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر متصرف ہو۔ یہ صفتِ غنا رب تعالیٰ شانہٗ کیلیے مخصوص ہے۔ اس کے مقابل فقر ہے جو عبدیت اور بشریت کا کمال ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام نے فقر کو پسند کیا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسی پر فخر کیا ہے کہ فرمایا "الفقر فخری" حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کیا۔ "اے میرے رب! میں ان تمام نعمتوں کا فقیر ہوں جو تو مجھے عطا کرے گا۔"

زینتِ دنیا
خداوند تعالیٰ نے آسمان زمین چاند سورج ستارے، جمادات، نباتات حیوانات محض انسان کے ذریعۂ معیشت، وسائلِ معرفت اور کمالِ انسانیت کیلیے بنایا۔

Marfat.com

اور جملہ ادیان میں اسلام کو سنگ میل یا برج نور کا مرتبہ دیا، تاکہ رہروانِ طریق انسانیت اس کی روشنی میں ضلالت اور گمراہی سے بچ کر اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ جائیں۔ اب یہ بنی آدم کا کام ہے کہ اسلام کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو جانچے اور اس کے اصولی محسنات سے واقف ہو کر ان پر عمل کرے تاکہ ہر میدان میں کامیاب و بامراد ہو جائے۔

اسلام کے چند سیدھے سادے محسنات

اسلام کے اس بڑے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہر صبح مؤذن کے ایمان آفریں کلمات سے پیغام بیداری لاتا، اور دن میں چار مرتبہ ان کا اعادہ کر کے ازالۂ غفلت کی کوشش کرتا ہے۔ ہر جمعہ میں خطیب انسانیت کو فروغ دینے اور بنی آدم کو معراجِ انسانیت پر پہنچانے کی ہدایتیں کرتا ہے۔ ہر عید میں انسانوں کو اخوت و مساوات اور آزادی و حریت کے میدان میں بغل گیر ہونے کا موقع دیتا اور پیغامِ رحمت پہنچا کر انسانوں کی خوش حالی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ہر سال مسلمانوں کو اکنافِ عالم سے ایک مقدس مرکز میں جمع کر کے ہمدردی معاونت خوش اخلاقی اور حسنِ معاشرت کا سبق دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے متعارف کر کے اجتماعی طریقہ پر خدائے وحدہٗ لاشریک کے دربارِ عظمت میں اپنی اور کل بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور امن و خوش حالی کی استدعا کرتا ہے، انسان کو بندگی اور مناجات کا طریقہ سکھاتا ہے۔ تاکہ انسان خدا سے ہم کلام ہو کر عفو و درگزر اور رحمت و مکرمت حاصل کرے۔ اسلام دنیا میں انسانوں کے درمیان امن و آزادی، مساوات و اخوت، تعاون خیر و استیصالِ شر کا صحیح طریقہ بتا کر پیروانِ امت کو نیکی کا علمبردار اور سلامتی کا منادی بنا دیتا ہے۔ اسلام اُن تمام امورات کا طرفدار ہے جو بقائے انسانیت کے حامل ہیں اور ان امورات کا مخالف و مانع ہے جو نوعِ انسان کی انفرادی، اجتماعی، جسمانی، روحانی یا دنیوی و اخروی اقدار کے لیے مضرت رساں یا مانعِ ترقی ہیں۔

Marfat.com

علمائے اسلام کی ذمہ داریاں

اگر ہم اپنے زمانے کے علمائے اسلام کی زندگیوں پر گہری نظر ڈالیں تو ہمیں اُن کی مجالس، محافل اور اجتماعات میں صرف اختلافی مسائل اور فروعی مناقشات کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ علماء اور عوام النّاس عرصہ دراز سے مشاہداتی تجربہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ ان فروعی اور اختلافی مسائل میں وقت ضایع کرکے انسانی تہذیب و معاشرت یا اسلامی اعتقادات و معاملات میں کسی نوع کا فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ اور قیامت تک کسی فائدے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ پس ایسی صورت میں کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان تمام مباحثہ، مناظرہ اور مناقشہ کو بالائے طاق رکھ کر ایمانیات و روحانیات کے ساتھ عوام کو فروغِ تجارت و دستکاری، تنظیم معاشرہ و معاشیات، اصلاحِ تعلقات و اخلاقیات اور حسناتِ اخوت و مساوات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اُسوۂ رسول صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو سختی کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ اور جو کچھ رسول صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ میں پایا ہی نہیں جاتا (جیسے مناظرہ و مشاجرہ وغیرہ) اسے قطعاً ترک کر دیا جائے۔ اگر علماء اور رہنمایانِ قوم اپنے کردار و اعمال کا جائزہ لیں تو انھیں صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ بحث و مباحثہ اور طعن و تنفر اسوۂ رسول کے کسی گوشے میں بھی نظر نہ آئے گا۔ رسول صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے تو اپنی پاکیزہ زندگی کی ایک ایک ساعت عام انسانیت کی اصلاح، تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور امّتِ مرحومہ کے اتحاد و اتّفاق کے لیے وقف کر دی تھی۔ حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے غیر قوموں کے ساتھ حلم و بردباری اور عفو و رواداری کا بے مثال مظاہرہ فرما کر امّت کو اعلیٰ کردار کا اچھوتا سبق دیا تھا۔ کیا یہ ہمارے علماء کی اہم ترین ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ آپس کے افتراق و فساد کو جڑ سے اُکھاڑ کر قوم کو حلم و بردباری اور اخوت و موانست سکھلانے کے لیے آپس میں اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں۔ اور ہر فرقہ اور ہر گروہ کے تمام علماء متحد ہو کر وہ جمعیت حاصل کریں جس سے وہی خدائی طاقت انھیں واپس مل جائے

Marfat.com

جو اُن سے چھینی جا چکی ہے۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب دلوں کو اخلاص سے مزین کر لیا جائے۔ لیکن افسوس وہ زندگیوں کی نامرادیوں سے ڈر کر اپنے اوچھے وقار کو اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھیں ایک دوسرے کے سامنے جھک جانے سے شرم آتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی تعلیم کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے، اور ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جائے جس سے طلبا، اسوۂ رسول کے اخلاقی سانچے میں ڈھل کر نکلیں اور ضرورت زمانہ کے مطابق ہوں تاکہ موجودہ معاشرے کی فلاکت و افلاس اور نفاق و افتراق سے جہاد کر سکیں۔ اگر علما خود اپنی اصلاح کر سکے تو عوام خود بخود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔ کیونکہ وہ علما، کی پیروی کرنے کے عادی ہیں۔ وہ علما، کو آپس میں دست و گریبان دیکھتے ہیں تو خود بھی ایک دوسرے سے اُلجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب علما، کو حلیم و بردبار، آپس میں ملنسار و اخوت شعار پائیں گے تو خود بھی ویسے ہی بن کر رہ جائیں گے۔ کیا روحانیت و مذہب کے طرفدار علما پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ نوجوان اور تعلیم جدید سے آراستہ طبقہ کو اپنی نفرت سے دُور ہٹانے کی بجائے، مذہب سے روشناس کرنے کیلیے، قریب تر ہو جائیں اور بیگانگی کے پردے کو درمیان سے ہٹا کر اس طرح گھل مل جائیں کہ منھم اور منّا کا فرق ہی باقی نہ رہ جائے۔ نیز علما پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ صرف قال اللہ اور قال الرسول میں منجمد ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ ان کے ہدایات و مقاصد کی روشنی میں تقاضائے وقت کے مطابق مختلف شعبات علوم و فنون سے آگاہی حاصل کریں اور جدید انکشافات و اختراعات سے روشناس ہو کر قومی و ملکی توانائی، اصولِ مدافعت اور غالبیت کے طور و طریق کا تجربہ کر کے اُس آنے والے وقت کے لیے تیار ہو جائیں جس میں اسلام کو صحیح کارپردازوں اور سچے جاں نثاروں کی ضرورت ہوگی کیا یہ باتیں غور طلب نہیں ہیں؟

Marfat.com

صواب رائے اور قوتِ فیصلہ کا فقدان یہ دیکھ کر ہماری نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں کہ آج ہمارے علما آزاد ذہنیت اور وسیع النظری سے اس درجہ دُور ہٹ چکے ہیں کہ جدید مسائل کے متعلق صواب رائے اور قوتِ فیصلہ کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا اُن کے بس کی بات نہیں. جب کوئی معمولی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس درجہ سطحی فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ایک مکتبۂ خیال اور ایک مذہب کے ماننے والے بھی آپس میں متفق نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے متضاد فتووں کے صدُور سے عام مسلمانوں میں اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں. اور اپنے جواز و عدم جواز کی تاریک روشنی میں عوام کے ساتھ خود بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے پڑے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً آج ایک معمولی مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ آیا ایک خاتون صدرِ مملکت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے نفی میں جواب دیا ہے بعض نے اثبات میں، اور بعض نے خاموشی اختیار کی ہے۔ اب یہ درمیانی خلیج اس درجہ وسیع ہو رہی ہے کہ آپس میں مل کر فیصلہ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے. عوام بھی یقینِ علمی کے ساتھ کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ کیا اس اُلجھن کو عوام تک پہنچانے سے پہلے ان تینوں مختلف الرائے علماء کا ایک جگہ بیٹھ کر ایک مناسب فیصلہ کر لینا ممکن نہ تھا۔ ہاں یہ اسی وقت ممکن تھا جب مدرسوں ہی میں ان کو رواداری اور مصالحت کا عادی اور حقایق کو تسلیم کر لینے والا مزاج عطا کیا گیا ہوتا۔ اگر وہ عوام کے سامنے اپنی متفقہ رائے پیش کرتے تو عوام اِن اُلجھنوں سے کیوں دوچار ہوتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے انفرادی علم نے انھیں شدّت پسند بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ خود ایک ہو جانے کی بجائے عوام میں پھوٹ ڈالنا ہی صراطِ مستقیم اور جنّت کا سیدھا راستہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کے اختلافِ رائے ہی کی بنا پر لیڈرانِ قوم اپنی من مانی کرنے اور خود ساختہ قوانین کو بنانے بگاڑنے کی جرأت کرتے ہیں اور اس خود حکومت اور عوام کیلیے مشکلات کا سلسلہ طویل ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

علمائے کرام کے افتراق کا نتیجہ

یہ تو ایک پیش پا افتادہ مسئلہ تھا جو دوران تحریر ہذا واقع تھا۔ اس کے علاوہ لاتعداد ایسے مسائل ہیں جن کے مباحثے اور مناظرے قرنہا قرن سے یکساں لائحہ چلے آ رہے ہیں۔ اور انہی جزئی و فروعی مسائل پر ناواقف عوام اور طالبانِ علوم آپس میں دست و گریباں ہیں۔ کیا آمین بالجہر و بالخفی پڑھنا یا نہ پڑھنا، یا رفع یدین وغیرہ بھی بنیادی مسائل ہیں۔ جن کا اختلاف وجہ افتراق یا لبطلانِ دین ہو جائے۔ یا تبلیغِ حسنات اور تدوینِ اخلاقیات کی بجائے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے میں زیادہ ثواب ہے؟ افسوس! یہ افتراق ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم غذائی ضروریات کے موقع پر امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا وغیرہ ممالک کا منھ دیکھتے ہیں۔ اور اُن کے خیراتی و امدادی گیہوں، شکر، مکھن، خشک دودھ اور جدید مصنوعات کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ عیاذاً باللہ! جس قوم کے علمائے کرام، کمبل پوش فقرا اور صالح تجار، ملایا، انڈونیشیا، چین، بلکہ اقصائے عالم میں پہنچ کر اپنے حسنِ خلق، صدق اور حسنِ معاملہ کی بے نظیر مثالیں پیش کر کے اعلائے کلمۃ الحق میں کامیاب ہوئے، وہی قوم اپنی محکوم اور مغلوب اقوام کے ہاتھوں میں پڑی سسک رہی ہے۔ یہ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ آج وحدتِ عمل کے بجائے ہمارے علما کو وہابی، بدعتی، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ و سنی جیسے دور از کار اختلافات میں مناظرہ و مباحثہ سے فرصت ہی نہیں کہ تقاضائے وقت کو محسوس کر کے وہ لائحہ عمل اختیار کریں جس سے تعمیر امت کا کام سرانجام پائے اور دنیا کے بیکس و عاجز و مجبور مسلمانوں کے لیے سہارے کا باعث ہو۔ آج وہ علوم فلسفہ اور سائنس سے اس لیے کتراتے ہیں کہ یہ مذہبی علوم نہیں ہیں۔ لیکن کیا ان علوم سے بیگانگی جدید اسلحہ جات کی تباہ کاریوں سے بچانے میں مددگار ثابت ہو گی ۔۔۔؟

Marfat.com

علمائے کرام سے ایک سوال

کیا یہ قرآن کریم کی آیت نہیں ہے؟ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (جس کو حکمت عطا کی گئی اُسے بے انتہا خوبیوں کا مالک بنا دیا گیا)۔ — اور کیا یہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْيَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ۔ (علم تو دو ہی (سیکھنے کے لیے لازمی ہیں) ایک علم دین اور دوسرا علم بدن) — کیا علم بدن میں کل اجسام، جملہ مادی اشیاء اور تمام فنی و علمی شعبہ جات جیسے علم الاشیاء، علم طبعیات، علم الادویہ و معالجات، علم الکیمیا و معدنیات، اشیاء پر سورج کی ناری اور نوری شعاعوں کے جداگانہ اثرات کا علم، برّی بحری اور فضائی تغیرات کا علم، علم الجراثیم، جراثیم کش گیس یا ادویہ، حیوان شناسی، علم النباتات، عناصر و معادن کے جواہر اور ہر جوہر کی تہ میں نظامِ جذب و کشش جو سائنسی علوم کا سرچشمہ ہیں، داخل ہیں یا نہیں؟ — کیا ہادی اسلامؐ نے اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ (علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو) کی مسلمانوں کو تعلیم نہیں دی۔؟ کیا پیشوائے انسانیت نے اَلْعِلْمُ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ (علم حاصل کرنا مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لیے فرض ہے) عظمت و رفعت کی راہیں نہیں کھول دیں؟ — کیا پیغمبر اسلام نبیِ امیّ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا آپ تک نہیں پہنچی؟ اے اللہ! مجھے چیزوں کی حقیقی فطرت کا علم عطا کر! — یہ وہ سوال ہے جس کا جواب علمائے اسلام کے پاس سوائے اثبات کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سامانِ مناظرہ و مباحثہ سے اُن کا اسلحہ خانہ بھرا پڑا ہے۔ — اور ہمارے پاس اُن کے مقابلہ (مشاجرہ و مناظرہ) کیلیے ایک نشتر بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے اثرات کو اپنے بزرگانِ سلف میں دیکھتے ہیں اور ان لوگوں کے نام شواہد میں پیش کر سکتے ہیں جنھوں نے علوم دینی کے ساتھ رائج اور دنیاوی علوم بھی نہ صرف یہ کہ حاصل کیا، بلکہ سرپرستی کی اور اب تک نام زندہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

Marfat.com

علومِ جدیدہ کی سرپرستی میں بزرگانِ اسلام کی متبرک ہستیاں

ابنِ ارشد وہ پہلا شخص ہے جس نے مختلف مرضوں کے جراثیم کا وجود ثابت کیا اور دق کے مریضوں سے پرہیز کی ہدایت کی۔ اس نے علم الجراثیم سے دنیا کو روشناس کیا۔ اور اس کے نقشِ قدم پر چل کر "پاستور" وغیرہ نے علم الجراثیم کی عمارت کھڑی کی۔

رازی اور جابر رازی اور جابر بن حیان کونی وہ ہستیاں ہیں جن کے تجربات و مشاہدات نے دنیا کو یقین دلایا کہ تمام مبادی دھاتوں کی قلبِ ماہیت ہو سکتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر جدید کیمیا داں اپنی کیمسٹری کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ جابر بن حیان ہی دنیا کا وہ پہلا کیمسٹ ہے جس نے کیمسٹری میں عملی تجربات کو ضروری قرار دے کر ایک علیحدہ شعبۂ "سائنس" بنا دیا۔ اس نے کئی ایسے کیمیائی مرکب تیار کیے جن کے نسخے (فارمولے) آج بھی سائنسدانوں کے معملات (دارالتجربہ) میں شمعِ ضوفشاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور آج کے مغربی سائنسداں اسی کے نقشِ قدم پر چل کر کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔

ریاضی کا میدان اسی طرح علمی دنیا میں ریاضی کے میدان کو بھی پہلے مسلمانوں نے فتح کیا اور وہ قواعد و قوانین و ضوابط مرتّب کیے جو آج تک حساب دانوں کی اصولی کنجیاں ہیں اور بغیر ان کے کسی سوال کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ مسلمان قوم ہی ہے جس نے اعداد کی صف میں صفر (۰ — زیرو — 0) کو شامل کر کے علم الحساب پر وہ احسانِ عظیم کیا کہ دنیائے سائنس اور ہیئت و فلکیات ان کے نام پر سرنگوں ہیں اور رہتی دنیا تک بار احسان سے سرنگوں رہیں گے۔

الخوارزمی الخوارزمی وہ شخص ہے جس نے دنیا کو اپنی مایۂ ناز تصنیف "الحساب جبر المقابلہ" سے روشناس کرایا۔ اور جب اس کی یہ تصنیف مغرب میں پہنچی اور وہ لوگ علم ہندسہ سے

Marfat.com

روشناس ہوئے تو الخوارزمی کے نام کی رعایت سے اس فن کو "الگورزم" کہا جانے لگا جو آج تک رائج ہے۔

عمر خیام ریاضی کے میدان میں ایک اور شخص جس کو عام لوگ صرف ایک رندِ شرابی اور رباعیات کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ نہیں جانتے۔ اور بعض علمانے تو (جو اُس کے حُسنِ خاتمہ اور مبارک انجام سے ناواقف رہے) اُسے کفر کے فتاوے سے بھی نواز ڈالا ہے۔ عمر خیام کے نام سے مشہور ہے جس نے الخوارزمی کی کئی سو مثالوں کی اصطلاح قائم کی اور نہ صرف یہ کہ اُس کی مثالیں اور فارمولے تیار کیے بلکہ انھیں حل کر کے بھی ثابت کر دیا۔ نیز علم الاشکال (جیومیٹری) کو بھی انھیں اُصولوں میں سمونے کی بنیاد ڈالی اور علم ہیئت میں وہ مرتبہ پایا کہ آج تک اس کے اصولِ زائچہ، وتقویم (جنتری) ہیئت دانوں کے لیے چراغ راہ ہیں۔ ہیئت کی تحقیق و تجربہ کے لیے رصدگاہ "بیت الحکما والمامون" کے نام میں دنیا میں سب سے پہلی رصدگاہ تعمیر کی گئی۔

ابراہیم الغذاری عملی تجربوں اور کواکب کی سیر و ترتیب کو متعین کرنے کے لیے ضروری آلات مسلمانوں نے ہی ایجاد کیے جو آج بجنسہٖ موجود ہیں۔ ان آلات کے موجدوں میں سے ابراہیم الغذاری سرِ فہرست ہے۔

موسیٰ بن شاکر المامون کے زمانۂ امارت میں خوارزمی اور موسیٰ بن شاکر نے زمین کی پیمائش کا پیچیدہ کارنامہ انجام دے کر سربستہ راز کھول دیا جس سے زمین کے درجوں کی لمبائی چوڑائی کا علم ہوا۔ اور اب تک جغرافیہ دانوں کے مستند ہے

ابوالعباس فرغانی علم ہیئت میں "اَلْمُدْخَلُ عِلْمِ اَلْهَیْئَةِ الْاَفْلَاکِ" کے نام سے وہ بے مثال کتاب ہے جو ایک مسلمان ہیئت دان "ابوالعبّاس فرغانی" نے

Marfat.com

تصنیف کی جس کے لاطینی و عربی ترجمے اٹھارھویں صدی تک مغرب میں سند قرار دیے جاتے تھے۔ نیز مسلمہ المجریطی (ہسپانیہ میں) تھے۔

البطانی البطانی (مصحح مفروضاتِ بطلیموس) نے ثابت کیا تھا کہ سیاروں کا مدار ایک صحیح دائرہ نہیں۔ بلکہ یہ کسی قدر بیضوی شکل میں گردش کرتے ہیں اور یہی مفروضہ آج تک مسلّم اور مصنوعی سیاروں کے لیے سنگِ میل ہے۔

ابو معشر سمندر کے مد و جزر کو چاند کی کشش ثقل کے زیر اثر ہونے کو ابو معشر نے انکشاف کر کے لاطینی دنیا میں اپنی امامت کا سکہ جما دیا۔ اسی طرح کتاب "الکواکب الثابتہ" کے مصنف وہ ممتاز ہیئت دان تھے جن کے فلکیاتی مشاہدات و انکشافات آج تک مستند مانے جاتے ہیں۔ اور وہ ہیئت داں، جو سائنسدانوں کے تعاون سے چاند اور مریخ کے سفر پر جانے کے لیے آمادہ ہیں، اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

علم حکمت علم دین سے جُدا نہ تھا زمانہ ماضی کے مسلمان ہر شئے کی حقیقی فطرت کو سمجھنے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اور چیزوں کی خاصیت اور ان کے اسباب و علل کی تلاش میں کوشاں رہتے تھے اور اسی تجسس کے نتیجے میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے گیے جس کا آج تک جواب پیش نہیں کیا جا سکا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ علوم ریاضی، ہیئت، فلکیات و طبعیات، حیوان شناسی، طب و کیمیا، فلسفہ اور سائنس اور دیگر علوم کی پوری عمارتیں انھیں کی رکھی ہوئی بنیادوں پر استوار کی جا رہی ہیں۔ علم حکمت (جس کا ایک شعبہ سائنس ہے) دین سے جدا نہ تھا، بلکہ ان کے میدانِ علم و معلومات آج کے علمائے مشرق و مغرب سے اس لیے وسیع تھے کہ وہ بیک وقت جملہ علوم کے ماہر ہوتے تھے۔ اور یہ ایک علم میں آگے بڑھتے ہیں اور دوسرے علوم کے لیے دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے

Marfat.com

کہ ہمارے نوجوان طلبا و طالبات مادّی علوم کے ساتھ روحانی' اور روحانی علوم کے ساتھ حکمتِ اجسام و خواص (جس کا ایک شعبہ سائنس ہے) ساتھ ساتھ حاصل نہیں کرتے؟ کیا یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ چکی ہے کہ ایک علم' خواہ وہ متضاد و مخالف ہی کیوں نہ ہو' دوسرے علم کے لیے معاون و مددگار ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو آج بھی مشرقی علوم کی تابانیاں مغرب کو بقعۂ نور بنا سکتی ہیں۔

ایک پیش گوئی

مستقبل قریب میں وہ وقت آنے والا ہے جب انسان قیمتی مشینی آلات سے چھٹکارا پائے گا۔ اور مقناطیسی فطرت پر اس درجہ قابو حاصل کرے گا جس طرح آج بجلی کے تاروں پر مصنوعی ربڑ چڑھا کر برقی قوت کو منفصل کر لیتا ہے۔ یہ شمسی اور قدرتی توانائیوں کو معمولی اور عام سیال کی صورت منتقل کر کے رفتار' تحریک اور دباؤ کو قبضہ میں لا کر ایک پیسہ خرچ کیے بغیر خودکار و دوامی مشینیں بنا لے گا۔ آج کے بے مایہ مفکرین کثرتِ آبادی اور قلتِ رزق سے متوحش ہو کر عملِ جرّاحی' انجکشن یا ادویہ کے ذریعہ صلاحیتِ توالد و تناسل کو معطل کرنے کی فکر میں بے حساب ملکی سرمایہ خرچ کر رہے ہیں۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ انسان رزق کے لیے اتنا درماندہ اور پریشان نہ ہوگا بلکہ گھنٹوں کے وقفہ میں مہینوں' بلکہ برسوں کا کام لے کر اپنا رزق زیادہ مقدار میں فراہم کر سکے گا۔

دسترخوانِ نعمت

آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے نوجوان طلبا و طالبات کو اس تعلیم سے بے بہرہ رکھتے ہیں جو ہوا' پانی' زمین کی توانائی اور سورج کی شعاعوں سے صحیح استفادہ کے قابل بنا سکیں اور جو مختلف مگر صحت مند غذا حاصل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔ حالانکہ اس مقصد کے لیے خدا نے ہمارے واسطے بے انتہا وسیع

Marfat.com

وظیفہ وہیں دسترخوانِ نعمت بچھا دیا ہے۔ پھر یہ کیوں ہمارے لیے باعثِ تنگی و تکلیف ہے؟ صرف اس لیے کہ ہم اِن خدائی نعمتوں کو صحیح طریقہ سے استعمال کر کے شکریہ بجا لانے کے علم و طریقہ سے واقف و آگاہ نہیں ہیں۔۔۔ یہ ہمارا کفرانِ نعمت ہی ہے کہ انسانی انکشافات نوعِ انسان کے لیے راحت رساں ہونے کی بجائے تباہ کن، ازدیادِ نعمت کی بجائے مزیدِ فلاکت و عذاب، امن کی بجائے جنگ اور اطمینان کی بجائے خوف و ہراس بن کر رہ گئے ہیں۔

یہود کی بے اطمینانی

اس سے زیادہ ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم کسی پیغمبر اولوالعزم پر ایمان لا کر اُس کا احترام بھی کریں اور دوسری طرف اُس کے اقوال کی تکذیب اور احکام سے سرپیچی کریں۔ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ کی بشارت نہیں دی تھی؟ یقیناً دی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ موسیٰ کی قوم جو اب تک اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اس اولوالعزم پیغمبر کو جو بنی اسرائیل ہی میں مبعوث ہوئے اور مسیح بن مریم کے نام سے خلعتِ نبوّت اختیار کیا، صاحبِ کتاب ہوئے، مُردے زندہ کیے، مٹی کے کھلونے بنا کر دمِ عیسوی سے زندگی بخشی اور اُن کو ہوا میں اڑایا، حکمت و دانائی سے خدائے یگانہ پر ایمان کی دعوت دی، اس کی عبادت کے طریقے بتائے، سچی بشارتیں دیں۔ لیکن قومِ یہود نے ان کو ماننے سے سرتابی کی، کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں ہے۔ کیا وہ اس کفرانِ نعمت کے بدلے میں دنیا کا چین اور دل کا اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور کیا اس طویل تجربے کے باوجود وہ امید کر سکتے ہیں کہ کامیاب ہوں گے؟۔۔۔ اگر نہیں، تو اے بنی اسرائیل، اب بھی وقت ہے کہ تم صداقت کے انحراف سے باز آؤ، اور مقدس پیغمبر مسیح بن مریم کو سچا نبی مان کر بردباری کا سبق حاصل کرو۔ اور دنیا میں امن و امان کے پرستار بن جاؤ۔

Marfat.com

دعائے عیسیٰ، فراوانی دولت اور سائنسی برتری کے باوجود قوم نصاریٰ کی بے چینی اور بے اطمینانی کے وجوہات!

حضرت عیسیٰ بن مریم سلام اللہ علیہما کی دعاؤں سے موجودہ عیسائی بھائیوں کو جو مادی نعمت اور فراوانی دولت عطا کی گئی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا اُن پر واجب ہے یا نہیں۔ اور کیا حضرت عیسیٰ بن مریم کو خدا کا بیٹا ماننے اور ہر اتوار کو گرجے میں جا کر اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے فرضی بت کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور اس سے دعائے مانگنے سے خدا کا شکر ادا ہوتا ہے۔

اے قوم عیسیٰ، کیا واقعۃً تمھارا دل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ مسیح بن مریم جو کھانا کھاتا پانی پیتا اور ...... زمین پر چلتا تھا، خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ بیٹا تو وہی ہو سکتا ہے جو باپ کی طرح ہو اور باپ کی خصوصیات کا حامل ہو۔ خدا جسم کا محتاج نہیں عیسیٰ علیہ السلام جسم کے محتاج تھے۔ خدا دیکھنے، سننے، چھونے اور چلنے کے لیے آنکھ، کان، ہاتھ اور پاؤں کا محتاج نہیں لیکن عیسیٰ علیہ السلام ان اعضا کے محتاج تھے، خدا کسی سے پیدا نہیں ہوا، عیسیٰ علیہ السلام کنواری مریم سے پیدا ہوئے۔ خدا بچہ، جوان اور بوڑھا نہیں ہوتا۔ عیسیٰ علیہ السلام بچے پیدا ہوئے بڑھ کر جوان ہوئے اور حدِ رُشد کو پہنچے۔ کون سی وجہ مناسبت ہے جس کی بنا پر ایسے سچے پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ یہ وہ بنیادی امر ہے جس نے تمھاری عقل اور تمھارے ایمان کا رُخ حقائق سے پھیر دیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے تمام اقوال و احکام تمھارے لیے مبہم ہو کر رہ گئے ہیں۔ تمھاری زندگی کا راستہ غیر متیقن ہو گیا ہے۔ تمھیں اپنی ملکی، قومی، سماجی، رواجی، تمدنی اور خاندانی زندگی میں کہیں اطمینان کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ یہ بے چینی اور بے اطمینانی کیوں؟ صرف اس لیے کہ تم نے صداقت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا اور اظہارِ حقیقت سے پہلو تہی کی۔ تم یہ سوچتے ہو کہ صداقت کی تسلیم اور حقیقت کے اظہار سے عیسویت اسلام میں مدغم ہو جائے گی اور خوفزدہ ہو کر حقیقتوں پر

Marfat.com

پردہ ڈالنے لگتے ہو ۔ یہ شکرانۂ نعمت نہیں ہے۔ اس سے دنیا کو سیدھا راستہ ہاتھ نہ آئے گا۔ آؤ، اب تک جو ہوا سو ہوا، اسے بھول جاؤ ۔ آؤ ۔ دنیا میں امن و امان قائم کرنے کیلیے اُس ہمّت سے کام لو جو خدا نے تم کو عطا کی ہے ۔ آؤ، ہم سب انسان ہمنوع اور بھائی بھائی ہیں، ہم سب ایک ہیں۔ اسی یگانگت کے رشتہ میں ساری دنیا کو جکڑ دو۔ اس کے لیے ایک معمولی جرأت وہمّت کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ حقیقت وصداقت کو تسلیم کرلو۔ اور حقیقت وصداقت یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بیٹے خدا کے بندے اور اولو العزم نبی تھے ۔ خدا نے اُن کو دنیا کی ہدایت کے لیے نبوت، حکمت اور کتاب سے سرفراز فرما کر ہمارے پاس بھیجا تھا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اُن پر اسی طرح ایمان لائیں جیسے وہ تھے۔ اپنی طرف سے زائد باتیں یا مشکوک شبہات قائم نہ کریں۔ کیا یہ کوئی مشکل کام ہے؟ اتنی سی بات پر ساری دنیا متحد و متفق ہو سکتی ہے ۔ اتنی سی سچائی پر ساری دنیا کا بغض وعناد اور نفاق و افتراق ختم ہو سکتا ہے ۔ اور اتنی سی بات اُس وقت ممکن ہے جب عقل و ایمان کے سامنے سے تعصب کی دیواریں ہٹ جائیں ۔ یہ اتنی سی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے۔ شاید اللہ تعالےٰ اسے آسان فرمائے !

حضرت عیسیٰ روح اللہ کی ایک پیش گوئی اور حکم

"اے حواریو! بہت سی باتیں جو اس وقت تمہاری برداشت سے باہر ہیں۔ فارقلیط (روح صداقت) جو میرے بعد آنے والا ہے وہ تمہیں بتائے گا۔ اُسے سننا، مان لینا اور اُس پر عمل کرنا۔" یہ ہے فرمان حضرت عیسیٰ روح اللہ مسیح بن مریم (علیٰ محمد و علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا۔ نیز یہ بھی فرمایا ۔ "میں نے ایک عمارت پوری کی ہے جس میں صرف ایک اینٹ کی ضرورت ہے جب وہ اینٹ اس میں لگ جائے گی تو عمارت ایسی مکمل ہو جائے گی کہ اس میں مزید کی گنجایش باقی نہیں رہے گی۔" آؤ، عیسیٰ علیہ السلام کے ان اقوال کی تحقیق میں تاریخ عالم کی ورق گردانی کرو،

Marfat.com

اور اپنے دل وضمیر کی طرف رجوع کر کے دیکھو کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آج تک سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور کوئی فارقلیت دنیا میں نہیں آیا۔ یہی وہ روح صداقت ہیں جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کو ثابت کیا، اور یہی دین کی عمارت کی وہ آخری اینٹ ہیں جن کے بعد قیامت تک کسی اینٹ کی مزید گنجائش باقی نہیں رہی۔ افسوس، جس طرح موسیٰؑ کی قوم یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر کے صداقت کا راستہ غلط کیا، اسی طرح قوم نصاریٰ پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر امن وسلامتی کا راستہ بھول گئی۔ اور اسی غلط روی کا نتیجہ ہے کہ آج بین الاقوامی دملی، بلکہ تمدنی، معاشی اور خاندانی سکون واطمینان مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ اب یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن ہو چکی ہے کہ دنیا کی امن وسلامتی سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے کے اور کسی طرح ممکن نہیں۔ اب دلیل وحجت بازی کا وقت نہیں رہا۔ یہ زمانہ صرف حقائق کو تسلیم کرنے کا ہے۔ اگر آج بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور عیسائیت کے علمبردار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ تعلیمات وہدایات پر راسخ العقیدہ ہو کر عمل پیرا ہو جائیں تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ فارقلیت (روح صداقت) یعنی محمد رسول اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اور کلمہ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ زبان سے کہہ کر دل سے اس کی گواہی دیں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے خدا کے اور کوئی پرستش وعبادت کے لائق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔

عملی تجربہ شکوک وتوہمات انسان کی بدترین رکاوٹیں ہیں جب تک عملی تجربہ کر کے نہ دیکھا جائے حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ تم نے زندگی کے ناقص اور مہمل قوانین پر چل کر کیا پایا، اور دنیا کو کیا دیا؟ اب تم اسلامی قوانین کا تجربہ کر کے دیکھو جو کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں،

Marfat.com

بلکہ خالق انسان کے بتلائے ہوئے ہیں، دیکھو تمھیں کیا ملتا ہے اور تم دنیا کو کس مقام پر پہنچاتے ہو اگر تم نے اپنے سائنسی مکاشفات کو اسلامی ہدایات کے سانچے میں ڈھال لیا تو دیکھو تمھاری یہ تباہ کن اور خوفناک طاقتیں کس طرح مفادِ انسانیت کیلیے عدل و انصاف، رحم، ہمدردی اور امن و سلامتی کا گہوارہ بن جاتی ہیں۔ اب اگر تم کو اسلامی زندگی کی سچی مثال دیکھنی ہو تو آؤ اور اُن صوفیہ کی زندگی میں تلاش کرو جن کے کردار اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح نمونہ اور کامیاب زندگی کا ثبوت ہیں۔

صوفیہ کے کردار

اسلام کے تمام خصوصی محسنات کے حامل صوفیائے کرام ہیں، جن میں نہ منیّت ہوتی ہے نہ خودی، نہ خودنمائی ہوتی ہے نہ خودفروشی۔ ان کا اصول نفس پرستی کے بجائے خداپرستی، خصومت کی بجائے محبت، غرور کے بجائے تواضع، تکبّر کے بجائے فروتنی، استحقار کے بجائے استکرام ہے۔ کیسی مبارک ہستیاں ہیں یہ جو انسانیت کے فروغ و فراغ کے لیے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔ بہبودیِ عامّہ ان کا مطمحِ نظر اور وہ خود اکرام یافتگانِ اہلِ بصر ہوتے ہیں۔ دنیا کے کسی گوشے میں کسی کو درد پہنچے ان کا دل دکھ جاتا ہے۔ دوستی اور دشمنی سے بے نیاز ہو کر مریضوں کی عیادت کرتے اور انتہائی مخالفت کے باوجود صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔ دشمن کی موت پر بھی متاسف ہوتے اور نیکی کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ہر علم و فن، تجارت و صنعت و حرفت کے مفید و مضر دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے اور انسانیت کو خیر و فلاح پر قائم رکھنے کے لیے کوشش اور جہاد کرتے ہیں۔

اسلام کا نظریۂ جہاد

اسلام میں جہاد کا حکم فرضیت کے مرتبے میں داخل ہے لیکن جہاد کے معنی جنگ و فساد اور ظالمانہ قتل و غارت ہرگز نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے

Marfat.com

جہاد کے یہ معنی سمجھے ہیں انھوں نے اپنے ساتھ ساری انسانیت پر ظلم کیا ہے۔ کیونکہ اسلام کا جہاد بالسیف بدرجہ آخر فتنہ و فساد اور ظلم و استبداد کو دنیا سے مٹانے کیلیے فرضِ عین مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تلوار ڈاکوؤں کا خنجر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹروں کا رحیم و شفیق نشتر ہے جس طرح انسان کا جسم فاسد مادّوں کا آماجگاہ بن جاتا ہے اور بغیر آپریشن کے زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے تو ڈاکٹر کا یہ فرض ہے کہ وہ نشتر سے چاک کر کے فاسد مادّے کو نکال دے اور اگر کوئی عضو اس درجہ خراب ہو چکا ہے کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں تو اُسے بالکل کاٹ کر جسم سے الگ کر دے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ فتنہ و فساد اور شر و ظلم کی برائیوں میں مبتلا ہو تا رہتا ہے جس سے امن و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ اس وقت اہلِ دانش کا فرض یہ ہے کہ وہ ان برائیوں کو دُور کر کے معاشرہ میں امن و امان قائم کریں۔ اور اگر فسادی عناصر اس درجہ غالب ہیں کہ اصلاح کی طرف مائل ہونا مشکل ہو گیا ہے تو اب اسلام حکم دیتا ہے کہ ایسے ارکان و عناصر کے سامنے صف آرائی کر کے معاشرہ کو ان سے پاک و صاف کر لیا جائے۔ اسی آپریشن کا نام جہاد ہے۔

جہاد برائے امن

نسلِ انسانی کو ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کیلیے دوست یا دشمن کی نکتہ چینیوں اور ناراضگیوں کو نظر انداز کر کے مہم چلانا اس وقت کا سب سے بڑا انسانی فرض ہے۔ اگر اس تحریک کے سلسلہ میں بڑی طاقتوں سے بھی متصادم ہو جانا پڑے تو جرأت و بے باکی کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ آئیے ہم اور آپ مل کر تحریر و تقریر کے میدان میں قلم و زبان سے جہاد برائے امن کا مظاہرہ شروع کریں۔ اور تشدد پسند اور استبداد کی عادی و عامل لیڈران کو چیلنج کریں کہ وہ ہمارے مقابلہ میں قلم کے ذریعہ اپنے نظریات کا اور اعمال کے ذریعہ اپنے ظلم کا ثبوت دینے کیلیے تیار ہو جائیں۔

Marfat.com

یقیناً بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی۔ بعض ضدی اور سرکش لیڈر زبان قلم سے نظریات کا اور اعمال سے ظلم کا ثبوت پیش کرنے میں ناکام ہونے کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہنے اور اقوام کو فتنہ و فساد کی آگ میں جھونک دینے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ اب تک تجربات اور مشاہدات ہوتے رہے ہیں، تو ہمیں متحد ہو کر اس جہاد برائے امن کیلئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کرنا ہو گا۔ یاد رہے ایسی تمام خطرناک صورتوں میں فتح ہماری اور صرف ہماری ہو گی۔ ہم ظالموں کے مہلک ترین ایٹمی ہتھیاروں کو اس طرح چبا کر تھوک دیں گے جس طرح ابابیل نے ہاتھیوں کے لشکر کو "کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ" بنا کر چھوڑا تھا یا مچھروں نے نمرود کی خدائی کا صفایا کر دیا تھا۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق امن وسلامتی کا قیام چاہتے ہیں۔ ہم حق پر ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پھر جب دنیا کے تمام امن پسند افراد و اقوام ہمارے خلوص اور صداقت کا اعتبار کریں گے کہ ہم صرف امن وسلامتی کے خواہاں ہیں اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں تو وہ یقیناً ہمارے ساتھ ہوں گے جیسا کہ آج بھی وہ ہمارے ساتھ متحد و موافق ہیں۔

اسلام کا ضابطۂ حیات

اسلام امن پسند دین ہے اور صحیح مسلمان بین الاقوامی امن عالم کا علمبردار ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ تمام اقوام عالم متحد ہو کر ایک مؤثر و با اقتدار بین الاقوامی عدالتِ انصاف کی تشکیل کریں تاکہ اُلجھے ہوئے مسائل کا صداقت و ایمانداری کے ساتھ تصفیہ کیا جا سکے۔ اسلام امن وسلامتی اور فلاح و نکوئی کے ساتھ زندہ رہنا اور زندہ رکھنا سکھاتا ہے، وہ صرف بُرائی، فساد اور ظلم واستبداد کا دشمن اور قاتل ہے۔ جو قومیں اس نظریے کی حامی ہیں وہ ہمیشہ اسلام سے متحد رہ چکی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اسلام نے داخلی اور خارجی مشترکہ مقاصد کے لیے ایک ضابطۂ

Marfat.com

حیات مقرر کیا ہے جو پورے اعتماد کے ساتھ امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ آج ۱۳سو برس سے مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات کی روشنی میں اس ضابطۂ حیات کا اعتماد اظہر من الشمس ہو چکا ہے۔ دنیا نے اگر امن و سلامتی کا منہ دیکھا ہے تو صرف اسلامی ضابطۂ حیات کے سایے میں۔ اس کے علاوہ اور کسی ضابطہ میں امن و سکون اور سلامتی و خوش حالی کا شائبہ نہیں ملا۔ اور آج بھی اسلام تمام دنیا کے خود ساختہ قوانین کو چیلنج کر سکتا ہے۔ آئیے، اگر آپ امن و سلامتی کے طرفدار ہونے کا دعوٰے کرتے ہیں تو اسلام کے ضابطۂ حیات پر غور کیجیے، تاریخی روایات سے معلومات حاصل کیجیے اور خود تجربہ کر کے دیکھیے۔ اگر دنیا میں سب سے بہتر ضابطۂ حیات ثابت ہو تو اسے تسلیم کر کے دنیا کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیجیے۔ یا کسی دوسرے ضابطۂ حیات کو اس کے مقابلے میں کامیاب ثابت کیجیے اسلام اس سے روگردانی کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہ ہوگا۔ اس لیے کہ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرْ (نیکی، بھلائی اور بہبودی کو حاصل کر لو اور برائی، فساد اور ظلم کو ٹھکرا دو) اس کے زرّیں اصولوں میں داخل ہے۔

نظریۂ جہاد میں اسلام کی احتیاط

اسلام کسی دشمنی، غصّہ یا بغض و حسد کی بنا پر جہاد کا حکم نہیں دیتا۔ پہلے اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور شر پسند عناصر کے سامنے پہلی اصلاح یہ پیش کرتا ہے کہ اگر تم مسلمان نہیں ہو (یعنی امن و سلامتی کے پرستار نہیں ہو) تو مسلمان ہو جاؤ۔ اگر تم صحیح معنوں میں مسلمان ہو جاؤ گے تو تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ اور جہاد کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اور اگر تم مسلمان ہونا نہیں چاہتے تو اسلام اس لیے تم سے جہاد نہیں کرے گا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہوتے، بلکہ اصلاح کا دوسرا طریقہ پیش کرے گا کہ تم کسی بھی دین میں رہتے ہوئے اس بات کا معاہدہ

Marfat.com

کردو کہ تم شر و فساد کے معاون و مددگار نہیں ہو۔ اور یہ شرط اس درجہ مصالحانہ ہے جس میں کوئی تشدد اور سختی نہیں ہے۔ اگر کوئی گروہ یا قوم ان دونوں اصلاحی باتوں کو رد کر کے فساد پھیلائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کی صلاح قبول کرنے کی استعداد باطل ہو گئی ہے اور اب سوا اس کے اور کوئی چارا نہیں ہے کہ اس سے مقابلہ کر کے انسانی زندگی کو شر و فساد سے بچا لیا جائے یہ ہے اسلام میں جہاد کا حکم اور اس کی احتیاط۔

جہاد کے لیے قرآنی احکام

قرآن کریم میں جن الفاظ کے ساتھ جہاد و قتال کا حکم اور اجازت دی گئی ہے اُس سے اللہ تعالیٰ کا واقعی منشا صاف صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ جہاد بالسّیف تبلیغ اسلام کے نہیں، بلکہ صرف ظلم و استبداد کے استیصال اور رفع شرّ و فساد کی غرض سے ہے۔ جیسا کہ فرمایا (۱) وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (تم فسادیوں سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک شرّ و فتنہ دُور نہ ہو جائے) یہ ہر حالت ہر ملک و قوم میں پیش آتی رہتی ہے کہ چند فسادی حد سے تجاوز کر کے معاشرے کے امن و امان میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اس وقت جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ (۲) وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (اور جو لوگ تمھارے ساتھ ناحق لڑائی کریں تم اُن سے مقابلہ کرتے رہو۔ مگر اُن پر زیادتی نہ کرنا۔) اگر کوئی جماعت بلا سبب تمھارے ملک یا دین پر قاتلانہ حملہ کرے، تم اُن کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاؤ اور جہاد کرتے رہو۔ لیکن فتح کی صورت میں انصاف اور انسانیت کی حدود سے تجاوز نہ کرنا۔ (۳) اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے انھیں اس کے خلاف جہاد کرنے کی اجازت ہے۔) اسلام نے ظلم کو کسی حالت میں برداشت نہیں کیا ہے بلکہ اس کے مقابلہ کے لیے اجتماعی جہاد کی اجازت دی ہے۔ (۴) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ

Marfat.com

وَالوِلْدَانِ الَّذِینَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا۔ (تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جہاد نہیں کرتے۔ اور [دیکھتے ہو کہ] کمزور مرد، عورتیں اور بچے فریاد کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نجات دے) جس ملک کی غالب اکثریت اور طاقت ور قوم اقلیت اور کمزور لوگوں پر ظلم کریں اور وہ مظلوم ظلم کی وجہ سے اُس بستی سے پناہ مانگ کر نکل جانا چاہیں اُس وقت اُن ظالموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہوتا ہے۔ (۵) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْآ اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا (جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑائی کرتے ہیں۔ پس تم (متحد و متفق ہو کر) شیطان کے دوستوں اور طرفداروں سے جہاد کرو۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ شیطان کا مکر ہمیشہ کمزور (بودا اور پھیپھسا) ہوتا ہے۔

آیاتِ جہاد کے نتائج حاصلہ

ان آیات کی روشنی میں پانچ مواقع سامنے آتے ہیں جن پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ (۱) فتنہ کو مٹانے کے لیے فتنہ پردازوں سے جہاد۔ (۲) حملہ آوروں سے جہاد۔ (۳) خود مظلوموں کو ظلم کے مقابلے میں جہاد (۴) ظالم اکثریت والی اقوام سے جہاد جو اپنی کمزور اقلیت کا اپنی بستی میں جینا دُوبھر کر دیں۔ اور (۵) اُن شر پسند افراد و اقوام سے جو شیطنت کی طرفداری میں مکر و فریب کا جال بچھا کر امن پسند افراد و اقوام سے زبردستی لڑائی مول لینے کی کوشش کریں۔ یہ ایسے مواقع ہیں، جن میں ایمانداروں کے لیے جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کی فرضیت سے دامن بچانے کی کوشش میں غلط تاویلات یا حیلہ بہانہ سے کام لے گا وہ اُنھیں لوگوں میں شامل ہو جائے گا جو انسانیت میں فتنہ و فساد کے بانی ہیں۔

Marfat.com

جہاد کا مقصد اور حکمتِ عملی ان توضیحات کی روشنی میں مخالفینِ جہاد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہاد سے اسلام کا مقصد مادّی یا معدنی دولت کی ذخیرہ اندوزی یا زرعی زمینیں حاصل کرنا یا ملک گیری کی ہوس میں فوج کشی کرنا ہرگز نہیں ہے، جن لوگوں نے ان مقاصد کے ماتحت اسلام کے نام سے تلوار اُٹھائی ہے وہ جہاد نہیں بلکہ بادشاہی لڑائی کی ہے اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں۔ اسلامی جہاد صرف انھیں موقعوں پر فرض ہوتا ہے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ پس ایسے اسلامی جہاد سے مخالفت کرنے والے یا تو احساسِ کمتری کا شکار ہیں یا اسلامی جہاد کی حکمتِ عملی اور اُس کے مقاصد سے ناواقف ہیں یا مفسد ہیں۔

ایک سوال یہ پانچ مواقع جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ہر معاشرہ میں ان کا وقوع پذیر ہونا، ممکنات میں سے ہے یا نہیں؟ — اور واقع ہونے کی صورت میں ان کا ازالہ لازمی وضروری ہے یا نہیں؟ — اور ضروری ہونے کی صورت میں کیا جہاد کے علاوہ اور کوئی کامیاب اور مؤثر طریقِ کار سامنے آسکتا ہے —؟

جواب بعض سطح پسند افراد عجلت کے ساتھ یہ جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ "ہاں پر امن مصالحت اور ثالث کے ذریعہ باہمی سمجھوتہ ایک ایسا شریفانہ طریق کار ہے جو بغیر جہاد کے کامیاب اور مؤثر ہوتا ہے"؟ تو اولاً اسلام خود اس کا حامی و عامل ہے، لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ یہ طریقِ کار تمام مدارج پر کامیاب ہے یا بعض مدارج پہ۔ ہمارے، بلکہ ہر شخص کے عینی مشاہدات ہیں کہ شریفانہ طریقِ کار صرف شرفاء کے درمیان مخصوص ہے اور شرفاء کے درمیان مذکورہ مواقع شاذ و نادر پیش آتے ہیں جن میں جہاد فرض ہو۔ اور اگر پیش آبھی جاتے ہیں تو اُن کی شرافت بات بگڑنے سے پہلے بنا لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یقیناً فتنہ، حملہ، ظلم، مظلوموں کی حمایت نہ کرنا اور مکر و فریب کسی قرینے سے شریفانہ کردار نہیں ہیں۔ اس لیے ان مواقع پر پُرامن مصالحت اور باہمی سمجھوتہ کی

Marfat.com

اُمید کرنا پتھر میں جونک لگانے سے کم نہیں ہے۔ اِن مواقع پر اسلام کے بتائے ہوئے تین طریقوں کے علاوہ کوئی چوتھا طریق کار نہیں۔ اسلام پیش کیا جائے، یا معاہدہ اور باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ امن وسلامتی کا طرفدار بنایا جائے، یا جہاد کرکے اُن کی بُرائیوں کو یک لخت مٹا دیا جائے۔ اگر کوئی چوتھا طریقہ کامیاب ہوتا تو اسلام ضرور بتاتا۔

جہاد کے لیے تیاری کا حکم

زمانِ ماسبق میں جہاد کی تیاری کے لیے سب سے پہلی چیز قوم کے بچّوں کو فنونِ سپہگری، شہسواری اور جسمانی صحتمندی کی تعلیم دینا، تربیت یافتہ گھوڑے، لڑائی کے ساز وسامان اور اسلحہ جات فراہم کرنا تھا۔ اس کی مثالیں قرنِ اولیٰ سے قرنِ ثانیہ تک عمومیت کے ساتھ پیش کی جاچکی ہیں۔ اس طرح قوم کا محدود طبقہ نہیں بلکہ پوری قوم کی قوم سپاہیانہ شان وشوکت کی حامل اور شجاعت ومہارت میں کامل ہوتی تھی۔ ہم اسی تعلیم کے ماتحت فتویٰ حاصل کرسکتے ہیں کہ جس زمانے میں جنگ و جہاد کے جو طریقے اور اسلحہ جات استعمال کیے جاتے ہوں اُن کا مہیّا کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا۔ تاکہ جس سامان سے حملہ کیا جائے اسی سے اس کا جواب دیا جاسکے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان اسلحہ اور مادی طاقت پر اس قدر بھروسہ کیا جائے کہ اگر زیادہ ہو تو ہم مغرور ہو جائیں اور کم ہو تو خدا کی قدرت ونصرت سے منہ پھیر کر ہراساں اور خوفزدہ ہونے لگیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ تعداد اور ساز وسامان کی کمی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی قدرت ونصرت سے فتوحات حاصل کی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے پہلے اپنے نفس سے جہاد کرکے فتح حاصل کرلی تھی، اور کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ "وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ" (اور اللہ تعالیٰ ان کی حمایت ومدد پر ہے) یقینِ کامل اور اعتمادِ واثق تھا۔ اور پھر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم صرف خدا کی امداد پر بھروسہ کرکے عیش وآرام میں پڑجائیں، فنونِ سپہ گری سے نابلد رہیں اور دورِ حاضرہ کے سائنسی اسلحہ جات یا سامانِ حرب وضرب سے

بجائے قسمت اور خدا کے سپرد کر دیں۔ یہ کامیابی کا راستہ نہیں ہے۔ جو کام اپنے کرنے کا ہے اُسے پورا کریں تو اللہ تعالےٰ بھی اپنا وعدہ بالضرور پورا فرمائے گا۔

سائنس اور انسانیت

سائنس کے متعلق ہر مکتبۂ فکر کا انسان اپنے خیال کے مطابق رائے زنی کرتا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز میں بُرائی اور بھلائی کے دو نوں پہلو ہوتے ہیں اور اسلام بُرائی کے پہلو سے بچا کر صرف بھلائی کا پہلو اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے تو اسلام کی نظر میں سائنس کا وہ پہلو جو انسانیت کے لیے مضر اور باعثِ ہلاکت ہے قابلِ احتراز ہوگا اور وہ پہلو جو انسانیت کیلیے مفید اور ذریعۂ فلاح و ترقی ہے قابلِ عمل و اختیار ہوگا۔ کوئی شعبۂ علم وفن اس مناسب فیصلے کی تردید نہیں کر سکتا۔ اور اس نظریہ کے ماتحت ہم آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ لیڈران یا سائنسدان جو تباہ کن آلات و اسلحہ جات کے ذریعہ سائنس کو بدنام اور قیمتی جانوں اور قومی سرمایہ کو ضائع کر رہے ہیں اُن کو اقتدار سونپ کر اپنی من مانی کرنے کی اجازت دینا اپنی انسانیت کے پاؤں میں کلھاڑی مارنا ہے۔ اس لیے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کی مخالفت کرے اور اُن لوگوں کی اعانت کرے جو سائنس کو انسانیت کی بقا و ترقی میں محدود رکھنے کے حامی ہیں۔

سائنس کے لیے صحیح راہِ عمل

آج سائنسدانوں نے انسانیت میں اپنی ہلاکت آفرینی کا خوف و ہراس پیدا کر دیا ہے اور اقتدار طلب لیڈران اس سے غلط استفادہ کر رہے ہیں۔ اب اس کے لیے صحیح راہِ عمل سوا اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بنی نوعِ انسان کے دلوں سے خوف و ہراس کو دُور کر کے عوام النّاس کو فقر و فاقہ، جہالت و بیماری اور جنگ و فساد و خوں ریزی سے نجات کا عملی پیغام پہنچائے اور اخلاقیات و نفسیات کو مشیئتِ قدرت کا ہمنوا بنانے کے لیے اسلام کے تعلیم کردہ کامیاب طریقوں کو آزما کر دیکھے:۔

Marfat.com

یہ کامیاب اور مستند طریقے اجمالاً "انسانی معراج کے ۱۳ نکات" عنوان سے ذیل میں پیش کر کے "مینائے مصطفائیؐ" کے دورِ ثانی کو اس یقین کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے کہ اگر ان تیرہ نکات کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے عزم و ارادہ کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے تو انسانیت صحیح معنوں میں اُسی معراجِ کمال پر پہنچ سکتی ہے جو اس کا اصل مقام ہے۔

تعلیماتِ مصطفائیؐ میں سے:-

انسانی معراج کے

تیرہ ۱۳ نکات

اے انسان!

(۱) تو حق جو ـــــ حق گو ـــــ اور حق پرست رہ

(۲) تو خود شناسی کے نظری و عملی طریقہ سے حقیقت شناس بن!

Marfat.com

(۳) تو تزکیۂ نفس ـــ اور اخلاقی اصطفا کے ذریعہ ـــ نجات حاصل کر!

(۴) تو تعلیم و تعلّم کو بلا استثنا ترویج دینے میں بخل و کوتاہی نہ کر !

(۵) تو جسمانی و عقلی صحت مندی کی رحمت سے بہرہ یاب ہو کر دوسروں کو بہرہ یاب ہونے کا موقع دے !

(۶) تو انسانی آزادی ـــ اور انسان کے بنیادی حقوق کے تحفّظ کے لیے احساسِ ذمّہ داری پیدا کر !

(۷) تو معاشرتِ صالحہ ـــ توسیعِ معاش ـــ اور اقتصادی و صنعتی بلندیوں پر پہنچنے کی آزادی کسی سے سلب نہ کر !

(۸) تو کسی کے مفاد کو اپنے مفاد سے کم نہ سمجھ ـــ اور کسی کا حقِ آزادی اُس وقت تک سلب کرنے کی کوشش نہ کر جب تک

Marfat.com

وہ مہذّب ــــ مفید عامّہ ــــ اور قانونی طریقہ پر ہو !

(۹) تو اپنی اُس فطرت کے لیے ــــ جو تیقّنی معقولات اور تجرباتی معلومات کی طرف مائل ہے ــــ وہ صحیح و مستقیم راہِ عمل اختیار کر ــــ جو مقصد تک رسائی کے لیے ــــ شک و تردّد سے پاک و صاف ہو ...!

(۱۰) تو انفرادی ــــ خاندانی ــــ اجتماعی ــــ اور بین الاقوامی ــــ تمام دنیادی امورات کو ــــ مشورہ و رواداری ــــ مصالحت و امدادِ باہمی ــــ ایثار و اخوّت ــــ اور اتحاد و اتّفاق ــــ کے ذریعہ ــــ طے کرنے کی کوشش کر !

Marfat.com

(۱۱) تو اپنے دل و دماغ ـــ اور فکر و نظر کو ـــ ہر قسم کے
تعصّب سے پاک ـــ احساسِ برتری سے خالی ـــ
خود خواہی سے بالاتر ـــ اور اخلاق سوز خصلتوں ـــ
و مضرِ جمہور نفع اندوزیوں کے رُجحانات سے صاف کر کے
نوعِ انسان کی خدمت کا جذبہ ـــ اور روشن مستقبل کا
تصوّر قائم کر ـــ!

(۱۲) تو محسنین و خادمانِ آدمیّت کا احترام ـــ امن و آزادی
و سلامتی کی طرفداری ـــ مظلوم کی حمایت ـــ اور
ہر شخص سے احسان کر ـــ اور غیر مہذّب الفاظ ـــ
استہزاء آمیز کلمات ـــ جنگ جویانہ حرکات ـــ یا

Marfat.com

فتنہ و فساد انگیز اشارات سے گریز کر !

(۱۳) تو حامل امانت ہے حقِ امانت ادا کر ـــــ اپنے عہد و پیمان پر استوار رہ ـــــ ہر عمل میں ظاہر آرائی سے باز آ ـــــ اور دوامِ اخلاصِ قلبی کو شعار بنا ـــــ پھر بھی ان پر مغرور نہ ہو ـــــ تاکہ تیرے اعمال بار آور ـــــ اور خاتمہ با اعتبار ہو !

صبغت اللہ ایرانی
گنج بخش پیر
حیدرآباد (مغربی پاکستان)

تمّت بالخیر

(نوٹ) مینائے مصطفائی کو دو جلدوں میں ختم کر کے "میکدۂ مصطفائی" شروع کیا گیا ہے ۔ آپ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اتمام کی توفیق عطا فرمائے !

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com